جلد اول

اردو زبان اور اُس کے آغاز و ارتقا سے متعلق مضامین

مرتبہ

مظہر محمود شیرانی

مجلسِ ترقی ادب

کلب روڈ — لاہور

طبع اول : جنوری ۱۹۶۶ع

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب ، لاهور

مطبع : شمیم پریس ، لاهور

مہتمم : ایس - ایم - شفیق

قیمت : اٹھارہ روپے

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی : جلد اول
(اردو زبان اور اس کے آغاز و ارتقا سے متعلق مضامین)
مرتبہ مظہر محمود شیرانی - - - - - -

فہرست

نمبر شمار | صفحہ

مقدمہ و حالات زندگی

مضامین

صفحہ

نمبر شمار

تنقید و تبصرہ

(۱)

مقدمہ

از

ڈاکٹر سید عبداللہ

(۲)

حالات زندگی حافظ محمود شیرانی

از

مظہر محمود شیرانی (مرتب)

مقدمہ

(ڈاکٹر سید عبد اللہ)

بزرگ وار استاد مرحوم و مغفور پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی ان فضلائے کبار میں سے تھے جن کی تحریر کی ہر ہر سطر کو مستند اور معیاری قرار دیا جا سکتا ہے اور قرار دیا گیا ہے، ــــــ انھوں نے فارسی ادب اور اردو زبان کے اہم شاہ کاروں اور ان سے متعلق پیچیدہ مسئلوں پر قلم اٹھایا ـــــ اور اپنی ہمہ گیر اور محیط تحقیق و کاوش سے ان عقدوں کو حل کیا اور ان مغالطوں کو دور کیا جن پر صدیوں سے بے خبری کی تاریکی چھائی ہوئی تھی ــــــ انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی تردید، کرنے کو، تو کی گئی ہوگی مگر حق یہ ہے کہ تردید کسی سے ہو نہ سکی۔

پروفیسر شیرانی ادب کے مؤرخ اور محقق ہونے کے علاوہ عتیقیات کے بھی منفرد ماہر تھے۔ علم سکہ شناسی، کتبہ شناسی، مہر شناسی، تصویر شناسی، قدیم کاغذ، روشنائی، آرائش، نقش و نگار اور علم خط کی شناخت کے علاوہ اسالیب ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اس مہارت کی وجہ سے تصنیفات کے تاریخی مغالطوں کو کامیابی سے دور کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان معاملات میں برصغیر پاک و ہند میں صرف مرحوم استاد مولوی محمد شفیع ہی ایک ایسے شخص تھے جنھیں پروفیسر شیرانی کا ہم رتبہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں (جو بہ طور مقدمہ لکھا جا رہا ہے) استاد مرحوم کے علمی کام اور طریق کار کے بارے میں تفصیل کی گنجائش نہیں، البتہ مجملاً کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر شیرانی کی تین حیثیتیں نمایاں تھیں : استاد ، مورخ اور محقق ۔ ان کا علمی کام زیادہ تر تحقیق زبان اور تحقیق واقعات سے متعلق ہے ۔ انھیں سب سے زیادہ شہرت دو موضوعات کی بنا پر حاصل ہوئی : اول تنقید 'شعرالعجم' سے ، دوم 'پنجاب میں اردو' کی وجہ سے ۔

'تنقید شعرالعجم' کہنے کو 'شعرالعجم' کی بعض تاریخی غلطیوں کی اصلاح سے متعلق ہے لیکن درحقیقت اس میں ساری فارسی شاعری کی ایک بے قاعدہ تاریخ آ گئی ہے ـــــ شاہ نامۂ فردوسی اور محمود غزنوی کے بارے میں چند صدیوں سے جو غلط فہمیاں تاریخی عقائد کا حصہ بن چکی ہیں ، شیرانی کے گہرے مطالعے نے ان سب کو ناقابل تردید دلائل سے دور کر دیا ہے ۔ اس سلسلے کی تحقیق 'فردوسی پر چار مقالے' میں درج ہے ۔ ایک اہم تحقیقی دریافت اس افواہ کے بارے میں ہے کہ فردوسی نے محمود غزنوی کے ایماء پر اور صلے کے وعدے پر 'شاہ نامہ' لکھا مگر آخر میں وہ موعودہ صلہ نہ ملا ۔ اس سے ناراض ہو کر اس نے محمود کی ہجو لکھ ڈالی ۔ یہ ایک ایسی پختہ افواہ تھی جو تاریخی حقائق سے بھی زیادہ پختہ اور محکم ہو چکی تھی ۔ شیرانی نے داخلی سواھد کی مدد سے اس تخیل کا طلسم توڑا اور اس سارے قصے کو افسانہ ثابت کر کے محمود غزنوی کو اس جھوٹ کی گرفت سے آزاد کیا ۔

'تنقید شعرالعجم' کے معرکہ آرا مباحث میں چند ایسے مبحث بھی ہیں جن میں تاریخ پر افسانے کا قاھرانہ غلبہ تسلیم ہو چکا تھا ۔ ان میں کئی مضامین نئے حقائق و انکشافات پر مشتمل ہیں ۔ ان میں عطار سے متعلق بحثیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔

شیرانی نے اپنی تحقیق میں خارجی شواھد کے علاوہ داخلی شہادت کا طریقہ استعمال کیا اور یہ بہت کامیاب رہا ـــــ اسی طریقے سے انھوں نے بعض کتابوں کے غلط انتساب کے مغالطوں کو دور کیا ۔ مثلاً دیوان حسن ، دیوان معینی ، پرتھی راج راسو اور خالق باری جو اصل مصنفوں کی بجائے بعض دوسرے لوگوں کی طرف منسوب ہو گئی

تھیں ، پروفیسر شیرانی نے اصل مصنفوں کو ان کی گم شدہ کتابیں واپس دلائیں ۔ یہ باز یافت یعنی گم شدہ کی باز یافت پروفیسر شیرانی کا خاص میدان تحقیق تھا اور اس میں ان کی یکتائی تسلیم شدہ امر ہے ۔

پروفیسر شیرانی کو ہندوستان کے فارسی ادب سے گہری دل چسپی تھی ۔ ان کی آرزو تھی کہ اس ادب کی تاریخ میں جو بڑے بڑے خلا موجود ہیں ان کو پر کیا جائے ۔ شمس العلما پروفیسر عبدالغنی نے اس ادب کی جو تاریخ لکھی اس سے وہ مطمئن نہ تھے ، اور پروفیسر براؤن اور علامہ شبلی کی متعلقہ تصانیف کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں اجمال ناگزیر تھا ۔ ان وجوہ سے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے فارسی ادب سے ایرانیوں کی بے اعتنائی تو قابل فہم ہے مگر خود ہندوستان والوں نے بھی اس ذخیرے کو محفوظ نہ رکھا۔

اس معاملے میں بڑی مشکل ادب پاروں کی جستجو اور بازیافت کی تھی ۔ وہ مخطوطات و مطبوعات کی تلاش کے لیے جہاں بھی جاتے ، اس پر خاص نظر رکھا کرتے تھے کہ ہندوستان کے فارسی ادب کی کوئی نئی کتاب مل جائے ۔ اس کوشش میں مثنوی عروۃ الوثقیٰ شہابی ، بحرالفضائل اور اخلاق ظہیری وغیرہ وغیرہ ان کے کتاب خانے میں آئیں ۔ بہت سی کتابیں ایسی بھی انھوں نے جمع کیں جن کے نسخے دوسرے کتب خانوں میں ہیں ، مگر ان کے مد نظر یہ تھا کہ ادب ہند (فارسی) کا ذخیرہ ان کے پاس زیادہ سے زیادہ مکمل ہو جائے ۔ ہندوستان کے فارسی ادب کے سلسلے میں منیر لاھوری پر ان کا مضمون قابل ذکر ہے ۔

پروفیسر شیرانی عروض کی تشکیل نو کے مسئلے میں بھی بڑی دل چسپی رکھتے تھے ـــــ اس سلسلے میں انھوں نے نئے اوزان دریافت کرنے کی کوشش کی اور رباعی کے اوزان کے بارے میں جو مغالطے پھیلے ہوئے ہیں ان کو بھی دور کیا ۔

اردو کے سلسلے میں ان کی توجہ کا آغاز 'پنجاب میں اردو' سے ہوتا ہے ـــــ یہ کتاب انھوں نے اس وقت لکھی جب وہ اسلامیہ کالج لاھور

میں اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ اس کتاب نے بر صغیر میں تحقیق کے رجحان پر خاصا اثر ڈالا۔ اس کتاب کے فوراً بعد تحقیق زبان کی صوبائی تاریخیں وجود میں آنے لگیں مثلاً دکن میں اردو، گجرات میں اردو اور بعد میں بہار میں اردو، سرحد میں اردو اور بنگال میں اردو مرتب ہوئیں۔

اردو کی ابتدا کے نظریے ایک سے زیادہ ہیں —— بعض مصنفوں نے پروفیسر شیرانی کے اس خیال کی بےضرورت طور پر تردید کی ہے کہ اردو کی ترقی مسلمانوں کی تاریخ ہند کے واقعات کے تابع رہی ہے۔ اس کا آغاز مسلمانوں کی آمد اور اس کے نتیجے کے طور پر ہندوؤں سے میل جول کے ذریعے ان علاقوں میں ہوا جن میں مسلمان سب سے پہلے آئے۔ چناں چہ پہلے وادی سندھ میں عربوں کے حملے کے بعد، پھر شمال سے آنے والے ترک حملہ آوروں کی پےدرپے یورشوں اور بالآخر تسخیر و قبضہ کی وجہ سے پنجاب اور شمالی ہندوستان میں اختلاط اور ایک نئی زبان کا مایہ خمیر تیار ہوا۔ اس کے بعد مسلمان فاتحانہ حیثیت سے جدھر جدھر گئے یہ نئی زبان نئی شکلیں اختیار کرتی گئی —— تا آنکہ اس میں ادب پیدا ہوا اور نظم و نثر کے بڑے بڑے شاہکار وجود میں آئے۔ گجرات، دکن، دھلی، پورب، کلکتہ وغیرہ سب اس کے بڑے بڑے مرکز تھے، ان مرکزوں کے قیام میں سیاسی واقعات نے بہت بڑا حصہ لیا۔

پروفیسر شیرانی کے نظریے کا ماحصل یہی ہے۔ جو صاحب اس صحیح تاریخی نظریے سے انکار کرتے ہیں وہ پنجاب کو وہ حق بھی نہیں دینا چاہتے جو تاریخی واقعات کی روشنی میں اسے حاصل ہے۔ تاریخ کی شہادت یہی کہتی ہے کہ:

اردو زبان کا پہلا مایہ خمیر پنجاب میں تیار ہوا —— اس کا کھڑی بولی یا برج بھاشا والے نظریے سے کوئی تصادم نہیں، نہ دکن میں اردو یا گجرات میں آغاز تصنیف والے نظریے سے کوئی ٹکراؤ ہے ——

اس نظریے کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ مغلوں سے پہلے کے دور میں

اُردو کا خارجی وجود بھی ثابت کیا جائے ، ورنہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے کسی نئی زبان کی پیدائش کا قصہ محض خیال رہ جاتا ہے - اس کے لیے پروفیسر شیرانی نے دور معاینہ سے پہلے کا فارسی ادب سامنے رکھا اور گہرے مطالعے کے بعد اردو کی موجودگی کے ثبوت بہم پہنچائے -

اس سلسلے میں انھوں نے شعرائے فارسی کے دواوین اور ان فرہنگوں کی چھان بین کی جن میں تسریح کی خاطر ملکی زبان کے الفاظ بھی پیش کیے گئے تھے ـــــ پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں :

"ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ہے اور جوں جوں ان کی سلطنت اس ملک میں وسعت اختیار کرتی گئی ، یہ زبان بھی مختلف صوبوں میں پھیلتی گئی - دسویں صدی سے اس میں تصنیفات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جو سب سے پہلے گجرات میں اور بعدہ دکن میں شروع ہوتا ہے - اس سے پیشتر اس زبان کے وجود کا پتا صرف فارسی تصنیفات سے لگ سکتا ہے جو نویں ، آٹھویں اور ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں -"

اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے البیرونی ، ابوالفرج رونی ، مسعود سعد سلمان ، عثمان مختاری ، سنائی غزنوی ، تاج الدین ریزہ ، منہاج سراج ، امیر خسرو ، ضیاء برنی ، سید محمد بن مبارک کرمانی ، شمس سراج عفیف اور بحر الفضائل کے مصنف محمد بن قوام بن رستم بن احمد بلخی اور دوسرے مصنفوں کی تصانیف سے اردو الفاظ ، محاورات ، فقرے اور دوہرے جمع کیے اور یہ ثابت کیا کہ اردو ساتویں صدی میں گھروں کی زبان بن چکی تھی -

خلجیوں اور تغلقوں کی فتوحات کا سلسلہ پھیل کر گجرات اور دکن تک جا پہنچتا ہے ـــــ اور سب سے پہلے گجرات ہی میں اردو کو ادبی شکل ملتی ہے - یہ صوبہ ۶۹۶ھ میں سلاطین دہلی کے زیر نگیں آتا ہے ـــــ "قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں مسلمان شروع ہی سے

اردو بولتے ہیں'' (صفحہ ۱٦۱ ، اس کتاب کا) اس سلسلے میں پروفیسر شیرانی نے شیخ بہاء الدین باجن (نویں صدی کے بزرگ) کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ قاضی محمود دریائی کی 'جکریوں' (= ذکریوں) سے بھی استفادہ کیا ہے۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی (متوفی ۹۷۳ھ) ، میاں خوب محمد چشتی (متوفی ۱۰۲۳ھ) اور دوسری تصانیف سے بھی اسناد کیا ہے ۔ اس مجموعے میں احمد دکنی (جو قطب شاہی دور کا ایک شاعر تھا) کی مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' اور وجہی کی 'سب رس' پر بھی ایک مضمون ہے۔ ان سب سے قدیم اردو زبان اور قدیم ترین اردو ادب پر بڑی روشنی پڑتی ہے ۔

شیرانی صاحب نے اردو کے مختلف ناموں پر بھی محققانہ بحث کی ہے اور لفظ 'ریختہ' کے صحیح معنی معین کیے ہیں اور ریختہ کے یہ معنی یقیناً نئے ہیں اور شیرانی سے پہلے کسی نے ریختن مصدر کے اس مفہوم پر غور نہیں کیا۔ [ملاحظہ ہو ''اردو کے مختلف نام'']

لفظ 'اردو' کا قدیم ترین استعمال فارسی میں کب ہوا ! شیرانی اس کا سراغ ترکی زبان میں ڈھونڈنے کے بعد فارسی ادب میں اس کے اولیں استعمال کے مواقع کا ذکر کرتے ہیں ۔ ابتدائی مفہوم تو لشکر ہی کا ہے مگر اسی ابتدائی مفہوم سے اردوے ظفر قرین ، اردوے شاہی ، 'اردوے معلیٰ' ، اردو بازار وغیرہ اصطلاحات پیدا ہوئیں۔ زبان کے معنوں میں اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے شاید خان آرزو کی کتابوں میں ہوا ہے۔ نوادرالالفاظ ، 'مثمر' اور 'داد سخن' میں خان آرزو اس لفظ کو زبان کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں ۔ مگر یہ وہ زبان ہے جو شاہی ماحول میں پروان چڑھی ـــــ نہ کہ محض لشکر کے ماحول میں ۔ شیرانی نے اپنے مضامین میں اس پر زور دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مصحفی اور شاہ مراد لاھوری سے پہلے آرزو اس لفظ کو رائج کر چکے تھے۔

زبان اردو کے دائرۂ اثر کے سلسلے میں وہ اردو ادب ، مؤرخین زبان اردو کی نظر سے عموماً اوجھل رہا جسے شیرانی اپنے مضامین میں

هریانوی ادب کہہ رہے ہیں ۔ ہریانے کا علاقہ قریب قریب پنجاب کی فیروز پور تحصیل سے شروع ہو کر حصار ، رہتک اور آگرے تک جا پہنچتا ہے ۔ ممکن ہے یہ حدود اربعہ غیر واضح ہو اور اس میں کمی بیشی ہو ۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ہریانوی اردو کا علاقہ اس سے بھی وسیع تر تھا ۔ ادھر خالص پنجابی کے علاقوں سے شروع ہو کر ادھر راجستھان اور آگرے تک اس کی حدیں پھیل جاتی ہیں ۔

شیرانی نے اس ادب کو گوشۂ گم نامی سے نکالا ۔ اس سلسلے میں جو کتابیں ملیں ، ان پر مضمون لکھے اور اس زبان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور یہ ثابت کیا کہ اس ادب کی ابتدا عالم گیر اورنگ زیب کے زمانے میں ہو جاتی ہے اور برابر اس زمانے تک اس میں سلسلۂ تصنیف جاری رہتا ہے جب دھلی میں احمد شاہ کے دور میں شمالی ہندوستان کا پہلا بڑا دبستان ادب اردو وجود میں آتا ہے اور ظہور الدین حاتم کے بعد میر ، سودا اور درد وغیرہ اردو شاعری کو ایک خاص مقام بخشتے ہیں ۔

ہریانے کا ادب اردو مؤرخین کی نظروں سے اس لیے اوجھل رہا کہ اس کا تعلق قصباتی مرکزوں سے تھا اور وہ زمانہ ایسا تھا کہ ہر وہ شے جس پر دربار یا اردوے معلیٰ کی مہر نہ لگی ہو ، مستند نہیں سمجھی جاتی تھی ۔ دھلی میں فارسی اور اس کے بعد زبان اردوے معلیٰ کا رعب اس حد تک تھا کہ میر تقی میر اپنے تذکرہ 'نکات الشعراء' میں دکن کی خاصی پر وقار شاعری کو بھی 'پر بے رتبہ' اور بے وقار کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں ؛ ایسے میں ہریانے کی اردو کو کون پوچھتا ؟

شیرانی کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے شمالی ہندوستان میں اردو کی تصنیفی عمر کے بارے میں یہ مغالطہ رفع کیا کہ اس کا آغاز محمد شاہ کے عہد میں یا اس کے بعد ہوا ۔ پھر یہ مغالطہ بھی دور ہوا کہ اس زبان کا تعلق صرف اردوے معلیٰ سے تھا ——— حقیقتاً یہ نکلی کہ اردو ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ہر اس جگہ ترقی پاتی گئی جہاں اس کو پھلنے پھولنے کا موقع مل سکا ، اس سے اردو کی

وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور پنجابی زبان کی حدوں کی بھی تعیین ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لاہور، امرت سر سے نکلتے ہی پنجابی کے اثرات کم اور اردو کے اثرات زیادہ سے زیادہ ہوتے اور بڑھتے جاتے ہیں -

ہریانی کی طرح راجستھانی کا مطالعہ بھی شیرانی کے مد نظر رہا - دراصل وہ اپنے اس مطالعے کی مدد سے اردو کی وسعتوں اور اس کے مختلف رنگوں کا اندازہ لگانا چاہتے تھے، اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اردو زبان کا رقبہ عام خیال کے برعکس کافی وسیع تھا؛ گو کہ اس کی شکلیں ہر خطے میں مختلف تھیں مگر ایک عوامی زبان جس پر مسلمانی تہذیب کی مہر بھی لگی ہوئی تھی، دور دور تک پھیلی ہوئی تھی - اس کے مقامی نام مختلف تھے مگر سب کی مرکزی ہستی ایک تھی - ہریانی، راجستھانی، گوالیاری، گوجری گجراتی، دکنی —— یہ ایک زبان کے مختلف علاقائی روپ تھے -

راجستھانی ادب کے سلسلے میں شیرانی صاحب کا ایک اہم مضمون 'تاریخ غریبی' کے بارے میں ہے - اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ راجستھانی اور ہریانی کے ڈانڈے آپس میں کس طرح مل رہے ہیں اور دونوں زبانیں ایک دوسرے پر اثر ڈال رہی ہیں، مگر ان کے اندر وہ محاورہ قدر مشترک ہے جو مسلمانی اثرات کا آئینہ دار ہے —— اور یہ قدر مشترک شمال سے لے کر دکن تک سب ان بولیوں میں موجود ہے جن پر مسلمانوں کا اثر پڑا - پرانی اردو کے سلسلے میں متفرق مضامین اور بھی ہیں - دائرے کے مہدویوں کا اردو ادب میں حصہ، 'لیلیٰ مجنوں' احمد دکنی (۱۱ ویں صدی)، 'مثنوی یوسف زلیخا' از شیخ محمد امین، 'بکٹ قصہ' محمد افضل جھنجھانوی وغیرہ - ان سب میں شیرانی نے لسانی خصوصیات کی چھان بین کی ہے یا پھر 'قصہ چہار درویش' وغیرہ میں 'باغ و بہار' کے مآخذ سے بحث کی ہے -

شیرانی کی تنقیدیں جنھیں دراصل تاریخی تحقیق ہی کہنا چاہیے، فارسی ادب کی طرح اردو ادب سے بھی متعلق ہیں - ان میں 'آب حیات'

پر ان کے مضامین شامل ہیں ، لیکن 'آب حیات' پر تنقید کا سلسلہ مختصر رہا ۔ 'آب حیات' پر شیرانی کی تنقید میں وہ تندی اور لہجے کی درشتی نہیں جو ہمیں 'تنقید شعر العجم' میں ملتی ہے ۔ محمد حسین آزاد سے بھی گہری عقیدت جو محبت کے انداز رکھتی ہے شائد اس کا باعث ہوئی ہو ۔ 'آب حیات' کی غلطیوں کی نشان دہی سے پہلے شیرانی نے روح آزاد سے بڑے ادب سے معافی بھی مانگی ہے ۔ اس کا مقابلہ تنقید 'شعر العجم' کے ان فقروں سے کیجیے جن میں شبلی کو ٹوکا گیا ہے ۔

اس تفاوت کا باعث کیا ہے ؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کا ہاتھ ہے جو شبلی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ۔ اس کا آغاز حیدرآباد میں ہوا ، وہی سوءالمزاجی آگے چل کر ندوہ اور انجمن ترقی اردو کے معاملات پر اثر انداز ہوئی اور شیرانی بھی اس کا شکار ہو گئے ۔

ممکن ہے یہ درست ہو مگر شیرانی کا انداز تحقیق بھی اس کا ذمے دار تھا —— شبلی یک سر و ہزار سودا تھے سرسید ہی کی طرح ، چناں چہ وہ معلم ، محقق ، مؤرخ ، شاعر ، نقاد ، سوانح نگار ، سیاست کے معاملات میں دل چسپی لینے والے ، ندوہ کے بانی ، صحیفہ نویس ، غرض بہت کچھ تھے ۔ اس لیے ان کی تحریروں میں اگر یک سوئی کی کمی نظر آئے تو انھیں معذور خیال کیا جا سکتا ہے اور سچ پوچھیے تو اپنے مشاغل کے باوجود شبلی کا نکھرا ہوا انداز تصنیف قابل تعجب معلوم ہوتا ہے ۔

شیرانی تحقیق و تصنیف میں یک سو آدمی تھے ۔ مآخذ کے وسیع اور گہرے مطالعے کی انھیں فرصت میسر تھی —— ان کے سامنے کوئی ندوہ ، کوئی مسلم لیگ ، کوئی کانگرس نہیں تھی ۔ بس اپنا ہی کام —— تصنیف و مطالعہ ! اس صورت میں شیرانی کو بہتر مواقع ملے ۔ چناں چہ انھوں نے ان مواقع سے پورا فائدہ اٹھایا ۔ قصہ عبدالحق کا بھی ہو سکتا ۔ لیکن مسئلہ دراصل یک سوئی کا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ شبلی ہو کوئی اور ، غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا ۔ یہ حق کسی کو حاصل

نہیں ہو سکتا کہ اس کی غلطیوں کی اصلاح ہی نہ کی جائے ـــــ باقی رہی لہجے کی بات، سو اس کے درشت ہونے کی شکایت اگر شبلی کے کسی عقیدت مند کو ہے تو اس پر ہم اسے بھی ملامت نہیں کر سکتے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ شبلی اور محمد حسین آزاد کے ساتھ مختلف طرح کا سلوک ہوا ہے۔ اسی لیے دونوں پر تنقید کا لہجہ بھی مختلف ہے! لیکن تنقیدی روح دونوں میں یکساں ہے۔ 'دیوان ذوق' مرتبہ محمد حسین آزاد پر انھوں نے جو مضمون لکھا ہے اس کے بارے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔

پروفیسر شیرانی عتیقات کے بھی بڑے ماہر تھے، کتبہ شناسی اور سکہ شناسی بھی ان کے کمالات میں شامل تھی۔ وہ سکوں کی تلاش میں دور دور کا سفر کیا کرتے تھے۔ چناں چہ وفات سے قبل ان کے پاس ہزاروں سکے جمع ہو چکے تھے جن کے مطالعے سے انھوں نے چند مضامین مرتب کیے۔ ان میں پہلی صدی ہجری میں "عرب عمال کے ایرانی مسکوکات" اور "مسکوکات کی ایک نمائش کی روداد" ـــــ دونوں مضمون معلومات سے لبریز ہیں۔

پروفیسر شیرانی دشوار پسند طبیعت کے مالک تھے، اس لیے نئی دریافتوں کے علاوہ بعض نہایت ہی مشکل فنون کی طرف خاص طور سے متوجہ تھے۔ فن تاریخ گوئی کے رموز کے ماہر تھے اور مشکل سے مشکل جملوں اور شعروں سے (جن میں تعمیہ کی پیچ دار صورتیں ہوتی تھیں) بڑی آسانی سے تاریخ نکال لیتے تھے۔ اسی طرح ان کی مہارت عروض بھی تسلیم شدہ ہے۔ ان کی ایک آرزو یہ بھی تھی کہ عروض کی تشکیل نو کی جائے؛ خاص طور سے یہ امر ان کے مد نظر تھا کہ عروض مروجہ کو سہل بنایا جائے تاکہ وزن کا شعور آسانی سے پیدا ہو جائے؛ اس سلسلے میں رباعی کے اوزان یاد رکھنے کا ایک آسان طریقہ اور عروض جدید ـــــ ان کے دو مضامین خاص توجہ کے لائق ہیں۔

یہ ہے مختصر سا جائزہ پروفیسر شیرانی کے فضائل و کمالات کا، جس کو مقدمے کی احتیاط سے میں نے بڑے اجمال سے پیش کیا ہے۔

پروفیسر شیرانی ایک نابغہ ہستی تھے۔ ان کے جملہ علمی کارنامے جن کا مذکور ہوا ہے ، مختصر زمانے میں ظہور میں آئے ، یعنی اسلامیہ کالج لاہور کی ملازمت کے آغاز سے (۱۹۲۲ء) اورینٹل کالج کی ملازمت کے اختتام تک (۱۹۴۰ء) ۔ اس سے قبل اتفاقات نے انہیں قلم اٹھانے کا زیادہ موقع نہ دیا ۔ وہ زیادہ تر انگلستان میں رہے اور مشہور ناشر لیورک کے ہاں نوادر و عتیقیات کے مبصر کے طور پر کام کرتے رہے ۔ قلمی لحاظ سے یہ سارا زمانہ تیاری میں گزرا لیکن علمی لحاظ سے یہ زمانہ بغایت مفید رہا ۔ اسی زمانے میں انھوں نے عتیقیات کی نباضی سیکھی اور وہ نظر حاصل کی جو کسی اعلیٰ فن شناس کو عطا ہوتی ہے ۔

پروفیسر شیرانی نے شاعری بھی کی مگر اس کا سلسلہ جاری نہیں رکھا ، جو کچھ لکھا ہے اس سے زور طبعت اور قدرت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

پروفیسر شیرانی نے تھوڑے ھی عرصے میں جو بڑے بڑے کام کر دکھائے ، ان میں ایک امر لائق توجہ یہ ہے کہ انھوں نے ارزاں تصنیف اور سہل الحصول مؤرخانہ خامہ فرسائی کے راستے بند کر دیے ۔ تاریخی تحریروں پر سخت اور کڑی تنقید کر کے لکھنے والوں میں ذمے داری کا احساس پیدا کیا ، مصنفوں کو محنت کا عادی بنایا اور قدیم ادب کو سمجھنے کا ایسا گر بتایا جو لوگوں کو اگر معلوم بھی تھا تو اس پر عمل نہیں ہوا کرتا تھا —— اصول یہ بتایا کہ کسی کتاب کے بارے میں سب سے زیادہ راہ نمائی کتاب کے اندر سے ملتی ہے کیونکہ ہر کتاب خود اپنی شہادت ہے ، کتاب کی تنقید کے اصول کتاب کے اندر موجود ہوتے ہیں ۔ شیرانی نے اس اصول پر عمل کر کے مصنفوں کو ایک راستہ دکھایا ——! شیرانی نئی دریافتوں کے شائق تھے ، انھوں نے کئی نئی باتیں دریافت کیں ، بہت سے تاریخی مغالطے (جو مسلمات کا درجہ رکھتے تھے) دور کیے ، تاریخ اور تاریخ ادب کا ذوق پیدا کیا ، مسلمانوں کے ورثے کی طرف توجہ دلائی اور فنون اسلامی کے علم و شعور کو بہت ترقی دی ؛ خصوصاً ادب و فن

کے اس حصے کو مد نظر رکھا جس کا تعلق ہندوستان سے تھا ——
یہ کارنامے ہماری ادبی تاریخ کا وقیع حصہ ہیں -

مضامین شیرانی کی اشاعت ایک ضروری فرض تھا اور مقام مسرت ہے کہ مجلس ترقی ادب لاہور اس فرض کو ادا کر رہی ہے - مظہر محمود خاں شیرانی بھی مستحق صد تحسین ہیں کہ انہوں نے اپنے نامور بزرگ کے مقالات جمع کر کے مرتب کیے اور اہل علم کو موقع دیا کہ ان کا یک جا مطالعہ کر سکیں -

سید عبد اللہ

۱۹—۴—۶۵
الامن - اردو نگر
ملتان روڈ — لاہور

حالات زندگی حافظ محمود شیرانی

از

مظہر محمود شیرانی (مرتب)

حالات زندگی

(مظہر محمود شیرانی)

سابق صوبہ سرحد اور بلوچستان کی سرحد پر واقع پہاڑ تخت سلیمان کے ارد گرد افغانوں کا ایک قبیلہ 'شیرانی' نہایت قدیم زمانے سے آباد ہے[1] ۔ یہ علاقہ جو تحصیل شیرانی کے نام سے موسوم ہے ، چند سال ہوئے ضلع ژوب سے علیحدہ کرکے انتظامی لحاظ سے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان سے متعلق کر دیا گیا ہے ۔ شیرانی صفت نسبتی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے جد امجد کا نام ہے جس کے سبب پورا قبیلہ اسی نام سے معروف ہوگیا ۔ پٹھانوں کی تاریخوں کی رو سے 'شیرانی' افغانوں کے جد اعلیٰ ملک قیس عبدالرشید کے ایک پرپوتے کا نام تھا[2] ۔ پہاڑی علاقہ ہونے اور بارش کی کمی کی وجہ سے یہ لوگ خاطر خواہ کاشت کاری نہیں کرسکتے ۔ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں مکی بوئی جاتی ہے ۔ ان کا اہم پیشہ گلہ بانی ہے ۔ آج کل چلغوزے کی پیداوار کے اعتبار سے یہ علاقہ پیش پیش ہے ۔

غزنوی حملوں کے سلسلے میں اس قبیلے کے کچھ افراد غالباً ذرائع معاش کے کافی نہ ہونے کے سبب لشکر میں شامل ہو کر ہندوستان چلے آئے ۔ شاید حملۂ سومناتھ سے واپسی پر یہ لوگ راجپوتانے میں قیام پزیر ہوگئے ۔ ان کی روایات کے علاوہ یہ اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ شیرانیوں کے قیام کی جگہ محمود کی سومناتھ سے واپسی کے راستے کے نزدیک واقع ہے ۔

---

۱ ۔ 'حیات افغان' صفحہ ۱۴۸ ۔

۲۔ 'تاریخ افاغنہ' حصہ اول ، صفحہ ۱۰۶ ۔ 'تذکرہ افغانی' صفحہ ۵ ۔

سابق ریاست جودھ پور کے ضلع ناگور میں کھاٹو نام کے دو موضع ہیں جو ایک دوسرے سے دو تین میل کے فاصلے پر ہیں ۔ دونوں میں امتیاز کرنے کی خاطر مشرقی قصبے کو چھوٹی کھاٹو اور مغربی کو بڑی کھاٹو کہتے ہیں ۔ کھاٹو جدید تلفظ ہے جس کی قدیم صورت کھٹو ہے ۔ تمام پرانی کتابوں ، فرامین اور کتبوں میں یہ نام بہ صورت ''کھٹو'' ملتا ہے ۔ بڑی کھاٹو کسی زمانے میں نہایت اہم مقام رہا ہے ۔ اس میں بہت سی مساجد ، مزارات اور دیگر پرانے آثار موجود ہیں ۔ ان میں سب سے قدیم ایک مسجد[1] ہے جو سلطان شمس الدین التتمش (متوفی ۶۳۳) کے دور سے تعلق رکھتی ہے ۔ اسی عہد کا ایک کتبہ بھی موجود ہے ۔ سنگ مرمر کے اس کتبے پر جو عربی میں کندہ ہے ، رمضان ۶۲۹ھ تاریخ دی گئی ہے ۔ کتبے کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدا میں التتمش کے عہد میں کسی تالاب پر نصب کیا گیا تھا ۔ یاد رہے کہ اس علاقے میں پانی کی قلت کے سبب برسات کا پانی بڑے بڑے تالابوں میں محفوظ کیا جاتا ہے جو سال بھر استعمال ہوتا ہے ۔ آج کل یہ کتبہ حضرت اسحاق مغربی کی درگاہ میں جو آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں ، موجود ہے ۔ انہی حضرت اسحاق مغربی (متوفی ۷۶۳ھ) کے مرید مشہور بزرگ شیخ احمد کھٹو تھے جن کا مزار سرکھیج (گجرات) میں واقع ہے ۔ یہ اپنے پیرخانے کی نسبت سے کھٹو کہلاتے ہیں ۔ جہانگیر اپنی توزک میں گجرات کے سفر کے سلسلے میں لکھتا ہے :

''چون مزار شیخ احمد کھٹو بر سر راہ واقع بود نخست بدا نجا رفتہ فاتحہ خواندہ شد ۔ کھٹو نام قصبہ ایست از سرکار ناگور و مولد شیخ از آنجاست ۔''

لیکن شیخ کی پیدائش کے معاملے میں جہانگیر کو سہو ہوا ہے ۔ آپ کی پیدائش کھٹو میں نہیں بلکہ دہلی کی ہے جیسا کہ ابوالفضل نے آئین میں تحریر کیا ہے :

۱۔ حافظ صاحب نے بچپن میں قرآن حفظ کرنے کے بعد ایک بار اس مسجد میں محراب سنائی تھی ۔

"لقب جمال الدین ۔ در دھلی سال ھفت صد و سی و ھفت بزاد ۔ از بزرگ زادھای آنجاست ۔ مرید و خلیفۂ بابا اسحاق مغربی ۔ نام او نصیرالدین . . . ."

علاوہ ازیں :

"شیخ احمد کھٹو درسال ھفت صد سی ھفت در دھلی مولد شد"
(بحر التوارخ)

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجیے ۔ ایک بار مولوی عبدالحق مرحوم ھمارے ھاں آئے ھوئے تھے ۔ حافظ صاحب سے بے تکلفی تھی ۔ ان دنوں والد مرحوم کی ایک نظم "او دیس سے آنے والے بتا" بڑی مشہور تھی جس میں ٹونک کے بعض مقامات مثلاً 'ان پورنا کا مندر' 'رسیا کی ٹیکری' وغیرہ کے نام موجود تھے ۔ مولوی صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا کہ "اختر نے اس نظم میں ٹونک کو اپنا وطن کیوں بنایا ، آپ لوگوں کا وطن تو کھٹو ھے کھٹو ۔" حافظ صاحب نے مسکرا کر کہا : "جی ھاں ، شیخ احمد کھٹو ۔" شیخ علیہ الرحمہ کا نام آتے ھی مولوی صاحب تعظیماً کرسی سے اٹھ کر کھڑے ھو گئے اور شرمندہ ھوئے ۔

شیرانی سب سے پہلے اسی قصبہ کھاٹو میں سکونت گزین ھوئے ۔ ان کے متعلق سب سے قدیم تلمیح کتاب مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول[1] میں ملتی ھے جو شیخ احمد کھٹو کے حالات میں نویں صدی ھجری کے وسط کی ایک تالیف ھے[2] ۔ بعد میں بعض افراد چھوٹی کھاٹو نقل مکانی کر آئے ۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر اپنی نوآبادی ڈھانی[3] شیرانیاں کے نام سے بسائی ۔ یہ نوآبادی آج تک

۱۔ یہ کتاب حضرت شیخ احمد کے کسی معتقد محمد قاسم نامی نے مرتب کی ھے ۔ اس کا قلمی نسخہ احمد آباد میں حسینی پیر کے کتب خانے میں موجود ھے ۔

۲۔ تنقید پرتھی راج راسا از حافظ محمود شیرانی ، صفحہ ۱۷۸ ۔

۳۔ ڈھانی ، راجستھانی زبان کا اسم جمع ھے اور پنجابی میں بھی مستعمل ھے ۔

موجود ہے اور وہ زمانتا حار مواضعات پر مشتمل ہے ۔

یہ علاقہ ریگستانی ہے ، جا بجا خشک پہاڑیاں ہیں ، برسات میں اگر بارش مناسب موقع پر ہو جائے تو باجرے اور موٹھ کی فصل ہو جاتی ہے ورنہ قحط سالی سے دو حار ہونا پڑتا ہے ۔ سواری اور باربرداری کے لیے اونٹ کام آتا ہے ، اسی سے ہل چلایا جاتا ہے ۔ قحط کی صورت میں لوگ مالوے کے سرسبز علاقوں کا رخ کرتے ہیں اور اگلے سال برسات کے موسم میں واپس آتے ہیں ۔ ان خشک پہاڑیوں میں جا بجا پتھر کی کانیں ہیں ۔ چناں چہ کھاٹو کا سرخ اور زرد پتھر بڑا اعلیٰ ہوتا ہے اور دور دور جاتا ہے ۔ عمدہ پتھر کے لحاظ سے مارواڑ کا علاقہ بڑا خوش قسمت ہے ۔ مکرانے کی مشہور سنگ مرمر کی کانیں بھی اسی علاقے میں ہیں ۔ پتھر کی بہتات کی وجہ سے مکانات اسی سے تعمیر کیے جاتے ہیں ۔ چھتوں کے لیے بھی پتھر کی لمبی لمبی پٹیاں استعمال کی جاتی ہیں ۔ یہ مکانات نہایت مضبوط ہوتے ہیں ۔ محرابوں اور جالیوں وغیرہ میں پتھر کی تراش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔

مارواڑ کے مختلف علاقوں میں ان گنت آثار قدیمہ موجود ہیں ۔ یہاں کے بعض قصبے مثلاً ناگور ، ڈیڈوانہ ، لاڈنوں ، کھاٹو ، پالی ، جالور ، سوانا ، میرتا وغیرہ تاریخی یادگاروں کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں ۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی حافظ صاحب مرحوم کے همراہ اس علاقے میں گھومے اور بعد میں یہاں کے اسلامی کتبات کے متعلق تحقیقات بھی کی جس کے نتائج ایک مقالے کی صورت میں پیش کیے گئے ۔ تاہم ابھی اس علاقے پر اسلامی تاریخی نقطۂ نظر سے بہت کام کرنے کی گنجائش ہے جس میں تقسیم ملک کے باعث دشواریاں حائل ہوگئی ہیں ۔

پیشہ سپہ گری کی مناسبت سے شیرانی تمام علاقے میں سپاهی کے نام سے مشہور ہوگئے اور عموماً مارواڑ کے غیر مسلم انہیں اسی نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ذرائع معاش کی کم یابی نے یہاں بھی انہیں فوجی خدمت کی طرف متوجہ کیا ۔ چناں چہ ریاست جودھ پور مارواڑ کی فوج

میں داخل ہونے لگے اور مرنے مارنے میں نام پیدا کیا - یہی وجہ تھی کہ جب عہد شاہ جہانی میں جودھ پور کے شاہی خاندان کے ایک فرد رتن سنگھ راٹھوڑ کو مالوے کا علاقہ تفویض[۱] ہوا تو وہ اس پر قبضہ جمانے کی غرض سے یہاں سے ایک دستہ شیرانیوں کا ہمراہ لے گیا - مالوے پر قابض ہونے کے بعد اس نے بہ طور دارالریاست رتلام کی بنیاد رکھی اور اس میں ایک محلہ شیرانی پورہ کے نام سے آباد کیا جو اب بھی موجود ہے -

تیرھویں صدی ھجری کی دوسری اور تیسری دھائی میں تمام راجپوتانہ اور وسط ھند نواب امیر خان کی کچھار بنا ہوا تھا - انگریز دشمنی کا نشہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا - جسونت راؤ ھلکر سے مل کر فرنگیوں کو ھر ممکن زک پہنچانے کی کوشش کی - ایک بجلی تھی کہ کبھی شمالی ھند پر کوندتی اور کبھی دکن پر جا چمکتی - جودھ پور پر خان کی ترکتازیوں کے دوران میں چند شیرانی بھی ان کے لشکر میں شامل ہوگئے - غالباً[۲] ۱۸۱۰ء میں حضرت سید احمد بریلوی کا ورود مسعود امیر خانی لشکر میں ہوا - خان عالی مقام سید صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور پورے لشکر میں آپ کی بزرگی اور تقدس کا چرچا تھا - اکثر پٹھان آپ کے معتقد ہوگئے - یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہا - ۱۸۱۷ء[۳] کے اواخر میں امیر خان اور انگریزوں کے درمیان صلح کے معاھدے پر دستخط ہوگئے اور امیر خان، نواب امیرالدولہ امیر خان والی ریاست ٹونک بن گئے - اس کے چند ماہ بعد سید صاحب واپس دھلی تشریف لے گئے اور وھاں اعلائے کلمۃ الحق کا سلسلہ شروع کیا - معاھدے کی رو سے امیر خان نے اپنی فوج کا بڑا حصہ برخاست کر دیا - ان برخاست شدہ فوجیوں سے چند آدمی جو سید صاحب سے بہت متاثر تھے، ان کے پاس دھلی پہنچے اور پھر انھی کے ہو رہے - ان میں ایک سپاھی چاند خان نامی شیرانی بھی تھے - ۱۸۲۲ء[۴]

۱- صحیفۂ زریں، صفحہ ۹۱ - ۲- سید احمد شہید، صفحہ ۸۲ -
۳- افتخار التواریخ، صفحہ ۳۵۸ - ۴- سید احمد شہید، صفحہ ۲۳۰ -

میں جب سید صاحب نے ایک بڑی تعداد کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا ، یہ بھی همراہ تھے - اسی وجہ سے انہیں ہمارے خاندان میں حاجی جی کے نام سے یاد کیا جاتا ھے -

حاجی صاحب جہاد کے واسطے سید صاحب کے همراہ سرحد تشریف لے گئے اور ۱۸۳۱ء میں امیر کی شہادت کے بعد واپس لوٹے - ان کے جسم پر زخموں کے بہت سے نشانات تھے - مولانا غلام رسول مہر نے شہدائے بالا کوٹ کی فہرست میں ایک نام چاند خان ناگوری دیا ھے [1] - ھوسکتا ھے کہ یہ نام کسی غلط فہمی کی بنا پر روایات میں شامل ھوگیا ھو ، یا ممکن ھے کہ ناگور کے علاقے کے دو چاند خان جہاد میں شامل ھوئے ھوں -

نواب امیرخاں کے صاحب زادے نواب وزیر الدولہ جو ۱۸۳۴ء میں مسند نشین ھوئے ، سید صاحب کے مرید باصفا تھے - انھوں نے بہت سے مجاہدین کو اپنے پاس ٹونک بلا لیا اور ۱۸۳۹ء میں سید صاحب کے اھل و عیال کو بھی جیر پور سے ٹونک لانے میں کام یاب ھوگئے [2] - یہ سادات اور مجاہدین چوں کہ سید صاحب کے اھل قافلہ تھے ، اس لیے ٹونک میں وہ محلہ جس میں یہ اقامت پذیر ھوئے 'قافلہ' کہلانے لگا -

حاجی صاحب کچھ عرصے رتلام (شیرانی پورہ) رھے - وھاں ایک بیوہ سے نکاح [3] کیا اور کھاٹو چلے آئے - کھاٹو میں کئی برس مقیم رھے اور کھیتی باڑی کرتے رھے - کبھی کبھی سید صاحب کی آل کی زیارت اور ساتھی مجاھدین سے ملاقات کے لیے ٹونک آتے - کھاٹو سے ٹونک براہ راست کوئی سوا سو میل کا سفر تھا - حاجی صاحب کے تین بچے ھوئے : اسماعیل خاں ،

۱- جماعت مجاھدین ، صفحہ ۱۸۹ -

۲- سید احمد شہید ، حصہ دوم ، صفحہ ۴۵۶ -

۳- اس زمانے میں نکاح بیوگان کا رواج بالکل نہ تھا اور ھندوؤں کے زیر اثر مسلمان بھی اسے انتہائی معیوب سمجھتے تھے - حضرت سید احمد شہید نے مسلمانوں میں جن بری رسموں کو روکنے کی کوشش کی ان میں امتناع نکاح بیوگان بھی شامل ھے -

اسحاق خاں اور یعقوب خاں ۔ جب بچے ذرا سیانے ہوئے تو ان کو لے کر ٹونک چلے آئے تاکہ تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں ۔ سب سے بڑے بھائی اسماعیل خان اس دور کی مروجہ تعلیم حاصل کر کے سرکار ٹونک میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے خوب معزز ہوگئے ۔ کچھ کاروبار کا سلسلہ بھی شروع کرلیا ۔ ٹونک کے محلہ مہندی باغ میں مکانات تعمیر کرائے ۔ ڈھانی میں بھی کبھی کبھی جا کر ٹھہرنے کے لیے سنگ سرخ کا ایک مکان بنوایا ۔

نواب وزیرالدولہ کا انتقال ۱۸۶۴ء میں ہوا ۔ ان کے بعد ان کے صاحب زادے نواب محمد علی خاں گدی پر بیٹھے لیکن بعض زیادتیوں کی بنا پر صرف تین سال بعد ریاست سے علیحدہ کر کے پنشن پر بنارس بھیج دیے گئے ۔ ان کے فرزند نواب ابراھیم علی خاں ان کے جانشین ہوئے ۔ ان کے نابالغ ہونے کی وجہ سے تین سال کے لیے ریاست کے انتظام کی خاطر ایک کونسل آف ریجنسی قائم کر دی گئی جس کے صدر نواب زادہ عبیداللہ خاں خلف نواب امیر خاں تھے ۔ اس کونسل کے دور کا ایک فرمان جو محرم الحرام ۱۲۸۶ھ کا نوشتہ ہے اور جس پر "حافظ محمد عباد اللہ خاں بن نواب امیر الدولہ محمد امیر خاں شمشیر جنگ" کی مہر ہے ، میرے پاس محفوظ ہے ۔ اس کی رو سے اسماعیل خان صاحب کو پچاس بیگھہ زمین عطا کی گئی ہے ۔ اس کا مضمون یہ ہے :

"دریولا بہ حکمہ تعالی و تقدس موازی پنجاہ بیگہ اراضی بارانی بجریب گنسادہ از سواد موضع بیگم پورہ نو آباد سرحد کٹھانہ پرگنہ ٹونک بہ وجہ خیر خواہی و اطاعت و خیر سگالی سرکار و حق آبادان کاری موضع مسطور بہ نام محمد اسماعیل خان نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن دواماً و مستداماً معاف و مرفوع القلم فرمودہ شد ۔ سبیل کار پردازان سرکاری آں کہ اراضی مذکور را در قبض و تصرف خان مذکور وا گذاشتہ . . . . تعرضی و مزاحمتی نرسانند و ہر سال خواہان سند مجدد نشوند و سبیل خان مسطور آں کہ بر اراضی

۱- جماعت مجاہدین ، صفحہ ۱۸۹ ۔

مذکور قابض و دخیل بوده ما حصل آن را به صرف مایحتاج خود آورده همواره بدعـای ازدیاد عمر و دولـت سرکار مصروف و مشغول باشند ۔"

محمد اسماعیل خان صاحب کی دو بیویوں سے سات لڑکے ہوئے۔ پہلی بیوی سے دو ، ابراہیم خاں اور اسرائیل خاں اور دوسری بیوی سے پانچ یعنی محمود خاں ، مسعود خاں ، مودود خاں ، مقصود خاں اور مسہود خاں ۔ حافظ صاحب (حافظ محمود شیرانی) دوسرے پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے ۔ ان کا نام اپنے والد اور دونوں بڑے بھائیوں کے ناموں کی مناسبت سے محمد میکائیل بھی رکھا گیا ۔ والد نے تاریخی نام نکالے جن میں ایک نظام الدین اسماعیل تھا ۔ ان کی پیدائش کی تاریخ کا اندراج ان کے والد نے یوں کیا ہے :

به تاریخ ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ مطابق کنوار یکم ۱۹۳۷ بکرمی یوم سه شنبه ۵ ۔ اکتوبر[۱] ۱۸۸۰ء بعد غروب آفتاب برخوردار محمد محمود عرف محمد میکائیل تولد شد ۔

اسم تاریخی : نظام الدین اسماعیل ۔ منظور میاں ۔ حمید الدین خاں (معنوی)

۱۔ میرا خیال ہے کہ ۱۸۹۸ء میں اورینٹل کالج میں داخلے کے وقت ان کی تاریخ پیدائش ۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء کی بجائے ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۲ء لکھ دی گئی ۔ یاد رہے کہ ان کی پیدائس کا دن سه شنبه دیا گیا ہے ۔ اب ۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو تقویم کی رو سے سه شنبه بنتا ہے لیکن ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو جمعے کا دن تھا ۔ اس لیے صحیح تاریخ ۵ اکتوبر ہے نہ کہ پندرہ ۔ سال کی بابت یہ ہے کہ ان کے تاریخی ناموں سے ۱۲۹۷ھ برآمد ہوتا ہے جو ۱۸۸۰ء کے مطابق ہے ، ۱۸۸۲ء کے نہیں ۔ علاوہ ازیں ان کے چھوٹے بھائی مسعود خاں کی پیدائش کا سن ۱۸۸۲ء دیا گیا ہے ، اس لیے حافظ صاحب کی پیدائش کا سن ۱۸۸۲ء (جو ان کی ملازمت و طالب علمی کے کاغذات میں درج ہے) غلط ہے ۔ غالباً داخلہ فارم پر

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۵ پر)

اس زمانے میں نواب وزیر الدّولہ اور نواب ابراھیم علی خان کی کوششوں سے ٹونک اسلامی علوم کا مرکز بن گیا تھا ۔ اس ماحول میں حافظ صاحب نے آنکھ کھولی ۔ ٹونک میں رواج تھا کہ ابتدائی قاعدہ پڑھانے کے بعد بچوں کو قرآن حفظ کراتے تھے ۔ اس عمر میں ذھن تازہ ہوتا ھے اس لیے بچہ بڑی آسانی سے یہ سعادت حاصل کر لیتا ھے ۔ اس رواج کی وجہ سے ٹونک کے چھوٹے سے شہر میں حفاظ کی تعداد اتنی ہوتی تھی کہ بڑے بڑے شہروں میں دست یاب ھونی ممکن نہ تھی ۔ خود نوابوں اور صاحب زادوں میں اکثر حفاظ تھے ۔ حافظ صاحب نے بھی اوائل عمر ھی میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ۔ اس کے بعد مروجہ علوم کی تعلیم شروع ھوئی جن میں فارسی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی ۔ اس میں کئی سال صرف ھوئے ۔

۱۶ مارچ ۱۸۹۷ءکو ڈھانی شیرانیاں میں عالم خاں ولد محراب خاں شیرانی کی دختر سے آپ کا نکاح ھوا ۔ اسی سال انگریزی پڑھنا شروع کی ۔ اس غرض سے انھیں جودھ پور بھیجا گیا ۔ ان دنوں ریل گاڑی جے پور سے ملا کرتی تھی ، اس لیے ٹونک سے جےپور تک ساٹھ میل کا سفر بیلوں یا اونٹ گاڑیوں میں طے کرنا پڑتا تھا ۔ یہ اونٹ گاڑیاں ان پہیے دار پنجروں کی طرح ھوتی تھیں جن میں سرکس والے اپنے شیر اور چیتے بند کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ھیں ۔ اس میں دو منزلیں ھوتی تھیں ۔ نچلی منزل میں آٹھ سے بارہ تک آدمی سما سکتے تھے ، اوپر کی منزل میں بھی جس پر سرکی کی چھت ھوتی تھی ، چھ سات آدمی ٹھونس دیے جاتے تھے ۔ داخلے کا دروازہ پچھلی طرف ھوتا تھا جو سوار ھونے کے بعد بند کر دیا جاتا تھا ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴)
اپنی تاریخ پیدائش انھوں نے اپنی یادداشت کی بنا پر لکھوائی جس میں ان کو سہو ھوا ۔ یہ بھی ممکن ھے کہ عمر میں دو سال کی کمی جان بوجھ کر کی گئی ھو لیکن تاریخ میں تبدیلی محض حافظے کی غلطی ھی قرار پائے گی ۔ انتقال کے وقت ان کی عمر عام خیال کے مطابق تریسٹھ سال تھی حالاں کہ اس حساب سے پینسٹھ برس ھونا چاھیے ۔

اس سفر کا ایک دل چسپ واقعہ حافظ صاحب ہمیں سنایا کرتے تھے : چاندنی رات تھی ، حضرت اونٹ اپنی روایتی سنجیدگی کے ساتھ ٹکے حال چل رہے تھے ۔ سب مسافر مع گاڑی بان اپنی اپنی جگہ سکڑے سمٹے اونگھ رہے تھے ۔ خود ان کا لڑکپن تھا ، نیند نہیں آرہی تھی ۔ کبھی سلاخوں میں سے باہر چاندنی میں نظر دوڑانے لگتے اور کبھی گاڑی میں مٹھی حالت میں سوئے ہوئے لوگوں کی ہیئت کذائی پر مسکرائے ۔ جب گاڑی کے پہیے کسی پتھر یا گڑھے پر سے گزرتے تو دھچکے کے ساتھ نیند سے جھولتے ہوئے آدمیوں کے سر ایک دوسرے سے ٹکراتے ۔ چند لمحوں کے لیے وہ ہوشیار ہو بیٹھتے لیکن پھر نیند میں کھو جاتے ۔ اچانک حافظ صاحب کی نظر سامنے جو پڑی تو گاڑی سے کوئی بیس پچیس قدم کے فاصلے پر لکڑی کی ایک بلی سڑک کے آر پار پڑی نظر آئی ۔ یہ دل ہی دل میں اس بات پر محظوظ ہوئے کہ جب کوئی دم میں گاڑی اس پر سے گزرے گی تو لوگوں کی زور زور سے ٹکریں ہوں گی اور خوب لطف آئے گا ۔ تھوڑی دیر تک انتظار کیا لیکن بلی ہے کہ گاڑی کے پہیے کے نیچے آنے کا نام نہیں لیتی ۔ اس کی تلاش میں نظر دوڑائی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ لکڑی کی بلی سڑک کے بائیں طرف والے چٹیل میدان میں بھاگی جا رہی ہے ۔ انھوں نے زور سے کہا ''سانپ!'' اور کھٹ سے پچھلا دروازہ کھول ، باہر چھلانگ لگا ، سانپ کے پیچھے دوڑے ۔ اب ادھر کی سنیے ۔ سانپ کے نعرے نے اونگھتے ہوئے لوگوں پر جادو کا اثر کیا ۔ وہ سمجھے کہ سانپ گاڑی کے اندر موجود ہے اسی لیے تو یہ لڑکا فوراً باہر کود گیا ۔ چناں چہ آن کی آن میں گاڑی خالی ہو گئی ۔ باہر آ کر جب حواس بجا ہوئے اور معاملہ سمجھ میں آیا تو لگے بڑبڑانے ۔ ایک ملازم ان کو چھوڑنے جا رہا تھا ، اسے مجبوراً پیچھے بھاگنا پڑا ۔ اژدھا ادھر آدھر بلوں میں گھسنے کے لیے منہ مارتا لیکن بل تھے چوہوں کے اور وہ اجگر ۔ آخر ایک بڑا بل مل گیا ، اس میں داخل ہو گیا ۔ اتنے میں یہ بھی آن پہنچے ۔ کوئی بالشت بھر دم باہر رہ گئی تھی کہ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے مضبوط تھام کر گھٹنوں کی ٹیک لگائی ۔ اب مارنے کا سوال پیدا ہوا ۔ ملازم پہنچ گیا تھا ، اس سے

پوچھا ''تیرے پاس کوئی چیز ہے؟'' اس نے کہا ''میاں ایک چاقو ہے۔'' کہا ''بلا سے وہی نکال۔'' عرض ہوا یہ کہ جتنا حصہ باہر تھا وہ ملازم کی مدد سے دو حصوں میں چیر ڈالا ۔ پھر جھٹکا دے کر تھوڑا سا اور نکالا اسے چیرا ۔ اس طرح اس کا کام تمام کیا ۔ تمام کپڑے اس کے خون سے تر ہو گئے لیکن اس عمر میں ایسی باتوں کی پروا کہاں ہوتی ہے۔

غالباً ۱۸۹۸ء میں جودھ پور سے مڈل کے امتحان میں کام یاب ہو کر واپس آئے ۔ اس زمانے میں شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی اورینٹل کالج لاہور میں پڑھایا کرتے تھے۔ وہ علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور منطق کے بھی جید عالم تھے۔ جن دنوں حافظ صاحب جودھ پور سے آئے ، اتفاق سے مفتی صاحب بھی ٹونک میں تھے ۔ چناں چہ ان کے والد نے ان کو مفتی صاحب کے حوالے کر دیا تاکہ انھیں لاہور لے جا کر داخل کرادیں ۔ یہاں اورینٹل کالج سے انھوں نے منشی ، منشی عالم اورمنشی فاضل کے امتحانات پاس کیے ۔ وہ عالم ۱۸۹۹ء کے امتحان میں اول اور فاضل ۱۹۰۱ء کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوم آئے ۔
شعر و سخن سے دل چسپی تو ٹونک کی تعلیم ہی کے دوران میں شروع ہو چکی تھی ۔ چناں چہ اس عرصے میں آپ نے کچھ نظمیں وغیرہ کہیں جن میں ان کی معرکہ آرا نظم 'ٹیپو سلطان' بھی شامل ہے ۔ فکر سخن کا چسکا آیندہ کئی برس تک جاری رہا اور اس وقت چھوٹا جب وہ میدان تحقیق کے شہ سوار قرار پائے۔

اورینٹل کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ پھر انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ اب ان کے والد نے مزید تعلیم کے لیے انھیں ولایت بھیجنے کا ارادہ کیا ۔ ان کا خیال اپنے لڑکے کو بیرسٹر بنانے کا تھا ۔ اس کے لیے حافظ صاحب کی انگریزی تعلیم کافی نہ تھی ۔ تاہم فیصلہ یہ ہوا کہ اپنی انگریزی کی کمی بھی وہ ولایت جا کر ہی پوری کریں ۔ چناں چہ وہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے راستے عازم انگلستان ہوئے اور ۴ اکتوبر کو لندن پہنچے ۔

انگلستان میں حافظ صاحب کے قیام کے حالات کا بہترین ماخذ وہ

خطوط ہیں جو انھوں نے وہاں سے اپنے والد ، بھائیوں اور دوسرے احباب کو لکھے تھے ۔ افسوس کہ ان میں سے بہت سے خط ضائع ہو گئے ، جو باقی ہیں ان میں سے بعض کے حصے غائب ہیں ۔ بہر حال یہ خطوط مکمل و نا مکمل کوئی پچاس کے قریب موجود ہیں ۔ یہ خطوط کچھ تو ان کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں ، بعض سے ان کے ارادوں کا اظہار ہوتا ہے اور کئی اس دور کے لندن کی سماجی اور ثقافتی دلچسپیوں کے بیانات سے مملو ہیں ۔

حافظ صاحب کو ولایت بھیجنے سے ان کے والد کا منشا اگرچہ قانون کی تعلیم کا حصول تھا لیکن وہ خود قانون کی بجائے زراعت کی تعلیم اپنے لیے زیادہ مناسب سمجھتے تھے اور اس کا اظہار وہ دبی زبان سے والد کے سامنے کر بھی گئے تھے ۔ چناں چہ وہاں پہنچ کر اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور ایسے لوگوں سے جو اس معاملے میں کچھ جانتے تھے ، مشورے لیے ۔ اس کے متعلق والد کے نام ایک خط میں جو ۲۱ - اکتوبر ۱۹۰۴ء کو مرقوم ہوا ہے اور ولادت سے ان کا تیسرا خط ہے ، لکھتے ہیں :

"میں اس وقت سخت متذبذب ہوں کہ کیا کروں ۔ اس وقت میرے سامنے دو صیغے ہیں! ایک قانونی ، دوسرا زراعتی ۔ میں نے اپنے خیالات وہاں بھی جناب پر ظاہر کیے تھے کہ ایگریکلچر یعنی زراعتی صیغہ اچھا ہے ۔ یہاں آ کر جو اس کے لیے میں نے خط و کتابت کی تو اس کی وقعت میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی ۔ اب تک اس میں صرف چھ مسلمان اور بیس ہندو داخل ہوئے ہیں . . . .
میں زراعت کی بابت اور زیادہ دریافت کر رہا ہوں ۔ پورے اطمینان پر ہی مجھ کو اس میں داخلے کے لیے آپ کی اجازت درکار ہوگی ۔ یہ مجھے خوب معلوم ہے کہ جناب قانون کے صیغے کو پسند کرتے ہیں ، سو اس کی خلاف ورزی میں کچھ نہیں کروں گا ۔"

الغرض کچھ تو اس خیال سے کہ زراعت کے لیے زیادہ مشکل اور

فنی قسم کی انگریزی کی ضرورت تھی لیکن زیادہ تر اپنے والد کی مرض
کے پیش نظر وہ قانون کی تعلیم کے لیے 'لنکنزان' میں داخل ہو گئے
ساتھ ھی ساتھ انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش شرو
کی اور انگریزی ادب کا بہ غور مطالعہ کرنے لگے ۔

ابھی انھیں انگلستان پہنچے پورے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ و
سخت بیمار پڑ گئے ۔ یہ بیماری انھیں دسمبر ۱۹۰۴ء کے آخری عشر
میں لاحق ہوئی ، جب وہاں کی سردی پورے جوبن پر آئی ۔ بیماری اتن
زبردست تھی کہ وہ زندگی سے مایوس ہو گئے ۔ اسی نا امیدی کی حالت
میں ۵ جنوری ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں اپنے والد کو لکھتے ھیں :

''مجھے اپنی زندگی کی کچھ امید نہیں رہی ہے ۔ میرا تمام سر سوج
رہا ہے ، چہرے پر ورم ہے ؛ یہ بیماری میں نے کبھی ہندوستان
میں نہیں دیکھی اور نہ سنی ۔ ناک اور منہ سے خون جاری ہے
اور دونوں سے رات دن پیپ بہہ رہی ہے ۔ درد کی یہ شدت ہے
کہ اللھم حفظنا ۔ جب ڈاکٹر دو تین روز میں سونے کی دوا دے
دیتا ہے تو چھ سات گھنٹے کے لیے سو رہتا ہوں ورنہ وہی
بے قراری اور وہی تڑپنا ۔ ڈاکٹر نے دو نرسیں بھیج دی ہیں ، وہ
اٹھاتی بٹھاتی سلاتی ہیں ۔ میں دل میں کیا کیا امیدیں لے کر
یہاں آیا تھا لیکن کیا خبر تھی کہ یہاں میرا موت سے سامنا ہوگا ۔''

آخر ان کا آپریشن ہوا اور ڈاکٹر نے دونوں کانوں کے پیچھ
شگاف دے کر تمام فاسد مادہ نکالا ، لیکن اس بیماری نے کوئی ساڑ
تین ماہ تک انھیں بستر پر رکھا اور اس سے ان کے تعلیمی مشاغل میں
تعطل پیدا ہو گیا ۔ بیماری کے دوران میں شیخ عبدالقادر (سر) ، سور
نرائن (بیرسٹر) ، لالہ جگ ناتھ (امرتسری) اور دوسرے ہندوستانی احباد
جو ان دنوں وہاں بہ طور طالب علم مقیم تھے، ان کی خبر گیری کر
رہے ۔ بلکہ اسی ذریعے سے شیخ عبدالقادر کی حافظ صاحب کے وال
سے خط و کتابت کی ابتدا ہوئی ۔ دو ایک بار پروفیسر آرنلڈ بھی عیادت
کو آئے ۔

بیماری سے ان کی بینائی اور سامعہ پر برا اثر پڑا ، تاہم انھوں نے

همت سے کام لیا اور اپریل کی ٹرم میں شامل ہو گئے - مئی سے چار ماہ کی چھٹیاں ہوتی تھیں - ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اس عرصے میں وطن چلے جاؤ ، لیکن انہیں یہ پسند نہ تھا کہ بغیر کام پانی حاصل کیے گھر کا رخ کریں - دوسرے یہ ارادہ تھا کہ اس چار ماہ کے عرصے میں جب موسم بھی خوش گوار ہوگا ، اپنی تعلیمی کمی پوری کرنے کی کوشش کریں گے - انھیں اب بھی زیادہ فکر انگریزی زبان کی تھی - ان دنوں کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میں ہندوستان آتا مگر میری موجودہ مشکلات مجھ کو روکتی ہیں - اگر میں یہاں رہا تو میرے حق میں نہایت مفید ثابت ہوگا - اسی خیال سے میں موجودہ مکان کو تبدیل کرنے والا ہوں کیوں کہ یہاں مجھ کو لوگوں سے میل جول کا موقع کم ملتا ہے -''

اسی غرض سے انھوں نے مکان تبدیل کر لیا اور ایسی جگہ رہنے لگے جہاں زیادہ تر انگریز رہتے تھے - کھانا پابندی کے ساتھ یک جا کھایا جاتا تھا اور ملاقات کا کمرہ بھی ایک ہی تھا - اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکتا ، وہ کسی محفل یا جلسے میں پہنچنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے بلکہ میلوں ٹھیلوں میں بھی شرکت کرنے سے نہ چوکتے- ایسی بعض محفلوں اور میلوں کا دل چسپ حال ان کے خطوط میں موجود ہے -

مارچ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے رائل ایسیاٹک سوسائٹی کا رکن بننے کا ارادہ کیا - چناں چہ لکھتے ہیں :

''مسٹر ینگ نے مجھ کو گذشتہ اتوار کو ہیں مجھے بلایا - میری خیر و عافیت پوچھی - کہنے لگے تمھارے والد کا خط آیا تھا - پھر میں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے واسطے کہا . . . . . . انھوں نے اقرار کیا کہ وہ بڑی خوشی سے میرے لیے سفارش کریں گے کیوں کہ اس میں ضروری ہے کہ دو ممبر داخل ہونے والے کی سفارش کریں - آئندہ اتوار کو ان کے پاس پھر جاؤں گا - وعدہ ہو گیا ہے -'' (مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء)

ایک خط میں جو انھی دنوں لکھا گیا ہے ، بہ طور والنٹیر فوجی ٹریننگ لینے کا خیال ظاہر کیا ہے :

''یہاں والنٹیر فوج کا ایک صیغہ ہے جس میں ہر ایک انگریز شامل ہو سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ غیر ملک کے رہنے والوں میں انگریزی رعایا کو بعض خاص شرائط کے ساتھ شامل کر لیتے ہیں ۔ میں نے اس فوج کے کرنل سے ملاقات کی ہے ۔ بعد میں اس نے مجھ کو اس میں شریک ہونے کے قواعد بھیجے ۔ چندہ داخلہ تین پونڈ ہے اور دس شلنگ جو سالانہ ادا کرنا پڑے گا ۔ قد اور سینہ کی شرط میں پوری کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط یہ ہے جو ذرا سخت ہے کہ چار سال تک اس میں مشق کی جاوے ۔ اس شرط کو میں پورا نہیں کر سکتا کیوں کہ میں شائد بیں ساڑھے بیں سال سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا ۔''

یہ فوجی تربیت حاصل کرنے سے ان کے دو مقصد تھے : ایک تو یہ کہ واپسی پر ہندوستان میں انگریز حکام انھیں قدر کی نظروں سے دیکھیں گے ، دوسرے یہ کہ اپنا شکار کا شوق پورا کرنے کے لیے وہ بغیر لائسنس بندوق رکھ سکیں گے ۔

حافظ صاحب نے ہندوستان میں کبھی انگریزی لباس استعمال نہیں کیا تھا ، ولایت جا کر پہننا شروع کیا ۔ زیادہ تر فراک کوٹ پسند کرتے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی ہندوستانی وضع قائم رکھنے کے لیے کبھی کبھی راجستھانی انداز کا صافہ باندھا کرتے ۔ ۱۹۰۵ء کی ایک تصویر جو غالباً علیگڑھ کالج ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر سے تعلق رکھتی ہے ، انھوں نے اپنے والد کو بھیجی تھی ۔ اس میں ہندوستانی صحاب میں میجر سید حسن بلگرامی ، جسٹس سید امیر علی ، سرکاؤس جی جہانگیر بار ایٹ لاء ، شمس العلما سید علی بلگرامی ، شیخ عبدالقادر اور خود حافظ صاحب موجود ہیں ۔ زیادہ تر انگریز ہیں جن میں تھیوڈور موریسن سابق پرنسپل علیگڑھ کالج اور ڈبلیو ۔ اے ۔ جی آرچ بولڈ شامل ہیں ۔ اس تصویر میں بھی حافظ صاحب اپنی راجستھانی پگڑی

اور سید علی بلگرامی اپنی ترکی ٹوپی کی وجہ سے نمایاں ہیں ۔ بعد کے زمانے میں حافظ صاحب بھی سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی استعمال کرنے لگے تھے اور ان کی یہی وضع آخر دم تک قائم رہی ۔

۴- مئی ۱۹۰۵ء کو ٹونک میں حافظ صاحب کے فرزند داؤد خاں (اختر شیرانی) پیدا ہوئے ۔ یہ اطلاع انھیں لندن ہی میں ملی تھی۔

جولائی کے آخر میں وہ تفریح کے لیے ایک انگریز کی معیت میں ساحل سمندر پر واقع مقام ھرن بے چلے گئے اور کچھ دن وہاں پر کشتی رانی اور سیر سے جی بہلاتے رہے ۔ وہاں کے دیہاتی ماحول سے وہ بہت متاثر ہوئے :

''پھر کو ہم لوگ باھر کنٹری میں پھرنے گئے ۔ تمام ولایت سرسبز اور شاداب ہے ۔ سبزہ جو ہم ھندوستان میں صرف برسات میں دیکھتے ہیں ، یہاں بارہ مہینے ہے ۔ لیکن لندن میں یہ لطف نہیں ہے جو اس کنٹری کی سیر میں آتا ہے ۔ تمام صحرا ایک باغ معلوم ہوتا ہے ۔ خود رو جنگل افراط سے ہیں اور ہمارے جنگلوں کی طرح یہاں کوئی جنگل نہیں بلکہ یہاں کا جنگل ہمارے باغات کے مطابق ہے ۔''

والد صاحب کو ۳- اگست ۱۹۰۵ء کے خط میں اپنے تعلیمی مشاغل کی بابت لکھتے ہیں :

''لالہ سورج نرائن صاحب اور میں ایک ہی کالج میں ہیں لیکن جدا گانہ کلاسوں میں ۔ میں اور وہ پہلے ایک ہی درجے میں تھے یعنی وہ بھی رومن لاء کلاس میں تھے اور میں بھی، لیکن جون میں وہ رومن لاء امتحان میں شریک ہو کر فیل ہو گئے ، اس لیے اب وہ کریمینل لاء یعنی قانون فوج داری کی جماعت میں لکچر سنتے ہیں اور میں رومن لاء میں . . . . . . سورج صاحب رومن لاء میں کیوں فیل ہو گئے ، نہ اس لیے کہ ان کی لیاقت میں کمی تھی ؛ ان کی انگریزی لیاقت بہت اچھی ہے ، مگر ان کے فیل ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے لاطینی اصطلاحوں کو یاد نہیں کیا

اور یہی وجہ شیخ عبدالقادر صاحب کے فیل ہونے کی ہے ۔ انھوں نے بھی لاطینی اصطلاحوں کو سرسری خیال کیا اور پرچہ امتحان کا تمام لاطینی اصطلاحوں سے پر تھا ۔ نتیجہ یہ کہ دونوں صاحب فیل ہو گئے ۔ شیخ صاحب کو لندن آئے ہوئے تیسرا سال شروع ہونے والا ہے ۔ انگریزی دانی کے لیے عام معلومات کا ہونا ضروری ہے جو وقت پر منحصر ہے لیکن قانون کے لیے قانونی اصطلاحات ، تعریفات اور تشریحات کا جاننا ضروری ہے ۔ سو انگریزی دانی میں یہ دونوں صاحب مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن قانون میں شاید ہم سب برابر ہوں ۔ بیماری نے میرا یہ حرج کیا کہ میں اگر بیمار نہ ہوتا تو شاید شیخ صاحب اور سورج صاحب کے ہمراہ ہی امتحان میں شریک ہو جاتا لیکن بیماری کی وجہ سے میں شریک نہ ہو سکا اور جو کچھ تیاری بیماری سے پیشتر میں نے کی تھی ، سب رائگاں گئی ۔ اب تمام کام از سر نو شروع کرنا پڑا ، لیکن آپ کو میری طرف سے کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے ۔ میں انٹرنس پاس ہوں تو کیا ہوا ۔ نتیجہ انھی دو سالوں میں انھی لوگوں کے برابر کر دکھاؤں گا اور اپنی انگریزی میں خامی کو بھی پورا کر لوں گا ۔"

انھی دنوں انھیں فری میسن تحریک میں شامل ہونے کا شوق ہوا ۔ اس تحریک کا اپنے والد سے تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ ایک خفیہ جماعت ہے اور اس کے مقاصد دنیا میں ہم خیالی اور ہم دردی پھیلانا ہیں ۔ قدیم تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی جس میں قوموں نے اپنی خفیہ جماعتیں قائم کر کے زبردست سلطنتوں کو برباد کر دیا ہے ۔ عرب میں اسی قسم کی ایک جماعت نے دولت بنو امیہ کا خاتمہ کیا ۔ مصر میں خلفائے بنو عباس نے اسی قسم کا پہلو اختیار کیا ۔ اس وقت دنیا اخلاقی اصول میں خام تھی ۔ سو اس قسم کی جماعتوں اور خفیہ کوششوں سے اثر کا استعمال صرف سلطنتوں کی بربادی میں کیا جاتا تھا ۔ لیکن

اب دنیا شائستہ ہے اور اس خفیہ اثر سے مفید نتائج حاصل کیے جاتے ہیں ، خواہ وہ ملکی ہوں یا قومی ۔ اس زمانے میں روس میں اس قسم کی ایک جماعت ہے جو حکمران حال خاندان کے خلاف ہے ، یہ جماعت نہلسٹ کہلاتی ہے ۔ لیکن اس کی طاقت کا اور اثر کا آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ روس جیسی طاقت ور سلطنت اس جماعت کا کچھ نہیں کرتی اور روس میں جس قدر فساد اور سرکشیاں آپ سنیے ہیں ، اس کے موجد نہلسٹ ہیں اور ایک زمانہ آوے گا (جو شاید نہایت قریب ہے) جب کہ روس جیسی قوی سلطنت کو یہی نہلسٹ برباد کر دیں گے ۔ خیر یہ تو اس خفیہ اثر کی بری مثال ہے ۔ فری میسن کو نہلزم یعنی نہلسٹ فرقے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ کوئی مشابہت لیکن ان کے اصول ایک ہی بنیاد پر ہیں اس لیے کچھ مشابہت دے سکتے ہیں ۔ جماعت فری میسن ایک روشن جماعت اور نہایت ہی شائستہ فرقہ ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تمام اغراض ، ہم دردی اور بہتری پر مبنی ہیں ، اس کے خواہ کچھ ہی قانون ہوں لیکن وہ خفیہ ہیں ۔ ان میں کچھ علامتیں ہیں جن سے ایک ممبر دوسرے ممبر کو پہچان سکتا ہے ۔ میں اس میں داخلے کو ضروری سمجھتا ہوں ۔"

معلوم ہوتا ہے کہ فری میسن میں داخلے سے متعلق ان کے والد نے کوئی ایسی شرط پیش کر دی جس کی وجہ سے وہ اس کے رکن نہیں ہوئے ۔

لندن میں انھوں نے اپنے دوستوں کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں کیا ۔ اس کی بڑی وجہ ان کی تعلیمی مصروفیات تھیں ۔ ہندوستان کے لوگوں کو چھوڑ کر جن کا وجود ، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ، پردیس میں غنیمت معلوم ہوتا تھا ، ان کی واقفیت بڑی محدود تھی ۔ ایسے انگریزوں میں سے جن کے پاس وہ وقت نکال کر بھی جاتے تھے ، مجھے صرف دو نام پروفیسر آرنلڈ اور

مس میننگ ۱ کے ملے ھیں ۔ موخرالذکر سے ان کے والد کی بھی خط و کتابت تھی ۔

اس محدود حلقۂ احباب کے ساتھ ساتھ جب کبھی انھیں کسی محفل میں شرکت کا موقع ملتا ، خوب چہکتے اور نئے ملنے والوں سے بھی بادلۂ خیال کرتے ۔ موقع محل کی مناسبت سے لطیفہ گوئی بھی ھوتی اور بذلہ سنجی کی داد پاتے ۔ ایسی مجالس اکثر انڈین ایسوسی ایشن ، علیگڑھ کالج ایسوسی ایشن اور پین اسلامک ایسوسی ایشن کے ذریعے منعقد کی جاتیں ۔ علاوہ ازیں عیدین کے موقع پر مختلف ممالک کے مسلمانوں کے اجتماع ھوے اور عید کے دن وہ بعض دوستوں کے ھمراہ مبارک باد کے بہانے اسلامی ممالک خصوصاً ترکی و ایران کے سفرا کے ھاں بھی پہنچ جاتے ۔ علیگڑھ کالج ایسوسی ایشن کے جلسے کا حال بیان کرتے ھوئے لکھتے ھیں :

"میرے برابر مسٹر ڈنلپ سمتھ تھے اور میرے مقابل میر پر ڈاکٹر پالنر سی ۔ آئی ۔ ای ۔ ایل ۔ ایل ۔ ڈی ۔ ڈاکٹر پالنر سے میری خوب خوب باتیں ھوئیں ۔ یہ فارسی بھی جانتے ھیں ۔ مجھ سے پوچھا "کہاں سے آئے ھو؟" میں نے کہا "راجپوتانہ سے" بولے "فارسی جانتے ھو؟" میں نے کہا "ھاں" خیر ھم فارسی بولنے لگے۔ بعد میں بولے "گجراتی جانتے ھو؟" میں نے کہا "سمجھ سکتا ھوں"

---

۱ ۔ پروفیسر آرنلڈ کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ مس میننگ انڈین ایسوسی ایشن کی آنریری سیکریٹری تھیں ۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء کو ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی ۔ ھندوستان کی محبت گھٹی میں پڑی تھی ۔ دو بار سفر ھند بھی کیا ۔ انتقال پر ساٹھ ھزار سے زیادہ روپیہ انڈین ایسوسی ایشن کو بطور عطیہ دیا ۔ ان کا مکان ھندوستانیوں کے لیے جائے پناہ تھا ۔ دامے درمے سخنے ھر طرح امداد کو تیار ۔ کوئی بیمار ھے تو اسے پوچھنے جا رھی ھیں ، کسی کو سفارشی خط دے رھی ھیں ۔ ان کے انتقال پر شیخ عبدالقادر نے تفصیلی حالات لکھے جو دسمبر ۱۹۰۵ء کے 'مخزن' میں شائع ھوئے تھے ۔

وہ گجراتی میں بولنے لگے اور میں انگریزی میں جواب دیتا رہا ۔ پھر بولے ''پنجابی جانتے ہو؟'' میں نے کہا ''ہاں'' پھر ہم پنجابی میں بولنے لگے۔ پھر اردو کی نوبت آئی اور پھر پشتو کی ، پھر بنگالی کی ، پھر مرہٹی کی اور میں ان میں جواب دیتا رہا ۔ مسٹر ڈنلپ بولے کہ میں اٹھائیس سال ہندوستان میں رہا اور افسوس ہے کہ مجھے ہندوستانی بولنا نہیں آئی ۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں حیرت کرتا ہوں اٹھائیس سال تم جس ملک میں رہے اس کی زبان بھی تم کو نہیں آئی ۔ بولے ''صرف دو جملے مجھ کو آتے ہیں''۔ میں نے کہا ''وہ کیا؟'' بولے ''چھ مہینا کا کیڈ'' (چھ مہینہ کا قید یعنی چھ ماہ قید) اور ''ہم افسوس کرتا ہے'' (ہم افسوس کرتا ہے بجائے میں افسوس کرتا ہوں ۔ انگریزی میں کسی فعل کے نفی میں جواب دینے کے وقت متکلم اخلاقاً تمہیداً یہ جملہ کہتا ہے کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ یہ کام میں نہیں کر سکتا) ۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ اگر آپ کی اس اردو زبان دانی سے کوئی شخص آپ کی اخلاقی حالت کا موازنہ کرنا چاہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا جانے کس قدر مذموم نتیجہ نکلے ۔ آپ کا پہلا کلمہ ہے کہ میں افسوس کرتا ہوں ، اس کے بعد ضرور ہے کہ آپ نے نفی میں جواب دیا ہو اور دوسرا جملہ ہے چھ مہینہ کا قید یعنی اس پر بھی باز نہ آئے تو آپ نے چھ مہینہ کا حکم دیا ۔ مسٹر ڈنلپ سمتھ ہنس پڑے اور بولے 'یو وکڈ سوائے' (شریرالنفس لڑکے یعنی نالائق آدمی) ۔''

مسٹر کولڈ سٹریم 'لنکنزان' کے ماسٹر آف دی بنچ تھے ۔ جب کسی گرجے میں کوئی مذہبی تقریب ہوتی تو وہ ان کو بھی مدعو کرتے ۔ ۳ ۔ مئی ۱۹۰۵ء کو عیسائی مشنریوں کا سالانہ جلسہ رائل البرٹ ہال میں منعقد ہوا ۔ اس میں انگریز مشنریوں نے ایشیا اور افریقہ میں اپنی تبلیغی کام یابیوں کی رو داد پیش کی ۔ ہندوستان کے لاٹ پادری نے دوسری باتوں کے علاوہ وہاں کے قدیم فرقے سنتھال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان میں عیسائی مذہب بہت تیزی سے پھیل رہا ہے ۔ آگے حافظ صاحب ہی کی زبانی سنیے :

" میرے قریب ایک هندوستانی (سندھی) بیٹھے تھے ۔ انھوں نے مجھ سے میرا نام پوچھا ۔ میں سمجھ گیا تھا جس خیال سے انھوں نے یہ تکلیف کی تھی ۔ میں نے اول تو ان کا نام دریافت کیا جس پرانھوں نے فخریہ لہجے میں کہا "عبدالحمید خاں" بعد میں میں نے مذاق میں کہا 'فرض کرو میرا نام بھوجو ہے جو سنتھالی نام ہے ۔ اس پر وہ گھبرائے اور خاموش ہو رہے ۔ میں نے چھیڑ کر کہا "کیا تم ایک سنتھالی سے بات نہیں کرو گے ؛ بہ لحاظ ھندوستانی ھونے کے ان کو مغرور آریہ اور وحشی مزاج پٹھانوں پر فوق ہے ۔" کچھ شرمائے اور بولے "نہیں ، میرا یہ منشا نہیں تھا ۔ میں نے صرف نام دریافت کیا تھا" میں نے کہا "مگر تم سنتھالی کو حقارت کی نگاہ سے ضرور دیکھتے ہو" بولے "حقارت کی تو کوئی بات نہیں ، ہاں یہ فرقہ وحشی ھونے میں مشہور ہے ۔ بالکل غیر شائستہ اور غیر مہذب فرقہ کہلایا جاتا ہے ۔" میں نے کہا "مگر یورپین کے مقابلے میں پٹھان اور سنتھالی دونوں غیر مہذب اور وحشی ھیں" بولے "ھاں وہ ایسا کہتے ھیں کم از کم ۔ لیکن اگر تم سنتھالی ھو تو میں ایسے فرقے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھوں گا جس میں تم جیسے شائستہ لوگ موجود ھیں ۔" میں نے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ میں سنتھالی نہیں ھوں تو شاید آپ کو افسوس ھو کیوں کہ میں اس فرقے کا ھوں جس فرقے کے آپ ھیں" بولے "کیا پٹھان ھو؟" میں نے کہا "ھاں ، کہتے تو ھیں اور میرے نام سے پہلے حافظ کا لفظ بھی ہے جس سے آپ خیال کر سکتے ھیں کہ میں پٹھان یعنی کٹڑ مسلمان اور حافظ یعنی اور بھی کٹڑ مسلمان ھوں ۔ یہ دیکھیے میرا کارڈ ہے ، اس کے آخر میں منشی فاضل ہے جو میرے کٹڑ مسلمان ھونے کو اور بھی خوف ناک کر دیتا ہے ۔ میرا نام محمود ہے جس کے ساتھ "بت شکن" کا لفظ همیشہ سے لگا ہے ، جس نے سنتھالیوں اور آریہ کو مسلمان بھی کیا ہے ۔ کہیے اب تو آپ شبہ نہیں کریں گے کہ میں عیسائی ھوں یا ھو جاؤں گا ۔"

حافظ صاحب کا مزاج ابتدا ہی سے مذہبی تھا ۔ ان کی اسلامی اخوت کے جذبے کو ولایت کے قیام نے زیادہ بالیدگی عطا کی ۔ لندن میں کیپ ٹاؤن کے ایک مسلمان حاجی وولی اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے ۔ ان کے بڑے لڑکے محمد عمر نے ڈاکٹری پاس کی اور وہ لوگ وطن لوٹنے کی تیاریوں میں تھے کہ حاجی صاحب اچانک انتقال کر گئے ۔ پردیس میں مصیبت پڑ گئی ، تجہیز و تکفین کے لیے بھی آخر چند مسلمان ضروری تھے ۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''لندن میں مسلمان تو بہت ہے ہیں اور ہم لوگ اگر جھوٹ بھی کسی جلسے کا نام سنتے ہیں تو دس کام چھوڑ کر وہاں جاتے ہیں لیکن حاجی صاحب کی وفات کے موقع پر باوجود علم ہونے کے بہت کم لوگ گئے ۔ مسٹر عبداللہ المامون سہروردی اپنا تمام کام چھوڑ کر ادھر آدھر مسلمانوں کو کہنے گئے لیکن کوئی نہیں آیا ۔ میرے ہاں بھی اسی غرض سے آئے ۔ یہ ۱۹ ۔ فروری کا ذکر ہے ۔ ۲۰ ۔ فروری کو میں اور مسٹر سہروردی اور خداداد خان تینوں حاجی صاحب کے مکان پر پہنچے ۔ سب نے مل کر ان کو غسل دیا ۔ ۲۱ کو جنازہ کا دن ٹھہرا ۔ میں بھی اس روز گیا ۔ ہندوستانیوں میں سے صرف میں اور خدادادا خان تھے ۔ میں نے نماز جنازہ پڑھائی ۔ کفن کے بارے میں ہمیں مشکلات پیش آئیں ۔ ہم میں کوئی بھی واقف نہیں تھا ۔ ادھر ترکی سفارت خانہ کا امام کہیں باہر تھا ۔ الغرض یہ مشکلات ایک کتاب کے ذریعے حل ہوئیں ۔''

جناب عبداللہ المامون سہروردی نے لندن میں پین اسلامک سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کے مقاصد میں اسلام کے مختلف فرقوں میں یک جہتی پیدا کرنا ، لندن میں مسجد کی تعمیر اور یورپ میں تبلیغ اسلام شامل تھے ۔ اس معاملے میں حافظ صاحب نے بھی ان کا ساتھ دیا ۔ چناں چہ لکھتے ہیں :

''سید امیر علی جج ، سید علی بلگرامی ، شیخ عبدالقادر اور دیگر

بھی خواہان قوم بالخصوص جو کہ علی گڑھ کالج سے ہم دردی رکھتے ہیں ، سہروری صاحب کے خلاف ہیں ۔ صاحبان مسبوق الذکر فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا گورنمنٹ کے خلاف عمل کرنا ہے ، اور بالخصوص انگریزوں میں دعوب اسلام کرنا گورنمنٹ کی نگاہ میں بغاوت کا ثبوت دینا ہے ۔ سہروردی صاحب کہتے ہیں آپ گورنمنٹ سے اتنا ڈرا کریں میں نہیں ڈرتا اور دعوت اسلام سے اور گورنمنٹ سے کیا مناسبت ہے ۔ میں نے اب تک بارہ لوگوں کو مسلمان کر لیا ہے اور انشا اللہ اگر زندگی بہ خیر ہے انھی انگریزوں میں سے اور سینکڑوں کو مسلمان کرتا ہوں'' ۔ میں کہتا ہوں ''سہروردی صاحب شاباش ، میں تمھارے ساتھ ہوں ۔ تم سچے مسلمان ہو ، باقی ہم تو صرف کہنے کے مسلمان ہیں ''۔

تعلیم کے معاملے میں انھیں علی گڑھ تحریک سے کچھ اختلاف تھا ۔ ان کے خیال میں اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس سے مسلمانوں میں زبردست قسم کا احساس کم تری پیدا ہو جاتا ہے ۔ اپنے ایک دوست کے نام خط میں اس معاملے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اگرچہ شخصی طور پر میں سرسید کا مداح ہوں لیکن ان کے کالج سے مجھ کو ہم دردی نہیں ۔ اگرچہ کالج کا تماشائی اس کی لمبی چوڑی عمارت اور مسلمان بچوں کا ایک گروہ کثیر وہاں دیکھ کر خیرہ ہو جاتا ہے لیکن میں اس تعلیم کو 'اینٹی اسلامک موومنٹ'' کے نام سے یاد کروں گا ۔ کیوں کہ وہ کالج مسلمانوں کو اچھا خاصا انگریز بنا دیتا ہے ۔ اور جب یہ انگریز زیادہ پڑھ لکھ جاتا ہے تو وہ اسلامی علما ، حکما اور فلسفیوں کو تو بھول جاتا ہے اور بات بات میں کسی قول کی تائید میں کسی انگریز کو پیش کرے گا ۔ وہ اگر چاہے تو ابن رشد کو اپنے قول کی تائید میں پیش کرسکتا ہے لیکن نہیں ، وہ لارڈ بیکن ۔ ہی کو پیش کرے گا ۔ سعدی وہ بھول جاوے گا اور دوڑ کر شیکسپئر ہی کو لاوے گا ۔ حالاں کہ سعدی شیکسپئر سے ہزار

درجہ اور دس ہزار درجہ بڑھا ہوا ہے ، خواہ قبولیت کے لحاظ سے ، خواہ قابلیت کے لحاظ سے ۔ وہ اگر چاہے تو شہاب الدین مقتول کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن نہیں وہ ڈارون کا حوالہ دے گا ۔''

قیام لندن کے زمانے میں حافظ صاحب زیادہ تر 'مہمان کرایہ دار' کے طور پر رہے ۔ اس معاملے میں وہ کفایت شعاری کا زیادہ خیال کرتے تھے ۔ انھیں اس بات کا بڑا احساس تھا کہ والد سب بھائیوں سے زیادہ ان پر صرف کر رہے ہیں ۔ وہ حتی‌الامکان گھر سے کم سے کم روپیہ منگوانے کی کوشش کرتے ۔ والد ان سے بہت محبت کرتے تھے ۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ سب بھائیوں میں صرف یہی ایک تھے جو حصول تعلیم کا شوق رکھتے تھے ۔ اپنے خطوں میں وہ بیٹوں کی نافرمانی کی شکایت ان سے کرتے اور گھریلو معاملات میں رائے طلب کرتے ۔ جواب میں حافظ صاحب بھائیوں کو سمجھاتے اور والد کو مشورے دیتے ۔ والد کے نام خطوں میں بعض فقرے احترام اور نصیحت کا اچھا امتزاج ہیں ۔ کسی خط میں والد نے بڑی بیگم[1] کی شکایت ان سے کی ہوگی ۔ اس کے جواب میں صرف ایک فقرہ لکھ کر نکل گئے ہیں :

''بڑی والدہ کے باب میں جناب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے ، سب بجا و درست ہے لیکن ''والکاظمین الغیظ و العافین عن الناس'' کے جو لوگ مصداق ہیں ان کے بڑے درجے ہیں اور یہی چشم داشت مجھ کو آں حضرت سے ہے ۔''

ستمبر کے ایک خط میں اپنے بھائی مسعود خاں کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں :

''بھائی میں تو یہی کہوں گا تم جوان ہو ، ہر طرح تمھارے حواس درست ہیں ۔ باوا جان جو کچھ کریں ان کو کرنے دو اور چشم پوشی کرو ۔ صرف ایک ان کی ضعیفی اور آخری وقت پر رحم کرو ۔ وہ تیز مزاج ہمیشہ سے ہیں ۔ تم نے ہمیشہ ان کے

۱۔ حافظ صاحب کے والد کی دو بیویاں تھیں ۔ حافظ صاحب چھوٹی بیگم کے بطن سے تھے ۔

مزاج کو برداشت کیا ہے اور ہمیشہ سلیم الطبع اور ملائم رہے ہو ۔ اب بھی سلیم الطبع رہو ، اسی نرمی سے کام لو ، اب اپنی اس فرشتہ نفسی کو نہ بدلو ۔ وفاداری بہ شرط استواری اصل یمان ہے ۔"

انھی دنوں والد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آپ ان مسافروں میں سے ہیں جو دنیا سے جلد بچھڑنے والے ہیں ۔ یہ دور دور آخر ہے اور یہ بہار آخری بہار ہے ۔ ایسے وقت میں فصول امور میں دل چسپی لینا خلاف حقیقت ہے ۔ اولاد اور ان کی مآل کے غم کو بھول جائیے ۔ یہ طول امل ہے ۔ یہ ان کا کام ہے ، چاہے سنواریں اور چاہے بگاڑیں ۔ آپ کا ان کا تعلق مجاز ہے نہ حقیقت ۔ مجاز کو چھوڑیے حقیقت لیجیے ۔ بہت سے غیر ضروری اسباب ہیں جو حقیقت سے زیادہ آپ کو رنج پہنچا رہے ہیں اور فی الحقیقت وہ غیر ضروری ہیں :

حرص مانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

میں اسباب معاش میں انسانی اندرونی جذبات کو بھی شامل کرتا ہوں ۔ یہ کتاب زندگی جو آپ کے سامنے ہے ، بہت جلد ختم ہونے والی ہے ۔ برائے خدا جو کچھ باقی ہے اس کے مطالعے کی داد دیجیے ، اس کو اس طرح پڑھیے جس سے آپ کے مزاج کو آزردگی حاصل نہ ہو بلکہ خوشی ۔ یہ آخری بہار ہے ، اس بہار میں آپ سے جو پھول چنے جاویں چن لیجیے ۔ اگلی بہار میں خدا جانے آپ کہاں ہوں ۔ میری یہ امید کہ اولاد اس قابل ہو کہ آپ کو عیش دکھائے ، گو میری دعا ہے کہ خدا اس کو پورا کرے ، لیکن امر موہوم ہے ۔ بہ ظاہر یہ خوش نصیب زمانہ ہماری قسمتوں میں نہیں کہ ہم آپ کو عیش دکھاویں لیکن میں نا امید نہیں ہوں ۔ خدا آپ کو صد و سی سال کی عمر عطا کرے ۔ وہ دن آوے گا ہم پھولیں گے ، پھلینگے اور ہمارے لیے آپ نے جو جو خوشیاں قربا

کی ہیں ان کا شکریہ کریں گے ۔ ہم ہمیشہ اسی طرح نا سمجھ
اور طفلانہ مزاج نہیں ہوں گے ۔ ایک دن آوے گا کہ ہم آپ کی
قدر کریں گے ۔ خدا وہ دن کرے کہ آپ اس وقت تک ہمارے
سروں پر قائم ہوں ۔ ہم اس وقت اگرچہ کہنے کو جوان ہیں
لیکن فی الحقیقت نادان ہیں ۔ خدا آپ کو جملہ آفات سے محفوظ
رکھے اور جملہ امراض سے تندرستی بخشے ۔''

اکتوبر میں ان کو ولایت گئے پورا سال ہوگیا ۔ اس میں سے چار
ماہ وہ بیمار رہے ۔ باقی آٹھ مہینوں میں انھوں نے خوب محنت کرکے
ایک طرف تو اپنی انگریزی زبان کی کمی کو کافی حد تک پورا کیا ،
دوسرے رومن لاء بھی تیار کر لیا ۔ لیکن ابھی وہ اپنی انگریزی
طرز تحریر سے مطمئن نہ تھے ، اس لیے اس سال وہ امتحان میں نہ بیٹھے ۔
ارادہ یہ تھا کہ آیندہ سال تحریر پختہ ہونے پر دونوں امتحان اکٹھے
ہی دے دیں گے ۔ چناں‌چہ وسط اکتوبر میں کالج کھلنے پر کریمنل لاء
کے لکچر سننے لگے ۔ ادھر انھی دنوں ان کے والد بیمار ہوگئے ۔ وہ
دمے کے نو پرانے مریض تھے ، عرق النسا کی بھی شکایت ہوگئی ۔ اس
خبر سے حافظ صاحب کو بڑی پریشانی ہوئی ۔ وہ جانتے تھے کہ میری
تعلیم کا سلسلہ باپ کے دم تک ہے ، پھر بھائیوں میں کوئی اس لائق
نہیں کہ پردیس میں میرے اخراجات کا کفیل ہو ۔ چناں چہ والد کو
لکھتے ہیں :

''آں حضرت کی موجودہ بیماری سے میں سخت متوحش ہوں ۔ میرا
حوصلہ پریشان اور خیالات پست ہوتے ہیں ۔ خدا جانے تقدیر میں
کیا ہے ۔ خدا جانے میں اپنے مقاصد میں کام یاب ہوؤں یا نہیں ۔
آپ کے ضعف کا زمانہ ، ایک چھوڑ دو دو تین تین بیماریاں موجود ،
گھر کی طرف سے علیحدہ پریشانی ۔ یہ چیزیں مجھ کو مایوس کر
رہی ہیں ۔ غیب کا علم عالم الغیب جانتا ہے ۔ تقدیر کے لکھے سے
کون واقف ہے ۔ اللہ پاک آپ کو صحت کامل و شفائے عاجل
عطا فرماوے اور تمام آفات سے امن میں رکھے ۔''

ان کی بیماری نے کافی طول کھینچا لیکن آخر حالت سنبھل گئی اور حافظ صاحب کو ایک گونا اطمینان ھوا - انھوں نے اپریل ۱۹۰۶ کے امتحان میں شریک ھونے کا فیصلہ کیا - اپنی طرف سے تیاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی - وہ زیادہ تر لاطینی اصطلاحات سے ڈرتے تھے جن کی قانون کی کتابوں خصوصاً رومن لاء میں بھر مار تھی - علاوہ ازیں وہ تحریری امتحان کے مقابلے میں تقریری امتحان سے خائف تھے - غرض وہ ھمت کر کے امتحان میں بیٹھے اور کام یاب رھے - امتحان سے فارغ ھوتے ھی نتیجے کا انتظار کیے بغیر انھوں نے آیندہ امتحان کی تیاری شروع کر دی - امتحان میں کام یابی سے انھیں اپنے اوپر اعتماد ھو چلا تھا -

قیام لندن کے اس عرصے میں انھوں نے کچھ نظمیں اور مضامین بھی سپرد قلم کیے - ان میں سے بعض چیزیں شیخ عبدالقادر کے توسط سے مخزن میں شائع ھوئیں - جنوری ۱۹۰۵ء کے شمارے میں ایک نظم ''گلستان'' شائع ھوئی - یہ انگریزی نظموں کے انداز میں ھے - مارچ کے پرچے میں ان کی پرانی لکھی ھوئی نظم ''ٹیپو سلطان'' چھپی جس پر انھوں نے نظرثانی کی تھی - اس کے متعلق والد کو لکھتے ھیں :

> ''مخزن میں اس مرتبہ میری نظم ''ٹیپو سطان'' شائع ھوئی ھے - شاید جناب کی نگاہ سے گزری ھو - میں نے ایک مرتبہ جب یہ نظم لکھی تھی ، جناب کو سنائی تھی لیکن اب وہ پہلی نظم سے زیادہ دل چسپ اور مختلف ھے -''

اگست کے پرچے میں مسز ھیمنز کی ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ ''موت کا وقت'' کے عنوان سے شائع ھوا - مضمون ''وکٹوریہ البرٹ میوزیم'' انھوں نے اکتوبر میں روانہ کر دیا تھا ، اگرچہ شائع تاخیر سے ھوا - بعض غزلیات و منظومات جو ۱۹۱۹ - ۲۰ء میں مخزن اور اس کے بعد کے زمانے میں بعض اور رسائل میں چھپیں ، اکثر اسی دور میں لکھی گئیں - انھی دنوں انھوں نے ایک قومی نظم کی ابتدا کی جو مکمل نہ ھوسکی - یہ نظم مسدس کی صورت میں تھی اور مسدس حالی کی بحر میں لکھی جانے والی تھی - مجھے اس کے صرف دو بند جو مختلف

حصوں سے تعلق رکھتے ھیں ، ان کے جنوری ۱۹۰۶ء کے ایک خط سے دست یاب ہوئے ھیں :

ھوا سب دازوئے شمشیر رانی
اڑی رونق چہرۂ ارغوانی
دشدد میں ھے گردش آسمانی
سلف کی ترقی ھوئی اک کہانی
نہ وہ بزم باقی نہ وہ یار باقی
مگر واں کے باسی ھیں ھار باقی

وہ یورپ میں ترکوں کا جو خانداں ھے
مسلمانوں کی شان و شوکت وھاں ھے
عجب اس کی قدرت عجب اس کی شان ھے
صلیبوں کے اندر ھلالی نشاں ھے
ابوی گونجتی ھے ایا صوفیہ بھر
موذن کی آواز اللہ اکبر

لیکن سب سے دل چسپ بات یہ ھے کہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں انھوں نے شاہ ایڈورڈ ھفتم کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس کی ابتدا بھی کر دی ، گو یہ بھی مکمل نہ ھوا ۔ اس سے ان کا کیا مقصد تھا انھی کے الفاظ میں سنیے :

''اس تکلیف بے جا سے مجھ کو کوئی معتدبہ امید نہیں بہ جز اس کے کہ یہاں کے چند اخبارات اس کے متعلق رائے زنی کریں اور ایک خط بادشاہ سلامت کا میرے نام پہنچے ۔ بہر حال یہاں یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن ھندوستان کی نگاہ میں یہ بہت بڑی چیز ھوگی ۔ اور کچھ نہیں تو ھندوستان میں چرچا ضرور ھو جاوے گا ۔''

ان کا خیال اس قصیدے کو مع انگریزی ترجمہ بادشاہ کی خدمت میں بھیجنے کا تھا ۔ اس کے انداز کے متعلق لکھتے ھیں :

''اس قصیدے میں کئی نئی باتیں ھوں گی ۔ اول تو یہ کہ تمہید

تمام قصیدہ گویوں سے جدا ہوگی اور علیٰ ہذا خیالات جدا . . .
. . . . . . ہمارے فارسی شاعروں کی جس قدر تمہیدیں ہیں وہ
مشرقی مذاق کی ہیں ، مغربی لوگ اس سے کوئی دل چسپی نہیں لے
سکتے۔ عشقیہ تمہیدیں ایسی ہوسکتی ہیں کہ یورپ اور ایشیا
دونوں اس کو پسند کریں لیکن اس میدان میں میری رسائی
نہیں اور نہ زور طبیعت دکھا سکتا ہوں ، اس لیے کسی اور زمین
کی تلاش ہوئی اور آخر بہ دقت تمام مل گئی - اب زمین مل گئی ہے
خیال آفرینی بھی ہو جائے گی ۔ یہ تشبیب زیادہ تر انگریزی مذاق
سے ملتی جلتی ہوگی لیکن خیالات مشرقی ہوں گے ۔"

بڑی مشکل یہ تھی کہ انگریزی نام جن کا قصیدے میں آنا
ناگزیر تھا ، کسی شگفتہ بحر میں نہ آ سکتے تھے ۔ آخر انہوں نے عرفی
کے مشہور قصیدے :

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم
گدا کلاہ نہد کج بہاد و شہ دیہیم

والی زمین اختیار کی ۔ ان کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ یہ قصیدہ
مکمل کرکے جون ۱۹۰۶ء میں بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر پیش کر
دیا جائے ۔ نمونے کے اشعار میں یہاں درج کرتا ہوں :

بشر ہے لوح مری میرا شیوہ ہے تسلیم
ازل نے کی ہے مجھے رسم بندگی تعلیم
بتوں کے آگے مرا سر جھکا ہے صدیوں تک
گواہ جس کی ہے تاریخ سال ہائے قدیم
تمیز صانع و مصنوع سے نہ تھا واقف
میں فلسفی نہ تھا مشکل تھی اس قدر تفہیم
ابھی ہوئے تھے نہ یزدان و اہرمن پیدا
عدم میں محو تھا افسانۂ بہشت و جحیم
جہاں میں چار سو سکہ تھا دین آذر کا
خلیل بن کے نہ آیا تھا اب تک ابراہیم

بہت زمانہ تھا درکار اس کو جب ہوتا
ظہور واقعۂ طور و داستان کلیم

یہ کل کی بات ہے تثلیث کہیے یا توحید
مرے زمانے میں ان کی ہوئی نہ تھی تقسیم

۱۹۰۶ء کی تعطیلات میں بھی ان کا ارادہ وطن آنے کا نہ تھا لیکن جس بات کا اندیشہ تھا وہی ہوئی، یعنی ۲۹- جولائی کو ان کے والد کو اختلاج قلب کا دورہ پڑا اور وہ آناً فاناً ختم ہو گئے - حافظ صاحب کو بذریعۂ تار اطلاع موصول ہوئی - حادثہ اتنا اچانک تھا کہ وہ فوراً عازم وطن ہوئے -

ابّا صاحب (وہ پورے خاندان میں اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں) کی آنکھ بند ہوتے ہی تمام کارخانہ درھم برھم ہو گیا - دو بیویوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے بیٹے پہلے ہی ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے بلکہ والد کی زندگی ہی میں خود سری کے آثار ان میں نمایاں ہو گئے تھے - دونوں بیویاں الگ الگ حویلیوں میں رہتی تھیں - بڑی بیگم سے وہ کچھ نالاں رہا کرتے تھے - چناں چہ حافظ صاحب کی غیر موجودگی کی وجہ سے ان کے معتمد مسعود خاں تھے جو ان سے دو سال چھوٹے تھے - تمام حساب کتاب اور نقد و جنس ان کے علم میں تھا - باپ کے فوت ہوتے ہی انھوں نے نقدی کے توڑے اپنے آدمیوں کے ذریعے نکلوا کر مختلف لوگوں کے پاس بطور امانت رکھوا دیے - لیکن اس معاملے کی فریق ثانی کو بھی اطلاع ہو گئی - نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی باپ کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ بیٹوں میں مقدمہ بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا - یہ صورت حال تھی جو حافظ صاحب گھر پہنچے - کچھ تو مال و منال کے معاملے میں وہ طبعاً درویش منش واقع ہوئے تھے، کچھ علمی ذوق و شوق کی وجہ سے ان جھگڑوں سے دور بھاگتے تھے - انھوں نے فریقین کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن معاملہ سمجھانے کی حد سے آگے نکل چکا تھا - ابھی انھیں گھر پہنچے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن محکمہ شرع شریف کے ناظم پیادے

لے کر نئی حویلی کے کمروں کو مہر و موم کرنے آ گئے ۔ یہ حالت دیکھ کر انھوں نے اپنی سائیکل ، جو وہ ساتھ لے کر آئے تھے، سنبھالی اور سادات قافلہ کے ہاں چلے گئے۔ سادات میں بزرگوں کے علاوہ ان کے عزیز دوست سید حسن مجتبیٰ بھی تھے ۔ یہ چند ماہ کا عرصہ جو انھوں نے ٹونک میں گزارا ، سادات ھی کے ہاں رہے ۔ کبھی کبھی والدہ سے ملنے گھر آ نکلتے۔

آخر انھوں نے واپس لندن جانے کا ارادہ کیا ۔ واپسی کا ٹکٹ وہ لے کر آئے تھے ۔ آٹھ ٹرمیں انھوں نے پوری کر لیں تھیں ، اب صرف چار باقی تھیں ۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر مسعود خاں کچھ روپیہ میرے حصے میں سے دے دیں تو میں اس کام کو اختتام تک پہنچا دوں ۔ لیکن مسعود خاں کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے ۔ انھوں نے یہ معاملہ زیر بحث آنے پر بڑے بھائی کو خوب سبز باغ دکھائے اور کہا کہ آپ بلا تردد ولایت تشریف لے جائیے، آپ کے اخراجات کے لیے رقم باقاعدگی سے پہنچتی رہے گی ۔ حافظ صاحب اس بات سے مطمئن ہو گئے ۔ ان کو جائیداد کا لالچ بالکل نہ تھا ، ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح اپنی تعلیم مکمل کر لیں ۔

انھیں اپنے سب سے چھوٹے بھائی مشہود خاں سے ، جن کی عمر والد کی وفات پر صرف سات سال تھی ، بڑی محبت تھی ۔ اسی محبت کی بنا پر اس کا مستقبل بھی عزیز تھا ۔ چناں چہ جانے سے قبل والدہ سے مشہود خاں کو ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی اور کہا کہ یہ یہاں ان لوگوں کی صحبت میں خراب ہوگا اور تعلیم حاصل نہ کر سکے گا ۔ از راہ تمنن یہ بھی کہا کہ میں آپ کا فرزند اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں اور اپنا آپ کے پاس چھوڑے جاتا ہوں ۔ غرض والدہ سے اجازت لے کر وہ بھائی کو بھی ساتھ لے گئے ۔ مسعود خاں بھائیوں کو بمبئی تک چھوڑنے گئے اور جہاز میں سوار کرا کے واپس آئے۔ یہ دسمبر کے آخر میں لندن پہنچے ۔ جون ۱۹۰۵ء سے شمالی کنزنگٹن میں اٹھارہ سنکلیر روڈ پر رہتے تھے اور ستمبر ۱۹۰۷ء تک وہیں رہے ۔

ہندوستان جانے سے ان کی اکتوبر ۱۹۰۶ء کی ٹرم ضائع ہو گئی تھی۔ آخر وہ مارچ ۱۹۰۷ء کی ٹرم میں شریک ہوئے۔ اس طرح گویا انھیں کم از کم مارچ ۱۹۰۸ء تک وہاں ٹھہرنا تھا۔ دوبارہ لندن پہنچنے پر انھوں نے کانسٹیٹیوشنل لا اور لیگل ہسٹری کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب رہے۔ وہاں جا کر جلد ہی مسعود خاں کے رویے پر ان کا ماتھا ٹھنکا جب کہ اخراجات کے لیے ۶۵ پونڈ کی پہلی قسط انھیں مئی سے پہلے نہ مل سکی۔ چناں چہ ۱۲- اپریل ۱۹۰۷ء کے خط میں اپنے دوست سید حسن کو لکھتے ہیں :

''حسن! تم یہ یاد رکھو کہ میں یہاں خوش نہیں ہوں۔ مشہود کو لے آیا ہوں ، یہ ایک اور غلطی کی۔ میرا آنا ہی پہلی غلطی تھی . . . . . نہیں سمجھتا کہ کیا کروں۔ دونوں ساحل مجھ سے دور ہیں - کبھی سوچتا ہوں کہ واپس لوٹ جاؤں اور کبھی شرم آتی ہے اور سوچتا ہوں کہ اس قدر کیا ہے ، آگے بڑھا چلا جاؤں۔ لیکن میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے جن کو میرے خیال اور میرے مذاق سے ذرہ بھر بھی آشنائی نہیں۔ والد مرحوم کو میرے مذاق سے کچھ مذاق تھا لیکن ان کے مٹنے پر وہ بھی مٹ گیا۔

کس زبان مرا نمی فہمد　　　بعزیزاں چہ التماس کنم

میں خالی خولی سبز باغوں میں یہاں چلا آیا اور شاید وہ دن نہایت قریب ہے جب کہ میں اس بلندی سے گروں۔ میں اگرچہ حالات نہایت ہی بدمزہ اور واقعات ناسازگار ہیں ، تاہم کوشش میں ہوں کہ اگلے امتحان کے لیے تیاری کروں۔''

لیکن ابھی وہ بھائی کی طرف سے پوری طرح نا امید نہیں تھے اور اسی امید و بیم کی حالت میں ۱۹۰۷ء کے آخر تک رہے۔ اس کے باوجود علم حاصل کرنے کے لیے ان کے ارادے بلند تھے۔ اس علم سے ان کی مراد صرف قانون کے امتحان پاس کرنا نہیں تھی بلکہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

"مجھ کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے اور بہت کچھ پڑھنا ہے لیکن جلد ان امتحانات سے فراغت ملے۔"

سہروردی صاحب کے ولایت سے واپس آ جانے کی وجہ سے انھیں پین اسلامک سوسائٹی کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑی۔ اس کے متعلق حسن میاں کو لکھتے ہیں:

"میں اس وقت پین اسلامک سوسائٹی کا جائنٹ سیکریٹری ہوں لیکن کچھ ہی عرصے میں سیکریٹری بن جاؤں گا۔ اس وقت میرا ارادہ ہے کہ اس کی اشاعت میں از سر نو کوشش کی جائے اور لیکچروں کا سلسلہ باقاعدہ جاری کیا جائے۔ اس میں میں بھی ذاتی طور پر عملاً حصہ لوں گا۔ اس سوسائٹی کے مقاصد آپ کو اگر معلوم نہ ہوں تو یہ ہیں:

۱۔ عالم اسلام کی تمدنی اور اخلاق اور علمی اصلاح۔ مسلمانوں کے لیے ایک مرکزی طاقت کا قیام۔ ان میں "کل مومن اخوۃ" کا عمل۔

۲۔ غیر مسلم اقوام سے اسلام کی بابت غلط فہمی کا رفع کرنا۔ در پردہ اس میں داخل ہے اشاعت اسلام۔ الغرض اور بھی اسی قسم کی اغراض ہیں جن سے صرف مفاد اسلامی مقصود ہے۔

اس سوسائٹی کی بہت سی شاخیں مختلف اسلامی مرکزوں میں قائم ہوگئی ہیں؛ مثلاً مصر، شام، عرب، مراکو، ٹیونس، الجیریا، ٹریپولی، ایران، مقامات وسط ایشیا، قسطنطنیہ، سر اندیپ، برما اور ہندوستان کے بعض مقامات مثلاً کلکتہ، اودھ وغیرہ۔"

اس سوسائٹی کے مقاصد کے حصول میں عبداللہ کوئیلم صاحب سے کافی مدد ملی۔ مسعود خاں سے ان کا تعارف کراتے ہوئے ۲۵۔ جولائی کے خط میں لکھتے ہیں:

"شیخ الاسلام عبداللہ کوئیلم گزشتہ جمعہ کو میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بیٹے عبداللہ کوئیلم بھی تھے۔ مشہود خاں کوئیلم صاحب کی گود میں بیٹھے رہے اور باتیں

ہوتی رہیں ۔ شیخ عبداللہ کوئیلم فاضل اجل ہیں ۔ عربی بہت کم جانتے ہیں ، ویسے نہایت لائق اور عمدہ تقریر کرنے والے آدمی ہیں ۔ آئندہ ستمبر میں ہم ان کو اپنی سوسائٹی میں تقریر کرنے کے لیے بلاویں گے ۔ انگریزوں میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا ۔ اس کے بعد انھوں نے تبلیغ اسلام اپنا طریقہ اختیار کیا اور اب تک دو سو سے زیادہ مسلمان ہو چکے ہیں ۔ سلطان عبدالحمید خاں غازی نے ان کو شیخ الاسلام ، آفندی اور بے وغیرہ کے خطابات دیے ہیں . . . . . اسلام پر کئی کتابیں انھوں نے تصنیف کی ہیں ۔ ایک اخبار ہفتہ وار اور ایک رسالہ ماہوار اسلامی مضامین پر نکالتے ہیں ۔ اللہ ان کو سلامت رکھے ۔''

۱۹۰۷ء میں مسعود خاں کے نام انھوں نے جو خط لکھے ہیں ان میں زیادہ تر خاندانی مقدمہ بازی کے متعلق استفسارات اور مشورے دو چھوٹے بھائیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی نصیحتیں ، خود مسعود خاں کو کوئی ملازمت تلاش کرنے کی بجائے کاروبار کی طرف متوجہ ہونے کے مشورے اور والدہ کی تسلی کے لیے مشہود خاں کے مفصل حالات شامل ہیں ۔ ایک خط میں مودود خاں کو حصول تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے لکھتے ہیں :

''مودود تم یہ یاد رکھو کہ میں غریب آدمی کی صحبت سے نہیں گھبراتا ، کیوں کہ غریبی میں کوئی عیب نہیں لیکن جہالت عیب ہے ۔ اس عیب کو تم دور کرو ۔ تمھارا بچپن گزر گیا ، وہ جب گزرا گزرا لیکن جوانی اس طرح نہ گزارو ، اس میں تو کچھ سیکھ لو ۔ میں خود غریب آدمی ہوں اور غریب ہی رہوں گا ، لیکن میری یہی آرزو ہے کہ علم میں نام پیدا کروں ۔ والد مرحوم کی یہی آرزو تھی ۔ تم بھی ان کی یہ آرزو پوری کرنے میں سعادت مند بیٹوں کی طرح کام کرو ۔''

مسعود خاں کسی رئیس کی مصاحبت اختیار کرنا چاہتے تھے ۔ اس سلسلے میں ان سے بھی مشورہ کیا ۔ اس کے جواب میں انھوں نے ایک خط میں مصاحبت کی خرابیاں تفصیل سے گنوائی ہیں ۔ آخر میں کہتے ہیں

"اگر میرے دل کی بات پوچھو تو میں تم سے سچ کہتا ہوں
کہ اگر تم کہیں دس روپے کی حلال ملازمت میں لگو
تو میرے نزدیک ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اس مصاحبی
کے جس میں تم چار سو پانچ سو ماہوار کما سکتے ہو۔ اسلام
کی نگاہ میں مصاحبت پیشگی حرام ہے۔ بس یہ تمہارے لیے کافی
ہے۔ مجھ کو امیری پسند نہیں ہے۔ اسلام غریب ہے اور غریبی
ہی ہمارا فخر ہے۔ ہماری خوبی یہی ہے کہ ہم میں جوہر اخلاق
ہو اور جوہر علم۔ اس کے علاوہ اگر ہم سے ہو سکے
تو بنی نوع انسان کی خدمت کریں۔ اگر میں اور تم ان
تین فرائض میں سے ایک بھی ادا کر سکے تو یہ سمجھ لو
کہ ہم نے اپنی زندگی کا جواز دے دیا ہے جس کے لیے
خدا نے ہمیں پیدا کیا تھا۔"

۲۵۔ اکتوبر کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

"مسعود میں ہر مرتبہ تم کو لکھتا رہا ہوں کہ تاوقتیکہ تمام
طرف سے تم اپنے خیال کو سمیٹ کر ایک طرف نہ جمو گے
کام نہیں چلے گا۔ تم اور تمام خیالات کو دور کرو،
صرف تجارت کر لو اور اسی میں خدا تم کو کامیابی دے گا۔
میں علم کا جویا ہوں اور تم کو خوش حالی کی ضرورت ہے،
خدا ہمیں دونوں کو کامیاب کرے۔"

مئی کے ۶۵ پونڈ کے بعد مسعود خان نے اگست میں ۵۰
پونڈ اور بھیجے۔ وقفوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی رقم بھیجنے سے
ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس پر احتجاج کریں گے اور یہ بہانہ
اس سلسلے کو بند کرنے کے لیے نہایت معقول ہو گا۔ لیکن حافظ
صاحب نے اس معاملے کے متعلق شکایتاً ایک لفظ بھی تحریر نہیں کیا۔
اگست کے بعد پھر انہوں نے چپ سادھ لی۔ ان دونوں بھائیوں
کا اوسط خرچ سولہ سترہ پونڈ ماہوار تھا۔ چنانچہ دسمبر تک وہ
کوئی ستر پونڈ کے مقروض ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے بھائی کو
کچھ رقم روانہ کرنے کے لیے لکھا۔ جواب میں مسعود خان نے

لکھ دیا کہ والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ یہ پیسے آخر کب تک بھیجے جاتے رہیں گے - نیز یہ کہ تم ۱۹۰۴ء میں گئے تھے ، اب تک تم نے کیا کیا ہے - اس روکھے اور احمقانہ جواب پر انھیں رنج بھی ہوا اور غصہ بھی آیا - اس موقع پر انھوں نے ایک درد بھرا خط بھائی کو لکھا - ۳- جنوری ۱۹۰۸ء کے اسی خط کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں :

''تمھاری، شکایتوں کے جواب کیا دوں - تم لوگ اگر سوچو تو ان کا خود ہی جواب پیدا کر سکتے ہو - اگر نہ سوچو اور سمجھو تو میرے جوابات بھی تم کو تشفی نہیں دے سکیں گے . . . . . تم کو اگر غیروں نے فرضاً تکلیفیں دی ہیں تو ان کی اس میں غرض تھی یا فائدہ تھا لیکن تم نے مجھ کو جو پریشانیاں دی ہیں اس کا کیا جواب ہے . . . . جب میں ہندوستان میں تھا تو تم اس قدر فیاض بن گئے کہ میرے اخراجات کا بوجھ خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا اور اس کے بعد جس طرح تم نے اپنا وعدہ نبھایا وہ خدا ہی جانتا ہے - تم پر جو بلائیں آئیں وہ تمھارے نامہربان بھائیوں کے طفیل لیکن مری مصیبتیں میرے مہربان بھائیوں کی وجہ سے ہیں - بہر حال میری وہی کیفیت ہے ''مردہ بدست زندہ'' - جب تمھارا جی چاہے مجھ کو خرچ بھیج دو اور پھر لطف یہ کہ احسان کا احسان شکایت کی شکایت . . . . تمھیں اگر باپ کے کفن کی شرم ہوتی ، تمھیں اگر بھائی کا درد ہوتا تو تم سمجھتے کہ آخر میں جو رلا رلا کر خرچ بھیج رہا ہوں تو وہ کمبخت لندن میں کس طرح گزارا کر رہا ہو گا - وہ اکیلا ہی نہیں ہے ، اس کے ساتھ ایک اور تحفۂ علت بھی ہے - آخر کار اس پر کچھ نہ کچھ خرچ آتا ہے - تمھاری اس دیدہ دلیری کا کیا علاج کہ میں جو تم کو لکھوں اس کو جھوٹ مانو ، بیہودہ سمجھو اور پھر کہے جاؤ کہ اس قدر خرچ ہو گیا - آپ کو اپنی سعادت مندی

اور ب‍وا کی تابعداری کا خیال میرے ھی معاملے میں آتا
ھے ۔ والد کے انتقال کے بعد اب تک آپ نے جو فیاضی میرے
ساتھ کی ھے وہ میرے حق سے زیادہ نہیں کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تمھارا صرف ایک اصول ھے کہ روپیہ کمایا جائے لیکن کس
طرح اور کیوں کر ؟ اس سے بحث نہیں ۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا
ہوں کہ اس کے لیے بھی لیاقت ذاتی اور لیاقت علم درکار ھے ۔
تمھیں اگر علم اور لیاقت سے نفرت ھے تو ھو لیکن دوسرے
جو اس کی طرف متوجہ ھیں ان کو کیوں روکتے ھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تمھیں اگر مسعود کی تعلیم میں دلچسپی نہیں تو مجھے تو ھے ۔
ٹونک میں رہ کر وہ بھی تباہ ھوتا ۔ اس کے واسطے تمھیں
اور بوا کو دو پونڈ ماھوار بھی گراں گزرتے ھیں ، اگرچہ
یہ لندن ھی کا خرچ کیوں نہ ھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس وقت تک ستر پونڈ کا قرض‌دار ھوں ۔ اس
کے علاوہ تین ماہ اور مجھ کو اپنے امتحان میں لگیں گے ۔
ان تین مہینوں کا خرچ ۴۸ پونڈ ھو گا ۔ علاوہ ازیں ۶۰ پونڈ
مجھ کو بیرسٹری کی ڈگری ملنے پر ادا کرنے ھوں گے ۔
الغرض کا ہم بیرسٹر ھونے تک مجھ کو ۱۷۸ پونڈ پہنچنا چاھییں ۔
یاد رکھو ۱۷۸ پونڈ ۔ اس رقم سے گریز نہیں ، خواہ میں رؤوں اور
خواہ تم ۔ یہ رقمیں ضروری ھیں ، تمھیں بھیجنا ھوں گی اور اگر
نہیں بھیجو تو ھمیں اپنی تدبیروں پر چھوڑ دو ۔"

یہ ان کا آخری خط تھا ، کیوں کہ مسعود خاں نے اس کا جواب دینے
کی ضرورت نہیں سمجھی ۔

گھر کی طرف سے مایوس ھو کر وہ تفکرات میں گھر گئے ۔ ایک
طرف قرضے کی تشویش ، دوسری جانب مزید خرچ کی ضرورت ۔ ایسے
میں تعلیم کسے یاد رھتی ۔ کچھ عرصہ لینڈ لیڈی کی مہربانی سے گزر
اوقات ھوئی ، آخر ایک دن پریشان ھو کر گھر سے نکلے اور بلا مقصد
شہر گردی کرنے لگے ۔ ایک کباڑیے کی دوکان پر کھڑے ھو کر
پرانی کتابوں پر نظر ڈالنا شروع کی ۔ اچانک انھیں کوئی قیمتی کتاب

خستہ حالت میں دکھائی دی ۔ قیمت دریافت کی تو نہایت معمولی ۔ اتفاق سے جیب میں اتنے ھی دام تھے ؛ کتاب لے کر پرانی چیزوں کا کاروبار کرنے والی مشہور فرم لوزک اینڈ کمپنی کے ھاں پہنچے ۔ انھوں نے بڑی خوشی سے وہ کتاب کئی پونڈ میں خرید لی ۔ یہ واقعہ لوزک اینڈ کمپنی والوں سے ان کے تعارف کا سبب ھوا ۔ یہ فرم ۴۶ ۔ گریٹ رسل سٹریٹ پر برٹش میوزیم کے بالمقابل واقع تھی اور آج بھی وھیں موجود ھے ۔

اب وہ پرانی کتابوں پر نظر رکھنے لگے اور ساتھ ساتھ ترجمہ کرنے اور طلبا کو پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کیا ۔ زیادہ تر پروفیسر آرنلڈ ترجمہ کرنے کے لیے مواد مہیا کرتے ۔ علاوہ ازیں انھیں ایک لائبریری کی فہرست کتب تیار کرنے کا کام بھی مل گیا ۔ اس طرح ان کا گزارا بہ خوبی ھونے لگا اور انھوں نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں اسلامی تاریخ پر تحقیق شروع کی ۔ یہ اس قسم کا علم تھا جس کے حصول کی آرزو انھیں مدت سے تھی ۔ انھی دنوں انھوں نے پین اسلامک سوسائٹی کے لیے ایک لائبریری کی بنیاد رکھی اور چھ سال کی لگاتار کوشش سے دو ہزار کم یاب اور نایاب کتابیں جمع کیں ۔ اس لائبریری کا مختصر حال ''لندن لائبریریز ۱۰، ۱۹۰۹ء'' میں درج ھے ۔

۱۰، ۱۹۰۹ء میں وہ لندن یونیورسٹی کے ایک فارسی کے امتحان میں اول آئے اور اس بنیاد پر انھیں ''آوزلے اسکالر شپ'' دیا گیا جس سے انھوں نے پروفیسر ٹی ۔ ڈبلیو آرنلڈ کی براہ راست رھنمائی میں ایک سال تک عربی زبان کا مطالعہ کیا ۔ اس وقت تک لوزک اینڈ کمپنی والے عتیقیات کے کاروبار میں ان کی افادیت کے قائل ھوچکے تھے ۔ چناں چہ انھوں نے انھیں معقول مشاھرے پر ملازم رکھ لیا ۔ ۱۱، ۱۹۱۰ء میں انھوں نے ڈاکٹر ھنری اسٹب کی کتاب ''طلوع و عروج اسلام'' گم نامی کے پردوں سے نکال کر مرتب کی اور اس میں ایک ضمیمہ شامل کرکے لوزک اینڈ کمپنی کے ذریعے شائع کی ۔ اس کی اشاعت میں بہت سے مسلمانوں ، اسلام سے دل چسپی رکھنے والے لوگوں اور اداروں نے مالی

معاونت کی ۔ ایسے اکتالیس ناموں کی ایک فہرست کتاب کی ابتدا میں دی گئی ہے ۔ ان میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی ، مشیر حسین قدوائی ، سید امیر علی اور پروفیسر آرنلڈ کے نام بھی شامل ہیں ۔ یہ کتاب جو ڈھائی سو سال تک مسودے کی شکل میں رہنے کے بعد حافظ صاحب کی مساعی سے طبع ہوئی ، اسلام سے متعلق عیسائی فضلاء کی کتابوں میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے ۔ اس کے دیباچے میں حافظ صاحب لکھتے ہیں :

''یہ کتاب ہمیں اسلام کے متعلق پرانے نظریات سے واقف ہونے کا بڑا نادر موقع مہیا کرتی ہے ۔ گو ان تصورات کی دھجیاں اڑ چکی ہیں ، تاہم آج بھی مغربی تصانیف پر ان کا گہرا اثر موجود ہے ۔ اسی غرض سے کتاب میں ایک ضمیمے کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے امید ہے موضوع پر مزید روشنی پڑے گی ۔ اگر اس تصنیف کے منظر عام پر آنے سے انگریزی زبان میں مطالعۂ اسلام کے فروغ کے لیے سرگرمی کی اشد ضرورت مسلمانوں کے ذہن نشین ہوگئی تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی ۔ اس موضوع سے لا پرواہی کے نتیجے میں وہ جس افسوس ناک رسوائی کا شکار ہوئے ہیں ، اس کے بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں ۔ ہمیں یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مغرب سے بہت سی چیزیں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اسلام کا حقیقی منشا اور اس کے عقائد بھی اسے سکھانے ہیں ۔ ایسے لوگ بیسویں صدی میں بھی موجود ہیں جو انتہائی متانت کے ساتھ انکشاف کرتے ہیں کہ مسلمان محمد نامی ایک پرست کے پرستار ہیں ․․․․․․․ '' ۔

در اصل اس کتاب کی اشاعت پین اسلامک سوسائٹی والے سلسلے ہی کی ایک کڑی تھی ۔ اس کا ایک اور پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حافظ صاحب کا واحد کام ہے جو انگریزی میں انجام دیا گیا ۔

اسی طرح ۱۹۱۳ء کی ابتدا تک وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ لندن کے گراں قدر کتب خانوں سے استفادہ کرتے رہے ۔ اس عرصے میں ان کے

پاس کافی روپیہ بھی جمع ہوگیا ۔ اس وقت اگر وہ چاہتے تو اپنی قانون کی تعلیم مکمل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے دوبارہ اس طرف توجہ نہ کی ۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ طبعی طور پر اسے پسند نہ کرتے تھے اور صرف والد کے حکم کی تعمیل میں اس میں داخل ہوئے تھے ، اور اب تو انھیں علمی جستجو کا چسکا بھی پڑ چکا تھا ۔ چناں چہ کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ خدا نے عین وقت پر بچا لیا ۔

۱۹۱۲ء میں لوزک اینڈ کمپنی نے یہ پروگرام بنایا کہ حافظ صاحب ان کے خرچ پر ہندوستان جائیں اور وہاں سے پرانی چیزیں یعنی کتابیں ، سکے ، ہتھیار ، تصویریں ، موریاں وغیرہ روانہ کیا کریں ۔ اس وقت ان کی تنخواہ اسی پونڈ ماہوار تھی ۔ طے یہ پایا کہ یہی تنخواہ جاری رہے گی اور پرانی چیزوں کی خرید پر جو صرفہ ہوگا وہ انھیں برابر ملتا رہے گا ۔ کمپنی والوں کو یہ تشویش تھی کہ کہیں یہ شخص ہندوستان جا کر ہاتھ سے نہ نکل جائے ۔ اس کا علاج انھوں نے یہ سوچا کہ انھیں ایک برائے نام رقم کے عوض کمپنی میں حصہ دار بنا لیا جائے ۔ اس غرض سے حافظ صاحب نے سات سو پونڈ بہ ذریعہ چیک ان کو ادا کیے جس کی رسید ۴۔ فروری ۱۹۱۳ء کی نوشتہ موجود ہے ۔ بقایا ایک ہزار پونڈ انھوں نے مشہود خاں کے نام کیے اور اسی سال موسم بہار میں ٹونک چلے آئے ۔

ٹونک پہنچ کر وہ پرانی اشیا کی فراہمی میں مصروف ہوگئے اور روانہ بھی کرنے لگے ۔ مثلاً ۱۷ ۔ جولائی کو لندن سے کمپنی کے منتظم حصہ دار مسٹر جے ۔ ایچ ۔ رینز نے جو خط لکھا ہے اس میں ان کی روانہ کی ہوئی چیزوں کی رسید اور بعض کی فروخت کی اطلاع ہے ۔ مثلاً دیوان حافظ کے قلمی نسخے کا ایک ورق سات پونڈ میں فروخت ہوا اور شاہ نامے کا ایک پرانا نسخہ تیس پونڈ میں گیا ۔ لیکن ان چیزوں میں زیادہ تعداد مورتیوں کی تھی ۔ اس خط کے آخر میں یہ بھی استفسار ہے کہ آپ نے بندوق کا لائسنس بنوا لیا ہے یا نہیں ۔ یہ غالباً اس لیے کہ لائسنس بننے پر کمپنی کو وہاں سے حافظ صاحب کے لیے بندوق روانہ کرنی تھی ۔

اس کے بعد آٹھ اگست کے خط میں لکھا ہے کہ آپ کا تار موصول ہوا - ۷۰ پونڈ (۱۰۵۰ روپے) بذریعہ بار نیشنل بنک آف انڈیا کی معرفت روانہ کر دیے ہیں - اگلے ہفتے اتنے ہی اور روانہ کرنے کی کوشش کروں گا - اس کے ساتھ معاهدے کی ایک نقل روانہ کرنے کا ذکر بھی موجود ہے - یہ بھی لکھا ہے کہ میں اکتوبر ۱۹۱۴ء سے قبل ہندوستان نہیں آ سکتا -

پرانی اشیا روانہ کرنے کا یہ سلسلہ پہلی عالم گیر جنگ کی ابتدا تک جاری رہا - ان چیزوں کی تلاش میں انہوں نے دور دور تک چکر لگائے؛ خصوصاً راجپوتانہ میں وہ خوب پھرے - اجمیر ، جودھ پور ، جے پور ، چتوڑ ، رنتھمبھور اور مند سور وغیرہ کے پرانے شہر اور قلعے چھان مارے - ٹونک شہر اور ارد گرد کے دیہات میں جانے کی خاطر تانگا رکھ لیا - اس تانگے میں جو پرانے زمانے کی رتھ کی ترقی یافتہ شکل تھی، بیل جوتے جاتے تھے - ٹونک میں اس کا بہت رواج تھا - شرفا ایک دوسرے کے مقابلے میں عمدہ سے عمدہ جوڑیاں تلاس کرتے اور بہتر سے بہتر تانگے بنواتے - ہلکا پھلکا ہونے کی وجہ سے بیل خوب تیز دوڑا کرتے تھے - اندر گدیلے پر گاؤ تکیہ لگا ہوتا - مستورات کے لیے نہایت آسانی سے باپردہ بھی کیا جاسکتا تھا - بندوں کا لائسنس بن چکا تھا اور اس سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ وہ اپنا شکار کا شوق بھی پورا کرتے تھے -

جنگ چھڑنے کے بعد سمندری راستے محفوظ نہ رہے ، ڈاک کا نظام درہم برہم ہوگیا ؛ چناں چہ یہاں سے آثار قدیمہ روانہ کرنے کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور وہاں سے رقم آنا بھی ممکن نہ رہا -

۲۲- دسمبر ۱۹۱۴ء کو ان کا دوسرا بچہ حامد پیدا ہوا - اس کے انہوں نے بہت سے تاریخی نام نکالے جو ان کے اپنے قلم سے ایک کتاب میں درج ہیں - بلکہ حامد بھی ایک دل چسپ طریقے سے تاریخی نام ہے - اس کی تفصیل انہوں نے اس طرح لکھی ہے :

۱۳۳۳ھ = ۵۲ + } ۱۲۸۰ = ۸ × ۱ × ۴۰ × ۴ = ح × ا × م × د = حامد
۱۲۸۰ } ۵۲ = ۸ + ۱ + ۴۰ + ۴ = ح + ا + م + د = حامد

لیکن یہ بچہ ۲۸ - مارچ ۱۹۱۵ء کو فوت ہوگیا -

کام کی طرف سے بے فکر ہو کر وہ شکار ہی کے ہوگئے - گاڑی بان اور دو ایک ملازموں کے ہمراہ تانگہ لے کر نکل جاتے اور کئی کئی دن غائب رہتے - دو جوڑیاں بیلوں کی تھیں جو باری باری جوتی جاتیں - دوستوں کے معاملے میں وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط تھے - اس کی وجہ یہ تھی کہ بھائیوں سے برادران یوسف کا سا سلوک دیکھ کر وہ مردم گزیدہ ہوگئے تھے - یہ آدم بیزاری تمام عمر ان کے مزاج میں رہی - اس کا اندازہ ان کے سب جاننے والوں کو تھا - چناں چہ ان کے دوست سید محمد عمر حسنی ۱۹۳۰ء میں اختر صاحب کے نام ایک خط میں رسالہ ''خیالستان'' کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''رسالہ ماشاء اللہ بہت دل چسپ ہے - خدا تمھاری عمر میں برکت دے اور والد کی سی لیاقت ، مگر ویسی مردم بیزاری نہ ہو -''

اس دور میں ٹونک میں موجود لوگوں میں ان کے گہرے دوستانہ تعلقات صرف دو آدمیوں سے تھے - ایک وہاں کے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر ڈیسائی ، دوسرے وکیل احمد علی صاحب - ریاستوں میں قاعدہ تھا کہ لگان کی وصولی کے مخمصے سے نجات پانے کی خاطر دیہات کو مختلف مدتوں کے لیے ٹھیکے پر دے دیا جاتا تھا - یہ طریقہ اجارہ داری کہلاتا تھا - وکیل احمد علی صاحب نے ایک گاؤں بھانچی اجارے پر لے رکھا تھا - یہ ٹونک سے کوئی دس میل دور دریائے بناس کے پار واقع تھا - حافظ صاحب نے اس گاؤں کو شکار کی خاطر مرکزی مقام قرار دیا اور یہاں ایک مختصر سا کچا مکان بنوا لیا جو دیہاتی عوام میں بابو جی کا بنگلہ کہلاتا تھا - بندوق کے علاوہ مچھلی کا شکار بھی بناس میں خوب ملتا تھا - کبھی کبھی گھر بھی چکر لگا جاتے - جنگ غیر معمولی طوالت اختیار کرتی جا رہی تھی - یہاں آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی ، اور پھر شکار کے اخراجات - آخر ولایت بھیجنے کے لیے جو پرانی چیزیں جمع تھیں ان کو آہستہ آہستہ فروخت کرنا شروع کیا -

۱۲ - ستمبر ۱۹۱۷ء کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا - وفات سے چند دن پہلے یعنی یکم ستمبر کو انھوں نے اپنے تمام زیورات جو کافی

مالیت کے تھے، ایک تحریری دستاویز کے ذریعے حافظ صاحب کو عنایت کر دیے، کیوں کہ ایک تو وہ والد کی وراثت سے ان کی محرومی سے متاثر تھیں، دوسرے مشہود خاں کے اخراجات کی گراں باری بھی انھی پر تھی۔ مشہود خاں کو وہ بہت دیر بعد تک پیسے بھیجتے رہے ھیں۔ چناں چہ اس سلسلے کی غالباً آخری کڑی مورخہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لاھور کے سنٹرل بنک آف انڈیا کے ذریعے بھیجا ھوا اسی پونڈ کا ایک ڈرافٹ ہے۔

۱۸، ۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ شدت اتنی تھی کہ شہر و دیہات کوئی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انھوں نے ایک بڑا ڈیرہ خرید لیا۔ شکاری تنسو ان کے پاس پہلے ھی تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کے مشورے سے بھانچی سے چند میل ھٹ کر دریا کے بیچوں بیچ ریتی پر ڈیرہ لگایا۔ یہاں وہ ٹونک میں موجود تمام اقربا کو لے گئے اور کوئی تین ماہ تک وھاں ٹھہرنے کے بعد بیماری کا زور ٹوٹنے پر واپس لائے۔ اس دوران میں زیادہ تر مچھلی کا شکار مرکز توجہ رھا کیونکہ چرند و پرند بھی طاعون کی زد سے محفوظ نہ تھے۔ ٹونک کے بناس کی ریتی کے خربوزے پورے ھندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اسی سال انھوں نے اپنے ملازموں سے خربوزوں کی باڑی بھی لگوائی۔ یہ شوق ان کی زندگی کے آخری دنوں میں بہت بڑھ گیا تھا۔

۱۹۱۸ء میں ٹونک کے پولیٹیکل ایجنٹ ھالینس صاحب تھے۔ ایجنٹی بنگلہ ایک پہاڑی پر مہندی باغ کے ساتھ ھی واقع تھا۔ مسٹر ھالینس کو فارسی پڑھنے کا شوق چرایا۔ ڈاکٹر ڈیسائی نے اس غرض سے حافظ صاحب کا تعارف ان سے کرا دیا۔ یہ خوش ھوئے کہ اپنے مذاق کا آدمی مل گیا۔ چناں چہ ھفتے میں دو بار بلامعاوضہ انھیں پڑھانے جایا کرتے۔ ریاستی حلقوں میں ان کی اس ملاقات کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھا گیا کیوں کہ نواب محمد علی خاں کی معزولی کے بعد سے انگریزوں اور ان کے ایجنٹوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ خود حافظ صاحب کی لندن سے خط و کتابت ان کے لیے وسوسوں سے خالی نہ تھی، چہ جائے کہ ایجنٹ سے ھفتے میں دو بار ان کی میٹنگ ھوتی۔

تدریس کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر ہالینس صاحب کے تبادلے تک برابر جاری رہا -

۱۶- ستمبر ۱۹۱۸ء کو ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی جس نے نو دس سال عمر پا کر لاہور میں انتقال کیا - اگلے سال پھر ایک بچی ہوئی لیکن چند ماہ بعد ہی فوت ہو گئی -

۱۹۱۹ء میں ریاست میں نواب ابراہیم علی خاں کے خلاف ایک سازش کا انکشاف ہوا - مبینہ طور پر اس کے سرغنہ خود ولی عہد ریاست فیروز جنگ بہادر تھے - مقصد یہ تھا کہ نواب ابراہیم علی خاں کو جو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں ، گدی سے اتار کر قبل از وقت ان کی جگہ لے لیں - معاملہ منکشف ہوتے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی - جس شخص پر معمولی سا شبہ بھی ہوتا ، گرفتار کر لیا جاتا - حافظ صاحب دو پرانے مشکوک تھے ، چناں چہ ان کی گرفتاری کے احکام بھی جاری ہو گئے - ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی - اس وقت کئی دن کے بعد شکار سے تھکے ماندے آئے تھے - کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ کسی نے آ کر وارنٹ کے اجرا کی خبر سنائی ، بڑے پریشان ہوئے - بے گناہی ثابت کرنے کا موقع نہ تھا - دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ملازم عظیم الدین کو ساتھ لے کر نکل گئے - پہلے ہالینس صاحب کے پاس الہ آباد پہنچے - چند دن وہاں ٹھہرے ، پھر تفحص حال کے لیے عظیم الدین کو ٹونک بھیجا اور آپ ڈھانی چلے گئے - ایک مقررہ دن ٹونک کی طرف روانہ ہوئے - خیال تھا کہ اب تک معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا لیکن پھلیرا جنکشن پر عظیم الدین آ ملا اور بتلایا کہ آپ کی تلاش بڑی سرگرمی سے جاری ہے ؛ چناں چہ وہیں سے مارواڑ لوٹ آئے -

ابا صاحب مرحوم نے مشہود خاں کے علاوہ تمام بیٹوں کی شادیاں ڈھانی شیرانیاں ہی میں کی تھیں - ان کے انتقال کے بعد حافظ صاحب اور مودود خاں کے علاوہ چاروں بھائیوں نے اپنی پسند کی شادیاں کیں - ان میں مقصود خاں مزاج کے بڑے تیز تھے - انھوں نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ پہلی بیگم کو جواب دے دیا - وہ واپس

اپنے گھر چلی گئیں - اس بات کا قبیلے والوں نے بہت برا مانا - بعض نے یہاں تک کہا کہ آئندہ ٹونک والے یہاں آنے اور رشتہ لینے کا نام نہ لیں - جب حافظ صاحب وہاں پہنچے، قبیلے کے سر کردہ لوگوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا - نتیجہ یہ ہوا کہ حافظ صاحب نے خود ان خاتون سے عقد کر لیا - ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی -

مارواڑ میں بھی انہیں ایک عزیز کی بندوق مل گئی جس سے شکار کا مشغلہ جاری رہا، لیکن اس وقت مالی لحاظ سے ان کا ہاتھ بہت تنگ تھا - اس کے علاوہ مستقبل کی فکر بھی پریشان کر رہی تھی - ارادہ کیا کہ بھوپال جا کر کوئی گاؤں اجارے پر لیں لیکن اس کے لیے روپیہ درکار تھا - جنگ کے شعلے سرد پڑ چکے تھے - لوزک اینڈ کمپنی کو اپنے حصے میں سے کچھ رقم بھیجنے کے لیے لکھا - ادھر ٹونک اپنے گھر پیغام بھیجا کہ ''دیوان آفتاب'' اور اس کے ساتھ کی ایک اور کتاب بارہ سو روپے کے عوض فلاں شخص کے حوالے کر دیں - ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں لندن سے ڈرافٹ پہنچ گیا - اس کی رقم وصول کرنے کے لیے انہیں اجمیر جانا پڑا - اجمیر ہی سے سیدھے بھوپال روانہ ہوگئے- عظیم الدین همراہ تھا - سادات ٹونک کے بعض گھرانے بھی جو سازش کے سلسلے میں جلا وطن کیے گئے تھے، بھوپال میں مقیم تھے؛ یہ انھی کے ہاں جا کر ٹھہرے - کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ وہاں کے علاقے دیکھتے اور شکار کھیلتے پھرے - شکار کے لیے بندوقوں کے علاوہ سواری کے تانگے کا انتظام میزبانوں کی جانب سے کیا گیا تھا - غرض وادی چمبل کے جنگل انہیں بہت پسند آئے - وہاں کے شکار کے بڑے دل چسپ واقعات سنایا کرتے تھے -

بالآخر انہوں نے بھوپال میں آباد ہونے کا ارادہ کر لیا اور مارواڑ واپس ہوئے - ٹونک اپنے گھر اطلاع بھیج دی کہ وہ لوگ بھی مارواڑ چلے آئیں تا کہ بھوپال جانے سے پہلے کچھ دن عزیزوں میں گزار سکیں - چناں چہ چند دن بعد وہ آ پہنچے- اختر صاحب کی عمر اس وقت پندرہ برس کی تھی - ٹونک میں ان کی تعلیم وہی پرانے انداز میں ہوتی تھی - اب حافظ صاحب کو خیال آیا کہ بھوپال جانے سے پہلے انہیں

لاهور اورینٹل کالج میں داخل کروا آئیں ۔ اس غرض سے وہ انھیں
لے کر ستمبر ۱۹۲۱ء میں لاہور پہنچے۔ داخلے سے فارغ ہو کر واپس جانے
سے قبل وہ اپنے پرانے دوستوں سے ملاقی ہوئے ۔ ان میں شیخ عبدالقادر
بھی تھے ۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ حافظ صاحب اپنی گوناگوں
صلاحیتوں کے باوجود اب، تک بے کار ہیں، تو انھوں نے ان کے لیے
کوئی جگہ نکالنے کا وعدہ کیا ؛ چناں چہ واپسی کے کچھ ہی دن بعد
ان کو اسلامیہ کالج لاہور میں بطور لکچرر تقرری کی چٹھی روانہ کی
گئی جو اتفاق سے ان تک نہ پہنچ سکی ۔ پھر شیخ صاحب کا خط ملا
کہ آپ کے آنے میں تاخیر کا کیا سبب ہے ۔ یہ اطلاع ملنے پر وہ
دسمبر ۱۹۲۱ء کے وسط میں لاہور پہنچے اور اوائل جنوری ۱۹۲۲ء سے ان
کی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا ۔ پہلے ۱۹۲۳ء کی تعطیلات موسم گرما تک
قلعہ گوجر سنگھ کے ایک مکان میں قیام کیا ، بعد ازاں چھ ماہ
میوہ منڈی کے ایک گھر میں رہے اور اس کے بعد ۱۸ ۔ فلیمنگ روڈ
پر چلے آئے جہاں وہ ملازمت سے سبک دوش ہونے تک قیام پذیر رہے ۔
۱۹۲۳ء سے وہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں مارواڑ چلے جاتے اور
وہاں کی برسات میں سیر و شکار سے لطف اندوز ہوتے ۔ البتہ ۱۹۳۷ء سے
وہ مارواڑ کی بجائے ٹونک جانے لگے کیوں کہ ریٹائر ہونے کے بعد
وہیں رہنے کا ارادہ تھا ۔

یہ ملازمت حافظ صاحب کی دل پسند تھی ۔ اب، وہ ہر طرف سے
بے نیاز ہو کر علم کی خدمت پر کمر بستہ ہو گئے اور ان کا زیادہ وقت
تحقیق و تنقید پر صرف ہونے لگا یا پھر پرانی کتابیں ، سکے اور دوسری
قدیم اشیا جمع کرنے پر ۔ ان چیزوں کے لیے انھوں نے بڑی دور دور
کے سفر کیے ۔ ایک شکار کا شوق تھا کہ ان علمی مشاغل کے ساتھ
ساتھ قائم رہا ۔ اس سے وہ اپنی دماغی کاوشوں کی تھکن اتارا کرتے
تھے ۔ ملازمت کے بعد سے شکار کا زیادہ موقع انھیں گرمیوں کی چھٹیوں
ہی میں میسر آتا ، تاہم لاہور میں بھی کبھی کبھی راوی کے کنارے
پہنچ جاتے جہاں ان دنوں کافی شکار ہوتا تھا ۔

ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین ۱۹۲۰ء سے رسالہ ''مخزن'' اور ۱۹۲۱ء

سے رسالہ ''اردو'' میں شائع ہونے لگے ۔ ابتدا میں دقیقی ، قابوس نامہ ، فردوسی اور شاھنامہ سے متعلق مضامین لکھے گئے۔ پھر شعرالعجم کی تنقید شروع ہوئی ۔ تنقید کا یہ فنی انداز ھندوستان کے لیے بالکل نیا تھا ۔ ان مضامین نے پورے ملک میں دھوم مچا دی؛ ان کے متعلق چند سربرآوردہ لوگوں کی آرا پیش کرنا یہاں بے موقع نہ ہوگا ۔

نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی نے مولوی عبدالحق صاحب کے نام ۲ ۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھا :

''میں سمجھتا تھا کہ میں کسی قدر فارسی جانتا ھوں مگر شعرالعجم کی تنقید پڑھ کر مجھے معلوم ھوا کہ میں فارسی مطلق نہیں جانتا ۔ کس قدر عالمانہ و عارفانہ تنقید ھے ۔''

مولوی عبدالحق صاحب نے ۲۶ ۔ نومبر کے خط میں حافظ صاحب کو تحریر کیا :

''حقیقت یہ ھے کہ آپ کی کاوش و جستجو اور تنقید ھر طرح قابل تحسین اور لائق قدر ھے ۔ یہ مضامین اردو زبان میں بالکل نئے ھیں اور جو ڈھنگ آپ نے تنقید کا اختیار فرمایا ھے ، اس سے ھمارے ھاں کے انشا پرداز اور ادیب بالکل ناواقف ھیں ۔''

نواب حبیب الرحمان خاں شروانی :

''اس مقالے (فردوسی کی ھجو محمود) کے لکھنے والے کے ھاتھ چوم لینے چاھییں ۔''

مولوی وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی :

آپ کے دو مقالوں (محمود کی ھجو اور فردوس کی یوسف زلیخا) نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا ھے ۔ ان مضامین کی مناسب تعریف کرنا مشکل بلکہ نا ممکن ھے ۔ کاش کہ ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے حالی پانی پتی زندہ ھوتے ۔

اورینٹل کالج میگزین میں مضامین کا سلسلہ ۱۹۲۵ء میں شروع ھوا۔ اسی زمانے میں ان کی توجہ فارسی ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی

طرف مبذول ہوئی اور جلد ہی عبداللہ یوسف علی صاحب کی فرمائش پر انھوں نے ''پنجاب میں اردو'' جیسی معرکہ آرا کتاب سپرد قلم کی ۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں اسلامیہ کالج کی انجمن اردو کی جانب سے شائع کی گئی ۔

۱۹۲۷ء میں انھوں نے یورپ میں فارسی زبان کے مطالعۂ خصوصی کے لیے پنجاب گورنمنٹ کے ایک وظیفے کی خاطر درخواست دی ، لیکن انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی ۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی عمر کی زیادتی تھی ، دوسرے وہ پہلے ہی ایک طویل عرصے تک انگلستان میں رہ چکے تھے ۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایک اردو کے لیکچرار کی اسامی تخلیق کی گئی ۔ مئی میں انھوں نے اس کے لیے درخواست دی ۔ ادھر انھوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو و فارسی لیکچرار کی اسامی کے لیے بھی درخواست دے رکھی تھی ۔ ستمبر میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو گیا ، لیکن اتنے عرصے میں انھیں لاہور میں کامیابی کی امید ہو چکی تھی ، اس لیے انھوں نے ڈھاکہ جانے سے انکار کر دیا ۔ وہ لاہور چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور اسی وجہ سے اس سے پہلے دو بار عثمانیہ یونیورسٹی کی پیش کش ٹھکرا چکے تھے ۔ آخر ان کی خواہش کے مطابق یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں ہو گیا ۔

مئی ۱۹۲۸ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی جانب سے انھیں دو ہزار روپے کے عوض ڈبلیو ۔ ٹی ۔ وورٹابیٹ کی عربی انگریزی لغات کا اردو ترجمہ کرنے کی پیش کش کی گئی ، لیکن یہ کام دسمبر تک ختم کرنا ضروری تھا اور وہ اس کی خاطر اپنی دوسری مصروفیتوں کو بالائے طاق نہ رکھ سکتے تھے ۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ان کو 'پنجاب میں اردو' پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا ۔ علاوہ ازیں بیرون پنجاب کی بعض یونیورسٹیوں اور انجمنوں نے بھی انھیں انعام سے نوازا ۔

یونیورسٹی میں ان کا تقرر بطور اردو زبان کے استاد کے ہوا تھا اس لیے ان کی توجہ زیادہ سے زیادہ اردو زبان اور اس کے

ارتقا پر مرکوز ہوتی گئی اور ان کے مضامین کافی باقاعدگی سے 'اورینٹل کالج میگزین' میں شائع ہوتے رہے ۔ اردو زبان سے متعلق مضامین کے علاوہ ان کی پروفیسر محمد حبیب کے ''ترجمہ خزائن الفتوح'' چند بردائی کی ''پرتھی راج راسا'' اور مولانا آزاد کی ''آب حیات'' پر سفیدیں بڑے پائے کی چیزیں ہیں - علم عروض ، مسکوکات ، کتب نصاب اور تفسیر وغیرہ کے متعلق بھی انھوں نے مضامین سپرد قلم کیے -

لوزک اینڈ کمپنی سے ان کا معاملہ ۱۹۳۰ء میں ختم ہو گیا اور ان کی باقی ماندہ رقم کمپنی نے لندن سے روانہ کر دی ۔

۱۹۳۳ء میں انھوں نے میر قدرت اللہ قاسم کی 'مجموعۂ نغز' کی ترتیب مکمل کی جو اسی سال یونی ورسٹی نے شائع کی .. اپریل ۱۹۳۳ء میں لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ کا اجلاس ہوا جس میں انھوں نے بچوں کے تعلیمی نصاب سے متعلق اپنا مقالہ پیش کیا ۔ ادارے کے کاموں میں وہ ایک عام کارکن کی طرح شریک ہوتے - اپریل ۱۹۳۶ء میں ادارے کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں انھوں نے 'مثنوی عروۃالوثقیٰ' پر ایک مضمون پیش کیا ۔

لاہور میں ان کی عادت کے مطابق مربی دوستوں کا دائرہ وسیع نہ تھا ۔ دوستوں میں پروفیسر شیخ محمد اقبال صاحب اور پروفیسر محمد فضل الدین قریشی صاحب کے نام سر فہرست ہیں ۔ سرشیخ عبد القادر ، میاں عبد العزیز بیرسٹرایٹ لاء اور علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب سے ولایت کی واقفیت تھی - سر اقبال سے بھی لندن میں ہی ملے تھے ۔ وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی علمیت کے مداح تھے ۔ میرے پاس ایسے رقعے موجود ہیں جن میں اقبال مرحوم نے ان سے بعض فارسی کتابوں یا الفاظ کے متعلق استفسار کیے ہیں ۔ مولوی شفیع صاحب مرحوم تو خیر ان کے پرنسپل تھے لیکن بڑے قدردان بھی تھے ۔ پروفیسر سید عبد القادر سے بھی گہرے مراسم تھے ۔ چھوٹوں میں ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی ، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب اور پروفیسر عبد اللطیف تپش کو بہت عزیز رکھتے تھے ۔ لاہور سے باہر کے اصحاب میں خصوصیت کے

ساتھ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم ، جناب قاضی عبدالودود صاحب ، ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ، پروفیسر مجیب اشرف صاحب ندوی اور پروفیسر ابراھیم ڈار صاحب مرحوم سے خط و کتابت ھوتی تھی ۔

حافظ صاحب انتہائی سادہ مزاج رکھنے تھے ۔ ولایت میں اتنے سال گزارنے اور اعلیٰ سوسائٹی میں رہنے کے باوجود ان میں بے حد انکسار تھا ۔ لاھور میں عموماً فرش پر بیٹھ کر کام کیا کرتے ۔ آخری عمر میں بیماری کے باعث پلنگ پر بیٹھ کر کرنے لگے ۔ جب تک اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں رہے ، پیدل کالج تک جاتے تھے ۔ جب اورینٹل کالج پہنچے ، مکان سے دور ہونے کی وجہ سے تانگے کا انتظام کرنا پڑا ۔ فیروز تانگے والا روز صبح کالج لے جاتا اور چھٹی کے وقت واپس لے آتا ۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے کھانے کے معاملے میں بہت محتاط تھے ۔ سادہ غذا پسند کرتے تھے ۔ عموماً پتلے پتلے پھلکے شوربے میں بھگو کر کھایا کرتے تھے لیکن دوسروں کو کھلانے کا بڑا شوق تھا ۔ دعوتوں کا بڑے تکلف سے اہتمام کرتے تھے ۔ پھلوں سے بہت رغبت تھی ۔ ان کے پسندیدہ پھل آم اور خربوزے تھے ۔ امرود ڈاکٹر کی ھدایت کی بنا پر زیادہ استعمال کرنے لگے تھے ۔ ولایت میں انھوں نے بڑی پاکیزہ زندگی بسر کی ، دختِ رز سے انتہائی نفرت تھی ۔ جن دنوں لندن میں سخت سردی کے باعث بیمار ہوئے باوجود ڈاکٹر کے اصرار کے اجتناب کیا ۔ ان کی اولاد میں ایک اختر صاحب (اختر شیرانی) زندہ بچے تھے ۔ ان سے کیا کچھ محبت نہ ہوگی لیکن جب ان کی مے نوشی کا علم ہوا ، گھر کے دروازے ان پر بند کر دیے اور سوائے ان چند دنوں کے جب انجمن ترقی اردو میں دونوں باپ بیٹے اکٹھے ہوئے ، جیتے جی سامنے نہ آنے دیا ۔

ولایت میں ذھنی پریشانیوں کے زمانے میں سگریٹ نوشی البتہ شروع کر دی تھی ۔ بعد میں یہ عادت بڑھ گئی ۔ نظام ، عبداللہ کیریون یا پھر گولڈ فلیک استعمال کرتے تھے ۔ لاھور میں جب ضیق النفس کے عارضے میں مبتلا ہوئے تو یک لخت سگریٹ ترک

کردیا اور کچھ عرصہ بالکل نہیں پیا - پھر حقہ تیار ہوا - رتلام اور دوسرے دور دراز مقامات سے خمیرے اور قوام منگوائے - آخر اسے بھی ترک کر دیا - اب یوں کیا کرتے کہ سگریٹ کے چاقو سے دو یا تین ٹکڑے کرتے اور کھانے کے بعد ایک ٹکڑا سگریٹ ہولڈر میں لگا کر پی لیتے - یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا لیکن دمے کی شدت کی وجہ سے اسے بھی بالآخر ختم کرنا پڑا -

لباس میں ہمیشہ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے - پاؤں میں ہر موسم میں فل بوٹ پہنا کرتے - شکار کے موقعوں پر خاکی برجیس اور خاکی کوٹ ہوتا تھا - گھر میں بغیر کالر کی قمیص اور سفید پاجامے کے ساتھ پیروں میں گرگابی ہوا کرتی - لاہور کے قیام کے دوران میں نظر کم زور ہونے کے سبب لکھتے پڑھتے وقت عینک لگایا کرتے تھے - دانت کسی زمانے میں برش سے صاف کرتے رہے ہوں گے ، پھر ببول کی مسواک استعمال کرنے لگے اور آخر تک کرتے رہے - ڈاڑھی انہوں نے کبھی نہ رکھی - جوانی میں بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے ، پھر ہلکی کرتے گئے - بال سفید ہونے کے بعد لاہور میں کچھ عرصہ سر پر مہندی لگواتے رہے لیکن جلد ہی یہ ترک کر دی - ساتھ ہی ہٹلری انداز کی مونچھیں رکھ لیں - دماغی کام کی زیادتی کی وجہ سے سر پر بال بہت ہلکے ہوگئے تھے جنھیں وہ برش سے پھیلا لیتے تھے - قد اور جسم متوسط اور رنگ تیز گندمی تھا - آخر عمر میں زیادہ جم کر بیٹھے رہنے کی وجہ سے جسم کچھ بھاری ہوگیا تھا -

بے حد وضع دار اور متین انسان تھے لیکن خشک مزاج ہرگز نہ تھے - دوستوں اور شاگردوں کی ہر مشکل میں شریک رہتے لیکن اپنے نجی معاملات کے ذکر سے کبھی انھیں پریشان نہ کرتے - ان کی بردباری اور وضع داری کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ باوجود بیس برس لاہور میں رہنے کے ان کے قریب ترین دوستوں کو بھی یہ علم نہ ہوسکا کہ ان کی دو بیویاں ہیں -

ولایت سے ایک سنہری جیبی گھڑی لائے تھے - اس کے ساتھ ہی

سونے کی زنجیر تھی ۔ دونوں پر ان کا مونو گرام بنا ہوا تھا ۔ وہ گھڑی تو استعمال نہ کرتے تھے، البتہ ویسٹ اینڈ کی گھڑی میں زنجیر ڈال کر قریب ھی دیوار سے آویزاں کر رکھی تھی ۔ ایک شاگرد ان کی غیر حاضری میں آیا اور زنجیر اڑا لے گیا اور کسی صراف کے پاس جا کر فروخت کر دی ۔ بھائی شاکی[1] نے ڈھونڈھ نکالی اور صراف سے دوبارہ خریدی گئی ۔ حافظ صاحب نے اس شاگرد کا نام معلوم ہوجانے کے باوجود اس سے کوئی بازپرس نہ کی ۔

اپنے اعزہ و اقربا کی ہر ممکن مدد کیا کرتے تھے ۔ اس سے انھیں طمانیت حاصل ہوتی تھی ۔ لاہور میں بہ یک وقت کئی کئی عزیز تعلیم یا ملازمت کے سلسلے میں ان کے ہاں مقیم رہتے تھے ۔ جانوروں سے بڑا انس تھا اور انھیں تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے ۔ لاہور میں جو خوش نصیب بلی مع بچوں کے ہمارے ہاں آجاتی ، وہ تاریست جانے کا نام نہ لیتی - جاتی بھی کیوں ، صبح ڈھیر سارے چھیچھڑے ، دن بھر بچوں کے لیے دودھ اور سردیوں میں روئی کے بستر اور کہاں نصیب ہوتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں آدمی کم اور بلیاں زیادہ نظر آتیں ۔ بعض اوقات بلیاں چھوٹے بچوں کو دودھ پلانا چھوڑ دیتی تھیں ۔ ایسے موقعوں پر گھر والوں کی شامت آ جاتی اور ڈراپر کے ذریعے دن میں تین تین بار سب بچوں کو دودھ پلانا پڑتا ۔ مکان دوسری منزل پر ہونے کی وجہ سے کتوں سے البتہ نجات رہتی تھی ، تاہم اوپر سے آنے والے جانوروں کے لیے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ۔ پرندوں کے واسطے پانی کی کونڈی اور دانہ ہر دم موجود رہتا ۔ ایک بار تو کمال ھی ہوگیا ، جب ایک بندر کا بچہ نہ معلوم کہاں سے مارا مارا پھرتا آگیا ۔ تر نوالے جو ملے یہیں کا ہو رہا ۔ سال بھر میں کھا کھا کر خوب سانڈ ہوگیا ۔ اسے اپنے ہاتھ سے پھل وغیرہ کھلایا کرتے تھے ۔

۱۔ یہ صاحب پرانی کتابوں اور دیگر آثار عتیقہ کا کاروبار کرتے تھے اور اس سلسلے میں حافظ صاحب کے پاس اکثر آتے ۔ اصل نام غالباً مشتاق حسین تھا ۔

یہ بندر کیلوں کا بہت شوقین تھا ۔ اس کی شرارتوں پر سب ہنستے تھے ۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو مارواڑ جانے کی تیاری ہونے لگی ۔ خیال تھا کہ اسے کسی کے پاس چھوڑ جائیں گے، واپس آ کر لے لیں گے۔ بندر سیانا تو بلا کا ہوتا ہے ، معاملہ سمجھ گیا اور بھوک ہڑتال کر دی ۔ پھر کیا تھا ، پگھل گئے ۔ اس کے لیے پنجرہ منگوایا گیا اپنے ساتھ رکھوا کر لے گئے اور چھٹیوں کے بعد واپس لے کر آئے ۔

بچوں سے بھی بہت پیار کرتے تھے ۔ ان سے ان کے مطلب کی باتیں کرتے اور شکار کی کہانیاں سناتے ۔ والد صاحب [اختر شیرانی] سے وہ مایوس تھے اس لیے ان کی محبت ہم بہن بھائیوں پر مرکوز ہوگئی تھی ۔ ہم انہیں بابا جی کہا کرتے تھے بلکہ سارے خاندان میں وہ اسی نام سے یاد کیے جاتے تھے ۔ میری عمر کوئی پانچ چھ سال کی ہوگی ۔ مجھے فارسی کی ابتدائی کتاب پڑھایا کرتے تھے اور تختی بھی لکھواتے ۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں ان سے بہت ڈرا کرتا تھا ۔ رات کو اگر کہیں سے ذرا دیر میں آتے اور میں بستر پر لیٹ چکا ہوتا تو دریافت کرتے ''ہمارا بیٹا سوگیا ۔'' میں دم سادھ کر پڑ جاتا ۔ پھر قریب آ کر کہتے ''بھئی سوتے آدمی کی تو ٹانگیں ہلا کرتی ہیں ۔'' میں تیزی سے دونوں ٹانگیں ہلانے لگتا اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے ۔ جمعہ کو ہمیں چھٹی ہوتی تھی ۔ اس دن صبح صبح جب ہم بہن بھائی بے فکری سے کھیل کود میں مشغول ہوتے وہ قریب آ جاتے اور بڑی سنجیدگی سے کہتے ''بھئی جمعہ تو لڑائی میں مر گیا تھا ، وہاں بے چارے کی ٹانگ ٹوٹ گئی اس لیے آج نہ آ سکا ، اس کی جگہ سنیچر آ گیا ہے ۔ تم لوگ کتابیں لے آؤ'' ۔ تھوڑی دیر کے لیے ہماری خوشی کافور ہو جاتی اور جب وہ مسکرانے لگتے تب جان میں جان آتی ۔

بچوں کے گھر سے باہر جا کر کھیلنے کے بہت خلاف تھے ۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کبھی باہر جا کر کھیلے ہوں ۔ پردے کے زبردست حامی تھے اور خواتین کے کسی کے ہاں آنے جانے کے روا دار نہ تھے ۔ گھر کی مستورات جب گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے پر لاہور آتیں تو

انھیں دوبارہ چھٹیاں ہونے پر ہی گھر سے نکلنے کا موقع ملتا ۔ وہ بھی رات کو کیوں کہ وہ رات کی گاڑی پر روانہ ہوا کرتے تھے ۔ وہ تنہائی پسند تھے اور شہرت سے دور بھاگتے تھے ۔ فوٹو تک سے پرہیز کرتے تھے اور ماسوائے انتہائی مجبوری کے کبھی شامل نہ ہوتے ۔ اگر کسی جلسے وغیرہ کی صدارت کی دعوت آتی تو ہمیشہ بچ نکلتے ۔

طرز تپاک اہل دنیا کے رد عمل کے طور پر وہ کچھ جذباتی اور زود رنج ہوگئے تھے ۔ جس شخص کی کسی حرکت سے ایک بار انھیں نفرت ہو جاتی ، عمر بھر اس کی صورت دیکھنے کے روا دار نہ ہوتے ۔ ایسے معاملات میں ان کو راضی کرنا دھان زخم پیدا کرنے کے مترادف تھا ۔ مسعود خاں نے ان کی آخری عمر میں انتہائی کوشش کی کہ انھیں سامنے آنے کی اجازت دے دیں لیکن انکار کر دیا ۔ وہ چھپ چھپ کر بھائی کو دیکھتے اور آنسو بہاتے ۔ اپنے بہنوئی نیاز محمد خاں صاحب وکیل سے ۱۹۰۶ء میں شکر رنجی ہوئی تھی ۔ بہن سے بہت محبت تھی اور قیام ٹونک کے زمانے میں اکثر بلواتے لیکن وکیل صاحب سے نہ کبھی بات کی ، نہ روبرو ہوئے ۔ انتقال سے چند روز پہلے انھوں نے کہلوایا کہ میں حاضر ہو کر کچھ مشورہ دینا چاہتا ہوں ۔ جواب میں کہلوا دیا کہ ''میں قریب مرگ ہوں ، تھوڑا سا انتظار اور کر لیجیے'' ۔ انتہا یہ ہے کہ اختر صاحب تک کو بستر مرگ کے نزدیک نہ آنے دیا ۔

ان باتوں کے باوجود وہ تنک مزاج ہرگز نہ تھے ۔ دوستوں کے ساتھ مذاق اور چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہتا ، لیکن اس معاملے میں ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ۔ خطوں میں ان کی ظرافت طبع اور ادبی مزاح کے نمونے ملتے ہیں ۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اپنے بمبئی کے قیام کے زمانے میں مختلف انجمنوں کے جلسوں میں مقالے پڑھنے میں مصروف رہے ۔ ایسے ہی ایک اجلاس کی صدارت گورنر بمبئی نے کی جس کی اطلاع اخبارات میں شائع ہوئی ۔ چناں چہ انھی دنوں ان کو خط لکھتے ہوئے کہتے ہیں :

''ہاں جناب ڈاکٹر صاحب! سنتا ہوں کہ مہاراجہ بڑودہ آپ کے استقبال کے لیے دہلی تک آئے اور پھر آپ کو سر آنکھوں پر بٹھا کر بڑودے لے گئے اور وہاں جا کر آپ کو خوب . . . کیا۔ کیا یہ سچ ہے یا آپ کے دشمنوں نے آپ کو ستانے کے لیے یوں ہی مشہور کر دیا؟ ایک خبر یہ بھی سنی ہے کہ آپ کے لکچروں میں کوئی شخص نہیں آیا۔ صرف آپ اور آپ کے پریسیڈنٹ گورنر بمبئی انتظار کر کے واپس گھر آگئے اور پبلک کی غفلت پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔''

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے متعلق کچھ لکھا تھا لیکن میرا قلم اس کے نقل کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسے بہتیرا سمجھایا کہ نقل کفر کفر نباشد مگر وہ نہیں مانتا۔''

اپنی کتاب ''فردوسی پر چار مقالے'' انھوں نے پروفیسر اقبال صاحب کے نام پر معنون کی تھی۔ اس کے پروف پڑھنے کے لیے بھی انھی کو روانہ کیے۔ انھوں نے چپکے سے انتساب کا ورق کھینچ لیا۔ جب کتاب شائع ہوئی تو بغیر انتساب کے تھی۔ چناں چہ ان کے لڑکے کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ابا جی سے دریافت کرنا کہ ''فردوسی پر چار مقالے'' مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ایک صاحب کے نام پر معنون کی تھی۔ تعجب ہے کہ یہ انتسابی پرچہ اس تالیف میں سے غائب ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ انجمن ترقی اردو کا قصور نہیں ہے بلکہ ان مقالوں کے پروف خواں کا۔ اس کے متعلق آپ کا (ڈاکٹر صاحب کا) کیا ارشاد ہے۔''

بے نواسنامی پر اپنا مضمون اورینٹل کالج میگزین کے لیے پروفیسر اقبال کو روانہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدا جانے آج کل کے ایڈیٹر کیسے ہیں کہ لوگوں سے مضمون مانگنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ بے چارے مضمون نگار مضمون

لیے اسی انتظار میں رھتے ھیں کہ کوئی کہیں سے مضمون مانگے تو بھیجیں ۔ مثلاً میں ھی ھوں ، اب تک منتظر رھا کہ جناب ایڈیٹر صاحب اورینٹل کالج میگزین مضمون طلب کریں مگر ان کو پروا بھی نہیں ۔ مجبوراً خود ھی ذریعۂ ھذا بھیج رھا ھوں ۔ خدا کرے پسند خاطر عاطر ھو ۔''

لاھور میں ان کے دوست پروفیسر فضل الدین قریشی صاحب ایک بار طویل عرصے تک ملنے نہ آئے ، انھیں لکھا :

''قریشی صاحب!

شعر ذیل میری سمجھ میں نہیں آیا ۔ میں سنتا ھوں کہ آپ شعر فہمی میں طاق بلکہ شہرۂ آفاق ھیں :

تو بفرمای کہ در فہم نداری ثانی

لہذا عرض ھے :

بران صید مسکیں چہ بیداد رفت
کہ در دام از یاد صیاد رفت

والسلام ، محمود شیرانی''

ان کے پسندیدہ موضوعات اردو زبان و ادب ، تاریخ ادب فارسی ، اسلامی تاریخ و تہذیب ، عروض ، رسم الخط اور مسکوکات اور دیگر آثار قدیمہ کا مطالعہ تھے ۔ ان موضوعات پر ان کے تبحر علمی کے متعلق کچھ لکھنا نہ میرا منصب ھے اور نہ اس کا یہاں موقع ھے لیکن ایک بات عرض کرنا ضروری ھے ۔ وہ ان چیزوں میں نہ صرف دل چسپی رکھتے تھے بلکہ اپنے ملنے والوں کو بھی ان علوم کا فریفتہ بنا لیتے تھے ۔ گویا یہ بیماری متعدی تھی اور انھوں نے اس میں کئی دوستوں اور شاگردوں کو مبتلا کیا ۔ اس لحاظ سے وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ۔

یوں تو وہ پرانی کتابوں اور سکوں کی تلاش اور تحقیق کے سلسلے میں دور و نزدیک کے سفر کرتے ھی رھتے تھے، لیکن ۱۹۳۵ء میں گوجری

زبان پر تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے گجرات کاٹھیاواڑ کا سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے یونیورسٹی سے کچھ اخراجات برداشت کرنے کی درخواست کی جس کے جواب میں دو سو روپے کی منظوری مل گئی۔ چوں کہ موسم گرما کی تعطیلات میں گجرات میں زبردست بارش ہوتی ہے اس لیے انھوں نے ۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر تک دو ہفتے کی چھٹی لی اور گجرات روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں انھوں نے احمد آباد، بڑودہ، بمبئی اور جے پور کے بعض کتب خانے دیکھے۔ احمد آباد میں پیر محمد شاہ کی درگاہ کا کتب خانہ، سید بڑے صاحب کا کتب خانہ، سید جلال الدین مشہدی کا کتب خانہ اور حسینی پیر کا کتب خانہ دیکھا۔ بعض لوگوں مثلاً قاضی احمد آباد کے پاس عمدہ مجموعے تھے لیکن انھوں نے دکھانے سے انکار کر دیا۔ بمبئی میں محمدیہ اسکول کی لائبریری اور پروفیسر نجیب اشرف صاحب کا کتب خانہ نظر سے گزرا۔ بڑودہ میں جامع مسجد لائبریری دیکھی لیکن اس میں صرف مطبوعہ کتابیں تھیں۔ جے پور میں خوش قسمتی سے انھیں دائرے کے مہدویوں کے ایک کتب خانے کا کچھ حصہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتب خانہ کسی مقدمے کے سلسلے میں دائرہ سے ریاست کے صدر مقام میں لایا گیا تھا۔ اس میں انھوں نے خاص طور پر مہدوی فرقے کے لوگوں کی گوجری اور راجستھانی اردو میں لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں۔ اس سے انھیں اپنے مضمون ''دائرہ کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ'' کے لیے کافی مواد میسر آیا۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے انھیں ۱۵۔ اکتوبر کو ملازمت سے سبک دوش کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے ان کے دوستوں اور مداحوں میں بے چینی پھیل گئی۔ وہ خود بھی ابھی لاہور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ ان کے بعض کام ادھورے پڑے تھے۔ چناں چہ ان کے دوستوں نے ان کی ملازمت میں توسیع کی کوشش شروع کر دیں۔ سر اقبال نے وائس چانسلر کے نام ایک خط میں ان کی علمیت اور خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ جس عمر میں انھیں ریٹائر کیا جا رہا ہے در اصل یہی عمر ان سے فائدہ

اٹھانے کی ہے اور اس مرحلے پر ان کی سبک دوشی کا فیصلہ ہماری بدقسمتی کی دلیل ہے۔

ادارۂ معارف اسلامیہ نے ۱۸، ۱۹، ۲۰ مئی کو ان کے آثارعتیقہ کے مجموعوں کی نمائش منعقد کی اور اس سلسلے میں اپنی جانب سے ایک خط بڑی تعداد میں شائع کروا کر برصغیر کے علم و ادب سے دل چسپی رکھنے والے لوگوں کو بھیجا۔ اس کا مضمون یہ تھا :

مخدومی و مکرمی! سلام علیکم۔ پروفیسر حافظ محمود خان صاحب شیرانی لکچرار شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی کی علمی خدمات، فنی تحقیقات اور ادبی موشگافیوں سے جناب بخوبی واقف ہیں۔ یونیورسٹی کی خدمات سے وہ عنقریب سبک دوش ہونے والے ہیں اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ادبی حلقوں، علمی اداروں اور عوام کو ان کے کتب خانے کے نادر مخطوطات، نایاب تصاویر اور کم یاب سکوں اور دیگر آثار عتیقہ سے روشناس کیا جائے جس کے لیے ۱۸، ۱۹ اور ۲۰ ماہ حال کو لاہور میں ایک نمائش منعقد کی جا رہی ہے۔ جناب کی علم دوستی، معارف پروری اور ادب نوازی کی بنا پر درخواست ہے کہ پروفیسر صاحب ممدوح کی علمی خدمات کے اعتراف میں جناب حتی الامکان جلد اپنی رائے عالی سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

بعض حلقوں میں اس بات کی بھی تحریک کی جا رہی ہے کہ ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کو یونیورسٹی میں کچھ اور عرصے کے لیے ازسرنو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس ضمن میں جناب کا براہ راست جناب وائس چانسلر صاحب بہادر پنجاب یونیورسٹی کی خدمت میں اپنے قیمتی خیالات کا اظہار بہ شکل مراسلہ اس مقصد کے پورا کرنے میں موثر و موقر ثابت ہوگا۔

اگر وقت کی تنگی کی وجہ سے جناب اس تقریب سعید پر تشریف نہ لاسکیں تو کم از کم اپنے گرامی نامہ سے ہمیں ضرور سرفراز

فرماویں اور اس علمی و ادبی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔ ادارہ جناب کی اس ادب نوازی کو بہ نظر تحسین و تشکر دیکھے گا ۔

والسلام

نیاز کیش
سیکریٹری ادارہ''

یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمات اس وقت کے فائنل کمشنر مسٹر ڈابسن انجام دے رہے تھے ۔ شرفائے لاہور کا ایک وفد اس سلسلے میں ان سے ملا ۔ اس وفد میں نواب سعادت علی خان ، میاں امیر الدین اور پروفیسر فضل الدین قریشی بھی شامل تھے ۔ عرض ان تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں ان کی ملازمت میں دو سال کی توسیع منظور ہوگئی ۔ اس دو سالہ مدت میں انہوں نے وہ مضامین جن کا خاکہ تیار تھا ، مکمل کیے ۔ تنقید آب حیات اور مہدویاں دائرہ سے متعلق مضامین اسی عرصے میں تکمیل کو پہنچے ۔ آخر یہ دو سالہ توسیع بھی ختم ہوئی اور ۱۵- نومبر ۱۹۳۰ء سے وہ ساڑھے آٹھ ماہ کی رخصت پر چلے گئے ۔ یہ چھٹی انھوں نے لاہور ھی میں کاٹی ۔

حافظ صاحب کو عتیقیات کے جمع کرنے کا چسکا لورک اینڈ کمپنی کی ملازمت کے زمانے سے پڑا ۔ قیام ٹونک کے دوران میں وہ کچھ چیزیں جمع کرچکے تھے ۔ پھر لاہور پہنچنے پر وہ یہ چیزیں ، خصوصاً پرانی کتابیں اور سکے فراہم کرنے لگے ۔ چند سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۲۷ء کی ابتدا تک وہ فارسی اور عربی کے ایک ہزار سے زائد قلمی نسخے مہیا کر چکے تھے ۔ ان میں سے بعض نادر نسخوں کی ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا ریکارڈ کمیشن کے لاہور کے اجلاس کے موقع پر نمائش کی گئی ۔ بعد ازاں دھلی اور لاہور کی متعدد نمائشوں میں ان کی چیزیں خصوصیت کے ساتھ پیش کی گئیں ۔ مخطوطات کے علاوہ مطبوعہ کتابوں کی ایک بڑی تعداد اور بہت سے پرانے سکے بھی انھوں نے اکٹھے کیے ۔ ان کی آمدنی کا معتدبہ حصہ اسی کام کی نذر ہوتا تھا ۔ کتابوں اور سکوں کے بعد پرانے ھتھیار ، برتن ، مورتیاں ، وصلیاں ، کتبے ، فرامین اور مکاتیب

، وہ جمع کرتے تھے ۔ اور تو اور ملمانی کھسوں کے وہ بڑے
ں تھے ۔ جتنی کسی کھیس کی ھندسی اشکال زیادہ پیچیدہ ھوتیں
ھی وہ اسے پسند کرتے ۔ ان کا خیال تھا کہ بن کے اندر مختلف
سی نمونے ڈالنے کے فن کو مسلمانوں نے شرع کی حدود میں رھتے
نے اپنے ذوق لطیف کی تسکین کی خاطر ترقی دی ھے ۔ اس فن کی
ہ مثالیں گو قالینوں میں ملتی ھیں لیکن کھیس بھی اس زمرے میں
ل ھیں ۔

کتابوں اور سکوں کو وہ بہت احتیاط سے رکھتے تھے ۔ کتابیں
یوں میں ترتیب سے رکھی رھتی تھیں ۔ سکوں کے لیے خاص قسم
صندوقچے بنوائے گئے تھے ۔ ان صندوقچوں میں تیلی پتلی درازیں
ں تھیں جو بارہ بارہ خانوں میں تقسیم ھوتیں ۔ ان خانوں میں سرخ ،
یا نیلی مخمل چسپاں ھوتی جس پر سنہری روپہلی سکے عجب بہار
ھاتے ۔ تانبے کے سکے تھیلیوں میں بند ھوتے تھے ۔ ایک تھیلی میں
، بادشاہ کے سکے ھوتے اور اوپر اس کا نام لکھا ھوتا ۔ بعض اھم
،نوں کے لیے الگ الگ تھیلیاں ھوتیں ۔ مسکوکات کے معاملے میں
ں بڑی مہارت حاصل تھی ۔ اس فن پر انھوں نے چند مضامین بھی لکھے
ں ۔ر حیثیت دوسری مصروفیتوں کے پیش نظر انھیں اس طرف توجہ کا
ہ موقع میسر نہ آ سکا ۔ مشہور ماھر مسکوکات ایچ ۔ نلسن رائٹ
نام انھوں نے ۱۰ ۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو ایک طویل خط لکھا
میں اس کی کتاب ''سلاطین دھلی کے مسکوکات اور نظام وزن و
ں'' پر تنقید کرتے ھوئے ان مقامات کی نشان دھی کی جہاں مولف
ٹھوکریں کھائی ھیں اور اس کی غلطیوں کو درست کیا ۔ نیلسن اس
نے میں ان کی علمیت سے بہت متاثر ھوا اور اپنی بعض کتابیں انھیں
، کے طور پر بھیجیں ۔

انھیں اس چیز کا ھمیشہ افسوس رھا کہ ابتدا میں ان کی مجبوری
وجہ سے کئی نایاب چیزیں یورپ جا پہنچیں ۔ اس معاملے میں وہ
وطنوں کی نادانی اور قدر ناشناسی کے بھی شاکی تھے ۔ یہی وجہ تھی

کہ وہ اپنے عتیقات کے مجموعوں کو ہر قیمت پر ہندوستان میں اور خاص طور پر لاہور میں رکھنا چاہتے تھے ۔ ممکن تھا کہ انہیں باہر سے یہاں کے مقابلے میں کئی گنا قیمت مل جاتی لیکن یہ انہیں ہرگز منظور نہ تھا ۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنا مجموعۂ ... معمولی قیمت [سترہ ہزار] پر یونیورسٹی کے حوالے کر دیا ۔ اس میں ۲۱۰۰ قلمی اور ۱۷۰۰ مطبوعہ کتابیں شامل تھیں ۔ اگرچہ ان سے جدائی انہیں بڑی شاق گزری لیکن ان کی صحت دگرگوں ہوچکی تھی اور احمر صاحب پر انہیں اعتماد نہ تھا ۔ اس مجموعے کا تعارف کراتے ہوئے مولوی شمیع صاحب کو ۲۹ ۔ مارچ ۱۹۳۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :

''اکثر کتابیں فارسی کی ہیں اور فارسی کی ورکنگ لائبریری کا مقصد ادا کرتی ہیں ۔ ان میں ناقص اور مکمل دونوں طرح کی کتابیں ہیں ۔ اکثر کی جلد بندی کی ضرورت ہے ۔ میں نے یہ کتابیں ایک ہندوستانی علم پرست کے نقطۂ نظر سے جمع کی ہیں جن میں ہندوستانی تالیفات اور ہندوستانی خط قدیم پر ایک خاص نگاہ رکھی ہے ۔ بعد خرابی بسیار میں نے اس خط کا پتا لگایا ہے اور میری آرزو ہے کہ میں اس خط کی جو مغلوں کی آمد سے قبل تمام ہندوستان میں رائج تھا ، رام کہانی سناؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدت سے میرا ارادہ ہے کہ میں ہندوستان میں اس خط کے ارتقا کی داستان دنیا کے سامنے پیش کروں ، مگر ضروری نمونوں کے فقدان کی بنا پر میرا ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت تک میں نے بہ دقت تمام ساٹھ ستر کے قریب اس خط کے نمونے جمع کر لیے ہیں ۔ [انشا ؟] کے فن پر میں نے خاص کوشش کرکے ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا جس کی تعداد قلمی اور مطبوعہ یقیناً ایک سو سے زیادہ ہوگی ۔ یہی حالت بچوں کے تعلیمی نصابوں کی ہے ۔ ان تینوں گذشتہ امور میں کوئی لائبریری میرے حقیر مجموعے کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ لغات ، ادب ، درج ، تذکروں ، انشا اور بیاضوں میں میرا مجموعہ دوسری لائبریریوں سے کسی حال میں کم نہیں ۔''

وہ چاہتے تھے کہ وطن روانہ ہونے سے پہلے لاہور میوزیم ان کا مجموعۂ مسکوکات حاصل کر لے تاکہ ان کی عمر بھر کی کاوش اسی شہر میں رہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی نے بھی کوشش کی لیکن بد قسمتی سے پنجاب گورنمنٹ آمادہ نہ ہوئی اور اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور چھوڑتے وقت وہ یہ مجموعہ ساتھ لے گئے۔

لاہور سے وہ سیدھے ٹونک پہنچے اور اپنے آبائی مکان میں اترے۔ عرصے سے مکان کی مرمت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اس سے فراغت حاصل کی۔ ٹونک میں بارشوں کی افراط کی وجہ سے برسات کا موسم بڑا سہانا ہوتا ہے۔ اس سے ان کی طبیعت بشاش ہوگئی۔ مولوی عبدالحق صاحب دیر سے مصر تھے کہ ملازمت سے فارغ ہوتے ہی وہ دہلی آئیں اور اپنے مضامین کے بعض سلسلوں کو نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں لائیں تا کہ انجمن انھیں شائع کرا سکے۔ علاوہ ازیں وہ احمر صاحب کو بھی ترجمے کے کام کے سلسلے میں بلانا چاہتے تھے۔ چناں چہ ۱۷ اکتوبر ۴۱ء کو انھوں نے مولوی صاحب کے نام خط میں لکھا:

> ''میں عید کے بعد مع داؤد حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ یہاں آ کر میں اور کاموں میں مصروف ہو گیا تھا جن میں مکان کی مرمت زیادہ اہم تھی۔ موسم یہاں خوش گوار ہو گیا ہے۔ خدا نے یہاں آ کر لاہور کی گرمی سے نجات دی۔''

عیدالفطر ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کے بعد گئے ہوں گے۔ وہ کوئی دو ماہ دہلی میں مقیم رہنے کے بعد ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں عید الاضحیٰ سے قبل وہاں سے لوٹ آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سخت سردی کے سبب ان کے سانس کا مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔ سردیوں میں شام کے وقت بڑے شہروں پر معلق ہونے والا دھواں ان کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا۔ جاڑوں کا موسم ٹونک میں گزارنے کے بعد وہ ۴۲ء کے موسم بہار میں پھر دہلی چلے گئے اور وہاں کئی ماہ مقیم رہنے کے علاوہ کچھ دن لاہور میں گزار کر واپس آئے۔

ٹونک میں انھوں نے مکان کی دوسری منزل پر ڈیرہ جما رکھا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں ان کے سکے ، ہتھیار اور دوسرے آثار عتیقہ عجائب گھر کا نظارہ پیش کرتے تھے ۔ دوسرے کمرے میں ایک جانب ان کا پلنگ بچھا ہوتا جس پر بیٹھے اپنے کام میں منہمک رہتے ۔ اگر کوئی ملنے والا آ جاتا تو اسی پلنگ کے قریب چند کرسیاں ڈال دی جاتیں ۔ بستر پر ان کے ارد گرد کتابیں بکھری ہوتی تھیں اور کاغذ قلم دوات رکھے رہتے۔ وہ ہمیشہ ریم کی نب سے لکھا کرتے اور اکثر سوان انک استعمال کرتے تھے ۔ فاؤنٹن پین سے لکھتے انھیں کبھی نہ دیکھا ۔ ممکن ہے کہ کالج میں اس سے بھی کام لیتے ہوں ۔ قریب ہی ایک کونے میں میز پر مختلف دوائیں چنی ہوتیں ۔ ان میں ضیق النفس کے مستقل علاج کی دوائیں ، دورہ پڑنے کی صورت میں ہنگامی تسکین کی دوائیں اور مقویات ہوا کرتی تھیں ۔ انگریزی اور یونانی دونوں قسم کی ادویات موجود ہوتیں ۔ ویمپول کی فاسفولیسیتھن ہمیشہ استعمال کرتے تھے ۔ خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا اور حکیم ارشد والا کے علاوہ کشتۂ فولاد بھی موجود رہتا ۔ ان کے دوست اور مداح بھی نسخے روانہ کرتے رہتے تھے ۔

فارسی کی ابتدائی کتابوں کے بعد انھوں نے مجھے گلستاں سعدی شروع کروا دی تھی ، لیکن اسے مکمل کرنے کی سعادت مجھے حاصل نہ ہو سکی ، کیوں کہ بعد میں طبیعت زیادہ خراب رہنے کی وجہ سے وہ مجھے سبق لینے کے لیے اختر صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے ۔ جب تک ان کی طبیعت ٹھیک رہی وہ مغرب کے بعد ہم بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر سیر کو نکل کھڑے ہوتے ۔ ہم دونوں اپنی تین پہیوں کی سائیکلوں پر سوار ہوتے اور وہ ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے میں ٹارچ پکڑے پیدل چلتے۔ شہر سے باہر پرسکون سڑکوں پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پھرنے کے بعد واپس ہوتے۔ راستے میں دو ایک جگہ چند منٹ دم لینے کو ٹھہر بھی جاتے۔

مکان کی نچلی منزل میں اختر صاحب اور دیگر افراد خانہ رہتے تھے ۔ اختر صاحب ان کا بے انتہا ادب کرتے اور بے حد ڈرتے تھے ۔

نہ کبھی انھوں نے سامنے بلایا نہ انھوں نے جانے کی جرأت کی ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ان کو کسی ادبی معاملے میں ان سے مشورہ لینے کی ضرورت پڑ جاتی ۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک رقعے پر بلا تخاطب زیر بحث مسئلہ لکھ دیا کرتے اور مہرے یا گھر کے کسی اور فرد کے ہاتھ نیچے بھیج دیتے ۔ اختر صاحب فوراً اس کے متعلق چھان بین اور غور و خوض کرکے اپنی رائے تحریر کر دیتے لیکن مارے خوف کے کاغذ پر بھی مخاطب کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے ۔

کتابیں خریدنے کا سلسلہ ٹونک میں بھی جاری رہا ۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شخص کتابیں دکھانے آتا رہتا ۔ کوئی کام کی کتاب ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے ۔ کبھی کبھی اپنے سکے لے کر بیٹھ جاتے اور گھنٹوں مطالعہ کرتے رہتے ۔ یہ سلسلہ کئی دن جاری رہتا ۔ اس میں ایسے منہمک ہوتے کہ کھانا تک یاد نہ رہتا ۔

موسم سرما کی آمد پر مرض کی شدت پھر بڑھ گئی ۔ مولوی عبدالحق صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

”آج چار دن سے میں اپنی حالت میں بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں ۔ پچھلے سال بھی تقریباً یہی حالت ہو گئی تھی ۔ میں نے بس چار دن متواتر کوشش کی کہ اگر رات کو نہیں چل سکتا تو دن کو تین بجے کے قریب پھر لیا کروں ۔ لیکن اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ نہیں چل سکتا ۔ پسینہ آ جاتا ہے اور جسم جواب دے دیتا ہے ، دل بیٹھنے لگتا ہے ، تنفس میں تکلیف بڑھ جاتی ہے ۔ سردی یہاں بھی بڑھ گئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں بہت زیادہ ہے ۔“

سردیاں نکلنے پر ان کی طبیعت سنبھل گئی لیکن اس موذی مرض کی وجہ سے ان کی صحت گھڑی ماشہ گھڑی تولہ ہو گئی تھی ۔ ایسی حالت میں وہ اپنا شکار کا مشغلہ بھی جاری نہ رکھ سکتے تھے ۔ شغل کے طور پر ۴۳ء کے موسم بہار میں دریائے بناس کے ککراج گھاٹ پر بندہ جانباز کے قریب انھوں نے خربوزوں کی باڑی خریدی ۔ یہ چونکہ

شہر سے کوئی تین میل دور تھی - پہاڑی راستہ نہایت حسین اور دریا کا نظارہ بڑا دل کش تھا - دریا کی ریتی پر فالیز کے قریب انہوں نے سرکنڈوں کا ایک کمرہ نما جھونپڑا تیار کروایا - روزمرہ کی ضروریات اور ان کا پڑھنےلکھنے کا ساماں وھاں پہنچ گیا - آمد و رفت کی آسانی کے لیے جوڑی تانگا خریدا - کسی ضروری کام کے سوا شہر نہ آتے تھے - دستور یہ ھوتا کہ ھم بہن بھائی دن بھر پڑھائی سے فارغ ھونے کے بعد عصر کے وقت چھوٹی دادی جان کے ھمراہ کھانا وغیرہ لے کر تانگےمیں ندی روانہ ھو جاتے - ناگوری بیل ھوا سے باتیں کرتے - ندی پر غروب آفتاب کا نظارہ بلا کا خوب صورت ھوتا - رات وھاں کے پرسکون ماحول میں بسر کرتے ، صبح ڈھیروں خربوزے اترتے - ایک پہر دن چڑھے تانگے کی ٹھوکر خربوزوں سے بھروا ھم لوگ شہر روانہ ھو جاتے - یہ خربوزے اپنے گھر کے علاوہ عزیزوں دوستوں کے ھاں بھجوائے جاتے - چھٹی کے دن ھماری عید ھوتی کیوں کہ دن کو بھی ندی پر رھنے کا موقع ملتا تھا - جس کسی کو ان سے ملنا ھوتا ندی پہنچ جاتا - ٹونک میں ان کے جاننے والے گھر سے پتا کیے بغیر اپنے تانگوں میں سیدھے وھیں آتے - کوئی دن ایسا جاتا تھا کہ ان کے پاس کوئی عزیز یا مہمان نہ ھو - شہر میں ھیضےکی وبا پھیلی تو بہت سے عزیزوں کو وھیں بلوا لیا - کھانا بھی ندی پر تیار ھونے لگا - گویا شہر سے تعلق اور بھی کم ھو گیا -

اسی سال انہوں نے مولوی عبد الحق صاحب کو خربوزے کھانے کے لیےٹونک آنے کی دعوت دی - ۱۹ - اپریل کو انھیں ایک خط میں لکھتے ھیں :

"آپ جے پور تک تو آتے رھتے ھیں ، ٹونک نے کیا قصور کیا ھے - اس مرتبہ اگر آپ کی بوڑھی ھڈیاں سفر کی صعوبت برداشت کر سکیں تو اس دارالاسلام کی زیارت کریں - مجھے ابھی جلدی نہیں ھے - خربوزے چل گئے ھیں لیکن اگلے مہینے سے کام کے ھوں گے - اس وقت تشریف لائیے تاکہ آپ یہ بہشتی میوہ جس

قدر کھا سکیں فالیز پر کھائیں اور اس امید میں نہ رھیں کہ آپ
کا حصہ گھر بیٹھے آپ کو پہنچ جائے گا ۔''

مولوی صاحب نے آنے کا وعدہ کیا لیکن جب ان کے آنے میں دیر
ہوئی تو انھوں نے پارسل کے ذریعے خربوزے دھلی روانہ کیے ۔ اس کی
رسید کے طور پر مولوی صاحب نے لکھا :

''خربوزوں کا پارسل پہنچا ۔ کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں ۔ آپ
نے گھر بیٹھے یہ نعمت پہنچا دی ۔ میرا خط پہنچا ہوگا ۔ ہم تو
خود وھاں آ کر خربوزے کھانا چاہتے تھے ۔ انشاءاللہ ضرور
آئیں گے ۔''

غرض مولانا اسی موسم میں مع سید ہاشمی صاحب مرحوم تشریف
لائے اور بیس دن قیام کیا ۔ اس موقع پر خصوصی انتظامات کیے گئے ۔ ندی
پر بہت سا فرنیچر پہنچایا گیا ، ارد گرد ریت پر دریاں بچھائی گئیں ،
راوٹی کھڑی کی گئی ۔ مولوی صاحب کا بے اختیار ہو کر یہ کہنا مجھے
آج تک یاد ہے : ''ظالم تو نے جنگل میں منگل کر دیا'' ۔ مولانا صبح
شہر چلے جاتے اور وھاں مجلسوں اور تقریبوں میں شرکت کرنے کے
بعد عصر سے پہلے ندی پہنچ جاتے ۔ بیس دن بڑے پر لطف گزرے ۔
جاتے وقت انجمن کے لیے چند قلمی کتابیں اور کچھ روپیہ مولانا کی نذر
کیا ۔ لاھور کے بعض دوستوں کو بھی خربوزے بھیجے لیکن سفر
لمبا ہونے کی وجہ سے وہ اچھی حالت میں نہ پہنچ سکے ۔

خربوزوں کا موسم ختم ہونے کے بعد جون میں وہ دھلی گئے ۔
وھاں سے رام پور کا چکر بھی لگایا ، لیکن امسال وہ زیادہ دیر دھلی نہ
ٹھہر سکے اور صحت کے ھاتھوں مجبور ہو کر انجمن سے استعفا دے
کر چلے آئے ۔

سیلاب کا موسم آنے سے پیشتر جھونپڑے کو ندی کے درمیان سے
اٹھوا کر کنارے پر رکھوا لیا تھا ۔ وہ اب بھی وھاں جاتے تھے لیکن
دن بھر ٹھہر کر شام سے پہلے گھر چلے آتے ۔ ۲۹ ۔ اگست کو پروفیسر
اقبال صاحب کو لکھتے ہیں :

''آپ فرماتے ہیں کہ لاہور آج کل جہنم کا نمونہ بن رہا ہے، تو آپ وہاں کیوں پڑے ہیں، یہاں تشریف لے آئیے۔ یہاں حالت یہ ہے کہ گرمیاں اس سال میں نے ندی میں گزاریں، بڑے لطف سے گزریں۔ راتوں کو نہایت پر لطف موسم ہوتا تھا اور چادر اور دلائی اوڑھنی پڑتی تھی۔ گرمی کے چند دن میں نے وہی دیکھے جب میں دھلی اور رام پور میں تھا۔ ٹونک میں ایک رات بھی گرم مجھے یاد نہیں۔ دھلی سے واپسی کے بعد میں مستقلاً گیارہ بارہ بجے دن کے ندی آ جاتا ہوں۔ یہاں دریا کے کنارے کے قریب پھوس کا ایک جھونپڑا ڈلوا لیا ہے۔ آس پاس کھیت ہیں اور بیچ میں ماندولت کا جھونپڑا، ہم جس میں فرعون بے ساماں بنے بیٹھے ہیں۔ دل میں آئی سو گئے ورنہ کتاب دیکھتے رہے یا اپنا کام کرتے رہے۔ برسات کی وجہ سے منظر نہایت پر لطف ہے۔ ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو سرتاپا سبز ہے، دوسری طرف ندی ہے جو جنوبی سمت سے آ کر موڑ کھاتی ہوئی شمالی رخ سے ہوتی ہوئی مشرق میں نکل گئی ہے۔ تازہ ہوائیں ہر وقت چل رہی ہیں۔ عصر سے خنکی ہو جاتی ہے۔ رات کو معلوم نہیں کیا حالت رہتی ہے۔ میں تو مغرب کے وقت یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں اور گھر پہنچ جاتا ہوں۔ پچھلے چار پانچ روز سے پھر بارش شروع ہو گئی ہے۔ سورج مہاراج گاھے ماھے گھنٹے دو گھنٹے کے واسطے، وہ بھی حاضری دینے کی غرض سے آ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ندی کے پانی اور اس کی ہوا نے میری صحت میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔''

ندی کی آب و ہوا کو اپنی صحت کے لیے مفید پا کر انھوں نے وہاں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ اس غرض سے اس کے کنارے اپنی جھونپڑی سے کچھ دور زرعی اراضی کے چند قطعات خرید لیے۔ ارد گرد کے ہندو کسانوں سے وہ ان ٹکڑوں میں بھی کاشت کروا لیتے اور انھیں اچھا معاوضہ دیتے۔ علاوہ ازیں وہ ان لوگوں کو ضرورت کے وقت قرض حسنہ کے طور پر چھوٹی چھوٹی رقمیں دے دیتے۔ اس سے وہ

ساھوکاروں کے ظلم سے نجات پا گئے ۔ ان باتوں سے وہ لوگ ان کی عزت پرستش کی حد تک کرنے لگے ۔ وہ سب انہیں بابو جی کہتے تھے ۔ زمین کے ٹکڑوں سے انہیں کوئی مالی فائدہ مقصود نہ تھا ۔ چنانچہ وہ اس میں اکثر چیزوں کی دل جسپی کی چیزیں لگوایا کرتے، مثلاً مونگ پھلی ، شکر قندی وغیرہ - اس سے حاصل کردہ فصل وہ مزارعین کے ساتھ فراخ دلی سے تقسیم کرنے کے بعد اوربا میں بانٹ دیتے ۔ البتہ تانگے کے بیلوں کا چارہ انہیں زمین سے حاصل ہو جاتا تھا ۔ اس زمین کے نزدیک انھوں نے ایک نئی جھونپڑی تیار کرائی اور اس کے ساتھ جستی چادریں کھڑی کرکے باورچی خانہ بنوایا ۔

انجمن ترقی اردو سے معاہدے کے تحت انھوں نے اپنے بعض مسلسل مقالات پر نظر ثانی کی جو انجمن نے کتابی صورت میں شائع کروائے ۔ ان میں ''تنقید شعر العجم'' ، ''پرتھی راج راسا'' اور ''فردوسی پر چار مقالے'' شامل ھیں ۔ ۱۹۴۴ء کی ابتدا میں انھوں نے ''خالق باری'' کی ترتیب مکمل کی اور اس کا مسودہ مارچ میں مولوی صاحب کی خدمت میں روانہ کیا ۔ علاوہ ازیں مولانا محمد حسین آزاد اور دیوان ذوق سے متعلق ایک مضمون سپرد قلم کیا جو انھوں نے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کو روانہ کیا ۔ یہ مضمون رسالہ ''ھندوستانی'' میں متعدد قسطوں میں شائع ھوا ۔

دسمبر ۴۳ء میں انہیں ضیق النفس کے شدید دورے پڑنا شروع ھوئے ۔ کچھ دن کے وقفے سے یہ دورے پڑتے ۔ سانس ان کے سینے میں نہیں سماتا تھا اور دھونکنی کی طرح اس کے چلنے کی آواز آتی ۔ ساتھ ھی پسینے چھوٹنے لگتے اور کپکپی طاری ھو جاتی ۔ دورے کی حالت میں وہ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے اور بری طرح ھانپنے لگتے ۔ یہ دورے بڑے خوف ناک تھے اور وہ ان سے بڑا گھبراتے ۔ ان کے علاج کی خاطر وہ جنوری ۱۹۴۴ء میں جے پور گئے ۔ جس دن وھاں پہنچے بڑا سخت دورہ پڑا جس سے خلاف معمول کئی گھنٹے بے ھوش رہے ۔ وھاں کے ھسپتال میں دو ھفتے سے زیادہ ان کا علاج ھوا ، اس سے انہیں کافی

افاقہ ہوا اور عارضی طور پر دورے رک گئے - فروری کے دوسرے ہفتے میں وہاں سے گھر لوٹ آئے - چند ہی دن بعد پھر دورہ پڑا - اس کا ذکر کرتے ہوئے ۱۳ - فروری کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں :

"بد قسمتی سے کل ساڑھے بارہ بجے رات کے پھر دورہ پڑ گیا - ڈیڑھ دو گھنٹے سخت تکلیف رہی - ڈاکٹر نے بیس منٹ کے فاصلے سے دو مرتبہ انجکشن کیا تب کہیں تکلیف میں تخفیف ہوئی - سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور لرزہ جسم پر الگ چھا گیا - چناں چہ آج بھی ایک دن گزر جانے کے بعد لرزہ جسم پر موجود ہے - میں یہ خط آپ کو بڑی تکلیف میں لکھ رہا ہوں -"

سردیاں گزر جانے پر حسب معمول ان کی بیماری میں کمی آ گئی - دورے گو مئی تک جاری رہے لیکن ان کی وہ شدت باقی نہ تھی ; علاوہ ازیں ان کا درمیانی وقفہ بھی بڑھ گیا تھا - اس سال انھوں نے بڑی تیاریوں سے خربوزوں کی کاشت کروائی - دور دور سے بیج منگوائے؛ چناں چہ لکھنؤ سے سمیدوں کے بیج آئے- کنارے والی جھونپڑی چوں کہ مستقل کر دی گئی تھی اس لیے فالیز کے ساتھ ایک چھوٹی سی عارضی جھونپڑی کھڑی کروا لی - اسی موسم بہار میں اپنی زمین کے دو ٹکڑوں میں جو ندی کے عین کنارے پر واقع تھے ، انھوں نے امرود اور انار کے پودے لگوائے - الہ آباد کے امرود مشہور ہیں ' چناں چہ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی صاحب کے توسط سے وہاں سے امرودوں کی اعلیٰ اقسام کے بیج منگوائے - پودوں کو پانی کی ہر وقت بہم رسانی کی غرض سے ندی کے کنارے جھلار لگوائی -

اکتوبر، نومبر ۱۹۴۴ء میں وہ تین بار ملیریا میں مبتلا ہوئے جس سے نقاہت بہت بڑھ گئی - ان کے دوست انھیں نسخے روانہ کرنے کے علاوہ دمے کے کامیاب معالجوں کا پتا لگاتے رہتے تھے - چناں چہ انھی دنوں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے پونے سے بیجا پور کے کسی مرہٹہ ڈاکٹر کے متعلق لکھا جو دمے کے علاج کا ماہر بتایا جاتا تھا - ۲۱ - نومبر کو اس کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

'دمے کے ماہر سول سرجن بیجا پور کے متعلق ذرا اور تحقیق کرلو ، اگر قریب ہے تو جا کر دریافت کرو ۔ مجھ کو اب یعنی دسمبر سے دورے اٹھنے لگے ہیں ۔ اس سال مئی تک دورے اٹھتے رہے ۔ اس کے بعد غالباً برسات کے اثر میں بند ہوگئے ۔ اب دسمبر سر پر کھڑا ہے اور میں کانپ رہا ہوں ۔

ایک بات یہ معلوم کیجیے کہ چوں کہ ان علاقوں میں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لیے مجھے دورے اٹھتے ہیں ۔ اگر ایسے علاقے میں مثلاً بمبئی ، کراچی ، یا دکن ، پونا وغیرہ جہاں سردی نہیں ہوتی ، چلا جاؤں تو کیا یہ دورے بند ہو جائیں گے یا ان کی شدت کم ہو سکے گی ؟ . . . . . . ایک بات اور رہ گئی کہ اگر یہ امر ثابت ہو کہ علاج ہوسکتا ہے اور بیجا پور کے سول سرجن ایسے کام میں بے نظیر ہیں تو جناب ڈاکٹر صاحب آپ کو مجھے لے جانا پڑے گا کیوں کہ میری ایسی حالت نہیں رہی کہ تنہا سفر کر سکوں ، بالخصوص ایسا لمبا سفر ۔ یہ بھی یاد رہے کہ صرف نومبر ہی ایسا مہینہ ہے جس میں میں سفر کرسکتا ہوں ۔ اگلے مہینے میں سردی کی شدت ہو جائے گی اور میں دس قدم بھی نہیں چل سکوں گا ۔''

لیکن اس سال وہ باوجود کم زوری کے کافی مدت تک دوروں سے محفوظ رہے ۔ انھی دنوں انھوں نے نے نوأسامی والا مضمون قبال صاحب کو بھجوایا ۔ بلکہ بہ شرط صحت اور مضمون روانہ کرنے کا وعدہ بھی کیا ۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے ہندوستانی اکیڈیمی کی جانب سے انھیں ایک سلسلۂ خطبات دینے پر رضا مند کرنا چاہا ۔ ن کو جواب میں لکھتے ہیں :

''سالانہ لیکچروں کے سلسلے میں اکیڈیمی میں میرا نام تجویز کرنے کا آپ کا ارادہ میری عین عزت افزائی ہے جس کا میں حقیقت میں مستحق نہیں ۔ بھلا میں ایسے خدا ساز امر سے کیوں انکار کرنے لگا ، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی یہ دعوت میرے حق میں :

نوشدارو کہ پس از مرگ بہ سہراب دھند
نہ ثابت ہو۔''

اپریل ۱۹۴۵ء میں ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اپنے سکوں کے مجموعے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بطور امانت رکھی ہوئی چیزوں کی فکر ہوئی۔ وہ ناچار انویں ٹھکانے لگانے پر آمادہ ہوگئے۔ ۱۵۔ اپریل کو پروفیسر اقبال صاحب کو ایک خط میں پہلے اپنی بیماری کی تفصیل لکھی ہے:

''میری خرابی صحت بڑھتی جاتی ہے۔ رات کو بارہ بجے کھانسی اور زکام کا حملہ ہوگیا۔ دو گھنٹے کے بعد نیند آ سکی۔ صبح آٹھ بجے سے دل پر درد شروع ہوا، خاصہ دیر ہوگیا اور اب تک ہے۔ . . . . . . اب صرف گھہرے سانس کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ آج ہی بارہ بجے دن کو پھر زکام اور کھانسی شروع ہوگئے۔ ساتھ ہی بخار ہوگیا لیکن ہلکا۔ اب آپ ہی دیکھیں میری صحت اگر تماشا نہیں تو اور کیا ہے۔''

اس کے بعد اس خط میں لائبریری والی امانتوں کے متعلق ہدایات ہیں۔ مثلاً یہ کہ قدیم دستاویزات، اسناد اور خالصہ دربار کے مکاتیب لائبریری کو قیمتاً دے دیں۔ خطاطی کے نمونے، مرقع تصاویر اور پتھر اپنی تحویل میں لے لیں وغیرہ۔

ان کے مجموعۂ مسکوکات میں کوئی پونے دو سو سونے کے، پانچ ہزار چاندی کے اور تین ہزار سے اوپر تانبے کے خاص سکے تھے۔ علاوہ ازیں تانبے کے زائد سکے اور مکررات وزن میں ایک من سے بھی زیادہ تھے۔ مولوی محمد شفیع صاحب نے ۱۹۴۵ء کی ابتدا میں ان کے سکوں کا مجموعہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ صرف چاندی اور تانبے کے سکے لینا چاہتے تھے۔ ان کو خط میں لکھتے ہیں:

''میرے مسکوکات کا مجموعہ بدستور موجود ہے۔ لاہور چھوڑ دینے کے بعد اس میں اضافہ بہت کم ہوا ہے۔ میرے پاس خریدار بھی آئے جو تمام مجموعے یا ایک حصہ خریدنا چاہتے تھے لیکن

اب تک میں نے انکار کیا اور ابھی تک اس خیال کا حامی ہوں یعنی اس سے جدا ہونے پر تیار نہیں ۔

اب آپ کا عظمت نامہ آتا ہے ۔ میں حیران ہوں کہ کیا جواب دوں ۔ گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل ۔ لیکن میں اپنے مجموعے کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر تیار نہیں ہوں ۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میں اسے زیادہ عرصے تک محفوظ رکھنے پر قادر نہیں رہوں گا ، تاہم آپ کو مشورہ دوں گا کہ اگر آپ ارادہ کرتے ہیں تو پورے مجموعے کے واسطے تیار ہوں ۔ سکہ شناسی کے فن میں تینوں قسم کے سکوں کا موجود ہونا ضروری ہے ۔ خالی تانبا یا خالی چاندی یا دونوں سے کام نہیں چلے گا ۔ یہاں تو خانہ در خورد پیل ہونا چاہیے ۔ ساتھ ہی مجھے اس قدر موقع دینا چاہیے کہ میں ان سے جدا ہونے پر تیار ہو جاؤں ۔ آپ اشرفیوں سے گھبراتے ہیں ۔ میرے پاس اشرفیوں کے گاہک زیادہ آتے ہیں ۔"

آخر انھیں مولوی صاحب موصوف کی خواہش کے آگے سرتسلیم خم کرنا پڑا جنھیں وہ عزت سے پیر جی کہا کرتے تھے ، یعنی وہ مجموعے کے ٹکڑے کرنے پر راضی ہوگئے لیکن مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑی ، یہ قصہ انھی کے الفاظ میں سنیے ۔ پروفیسر امال صاحب کو لکھتے ہیں :

"پیر جی کا تلطف نامہ آپ کے ملاحظے کے واسطے ملفوف ہے ، دیکھ کر واپس کر دیجیے ۔ میں نے پانچ ہزار چاندی کے سکوں اور تین ہزار تانبے کے سکوں کے دس ہزار مانگے تھے اور یہ موجودہ بازار کو دیکھتے ہوئے سستی قیمت ہے ۔ لیکن انھوں نے اس رقم کا نصف دینا منظور کیا ہے ۔ ایک ادنیٰ امر یہ ہے کہ ٹونک کا روپیہ جسے ریاست ٹونک نے تین سال ہوئے بند کردیا ہے اور جو انگریزی سکے کے مقابلے میں ہمیشہ پانچ آنے کا بٹہ کھاتا تھا ، آج کل بازار میں صرف چاندی کے لحاظ سے اس کی قیمت

ڈیرھ روپیہ انگریزی ہے ۔ مغلوں اور قبل مغل سکوں کی قیمت
تو اس سے بہت زیادہ ہے ۔ میں اس بارے میں پیر جی سے بحث
کرنی خلاف ادب سمجھتا تھا ۔ دل کڑا کر کے اور ڈھیٹ بن کے
انکار تو کر دیا ہے مگر بے حد شرمندہ ہوں ۔ اور میں بھی
کیا کروں ۔ میری یہ روبہ مزاجی بر بنائے احتیاج ہے ۔ چند
یوم میں صرف انھی سکوں پر میرے اخراجات کا دار و مدار
ہوگا ۔ پراویڈنٹ فنڈ تو نصف سے زیادہ لاہور ہی میں ختم ہو چکا
تھا ، باقی کتابوں کی قیمت سے یہ چار سال گزارے ۔ اب خرچ
بڑھ رہا ہے ، صحت تباہ ہو رہی ہے ۔ اب جب ناداری بالکل
قریب آ رہی ہے مجبوراً بخیل بن رہا ہوں ۔ اس کا مجھ کو افسوس
ہے اور شرم بھی ۔''

آخر کار پٹنے کے ایک مارواڑی سیٹھ رادھا کرشنا جالان ان کا
مجموعۂ مسکوکات حاصل کرنے کے لیے ٹونک آئے اور تئیس ہزار روپے
کے عوض انھوں نے بڑی حسرت کے ساتھ اس مجموعے کو
الوداع کہا ۔ اس کے ساتھ ہی دو تین قلمی کتابیں بھی تھیں
جو سکوں کے مطالعے میں اہمیت رکھتی تھیں ۔ رقم کی وصولی
کے لیے وہ جے پور تک جالان کے همراہ گئے ۔ مسٹر جالان اس مختصر
ملاقات میں ان سے بہت متاثر ہوئے اور پٹنہ پہنچ کر انگریزی میں
ایک عقیدت مندانہ خط لکھا جس میں انھیں پٹنے آ کر اپنا کتب خانہ
دیکھنے کی دعوت دی ۔ اس کا انگریزی میں جواب دیتے ہوئے انھوں
نے جون ۱۹۳۵ء میں لکھا :

''میرے سکے میرے بہترین ساتھی تھے جن کی صحبت میں
میں کئی کئی گھنٹے بلکہ دن صرف کیا کرتا تھا ۔ وہ مجھے بہت
یاد آتے ہیں ۔ آپ کا کتب خانہ دیکھنے کا میں بہت مشتاق ہوں
لیکن اتنے لمبے سفر کا مسئلہ کیوں کر حل ہوگا ۔''

اب ان کی علمی دل چسپی کے مراکز ایک ایک کر کے ساتھ
چھوڑ چکے تھے اور بے دلی اور تھکن ان پر غلبہ پا رہی تھی ۔
۱۹ - مئی ۱۹۳۵ء کو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کو لکھتے ہیں :

"میری صحت پہلے سے بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے ۔ رات کو بارہ بجے سے ہانپنی لگ جاتی ہے ۔ صبح تک لگی رہتی ہے ، بیٹھ کر گزارا کرنا پڑتا ہے ، نیند نہیں آتی ۔ ایک آدھ دفعہ دورہ بھی پڑگیا ۔ پرسوں پڑا تھا . . . . میں عنقریب اگر زندہ رہا تو صاحب فراش ہو جاؤں گا ، چلنا پھرنا تو ویسے ہی بند ہے ۔ آپ کے کام کی کوئی کتاب اگر آئی تو میں خرید رکھوں گا . . . . آج کل خربوزوں کا موسم ہے ، آتے ہو تو آجاؤ ۔ ابھی میں زندہ ہوں ، بعد میں تمھیں یہاں کون پوچھے گا ۔"

اسی طرح پروفیسر فضل الدین صاحب قریشی کو جو جون کے مہینے میں ٹونک آنے کا ارادہ کر رہے تھے ، اپنا پروگرام اگلے سال تک ملتوی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ۔ اس خط میں زندگی سے نا امیدی کی کیفیت کا اظہار ہے :

"میں نے آپ کو مئی میں بلایا تھا ، اس وقت موسم ٹھیک تھا ۔ خربوزے موجود تھے ، فالیز میرے ہاں بھی تیار تھی ۔ اب خربوزے بالکل غائب ہیں ، فالیزیں جل کر آندھیوں کے حوالے ہوئیں ۔ لاہور سے ٹونک تک آنے کی تکلیف کے بعد کچھ تو نعم البدل ملنا چاہیے ، اس لیے مہربانی کر کے اپنی آمد کا ارادہ آیندہ مئی ۱۹۴۶ء تک ملتوی رکھیے ۔ آپ مئی کے پچھلے پندرھواڑے میں آئیے ، یعنی ۱۵ ۔ مئی کو آ جائیے بہ شرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں جیتا ہوں ۔"

اس سال وہ زیادہ تر ندی ہی پر رہے ۔ چھوٹی دادی جان ان کے پاس رہتی تھیں اور ہم لوگ آتے جاتے رہتے تھے ۔ وہ قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور چارپائی پر بیٹھے مختصر سا کام کرتے یا دوستوں اور شاگردوں کے خطوں کے جواب دیتے ۔ ان کے احباب کے حلقوں میں ان کی مخدوش حالت کی بنا پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی ۔ پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں :

"والا نامہ ابھی ابھی موصول ہوا ۔ اس حالت میں بھی اپنے

نیاز مندوں کو نہ بھولنا معراج محبت اور میرے لیے باعث صد نازش و افتخار ہے ۔ اللہ پاک آپ کو صحت عاجل اور حیات خضری عطا فرمائے ورنہ یقین جانیے کہ آپ کے بعد خاکم بدھن سناٹا ہی سناٹا ہے ۔ اللہ پاک ادب و تاریخ ہی کے لیے آپ کو صحیح و سلامت رکھے۔ آمین ۔"

ان ہی دنوں انھوں نے ندی کے ڈھاوے پر ایک مختصر سا مکان بنوانا چاہا تاکہ جھونپڑی کی بار بار مرمت سے نجات ہو ۔ اس غرض سے بیس مکسرگز سرکاری زمین برائے نام قیمت پر حاصل کی ۔ یہ زمین ان کے لگوائے ہوئے باغ کے قریب ہی تھی ۔ مکان کی بنیویں کھدوائی گئیں لیکن تعمیر کی نوبت نہ آسکی ۔

۴۵ء کے وسط میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے انہیں علم عروض پر مارچ ۴۶ء تک ایک کتاب لکھنے پر آمادہ کیا ۔ اس سلسلے میں جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ برٹش میوزیم کی لائبریری تو ہے نہیں کہ انسان تمام دنیا سے بے نیاز ہو کر صبح کے آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک بیٹھا کام کرتا رہا اور جس کتاب کی ضرورت ہوئی دو منٹ میں حاضر کردی گئی ۔ یہ ہندوستان ہے جہاں کوئی جامع کتب خانہ موجود نہیں بلکہ اس کا تخیل تک مفقود ہے ۔ کتابوں کی تلاش میں انسان کو در در خاک بسر ہونا پڑتا ہے ۔"

اس کے بعد مجوزہ کتاب کا ایک مختصر خاکہ بیان کیا ہے پھر کہتے ہیں :

"اس کے لیے آیندہ مارچ تک تیار ہو جانا نہایت دشوار ہے ۔ آپ مارچ ۴۷ء تک مجھے وقت دیجیے ۔ بہرحال کام ہو تو اچھا ہو ، جلد بازی سے کیا حاصل ۔ میں اپنی بیماری کا بھی تو خیال کر رہا ہوں ۔ آج کل برسات میں شاید طبیعت درست رہے لیکن سردی بھی تو آ رہی ہے ۔"

اس منصوبے پر ان کی وفات کی وجہ سے عمل نہ ہو سکا ۔

کاشت کاری میں وہ تفریح کے طور پر نئے نئے تجربے کرتے تھے۔ برسات کے موسم میں پروفیسر اقبال صاحب کو لکھ کر سردے کے بیج منگوائے اور ان کو طریقۂ کاشت معلوم کرکے لکھنے کے لیے کہا۔ اسی خط میں اپنی صحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میری صحت جلد جلد گرتی جا رہی ہے۔ خدا جانے کانوں پر کیا مصیبت آئی ہے۔ پچھلے دو مہینوں سے بہرا ہو گیا ہوں۔ کھانے کے واسطے صرف دو ڈاڑھیں رہ گئی تھیں، اب دونوں نے ایک دم سے جواب دے دیا ہے۔''

۵۴ء کے آخری مہینوں میں ان پر عجب حسرت و یاس کا عالم طاری تھا۔ طبیعت کے اس اندوہ کا اظہار انھوں نے چند اشعار میں کیا۔ ان اشعار کا اندراج یہاں بے محل نہ ہوگا۔

آئی نسیم باغ میں مرغ سحر چلے
اے پا فگار اٹھ کہ ترے ہم سفر چلے

ظاہر ہوا اس آمد و شد کا نہ مدعا
آئے تھے بے خبر وہی ہم بے خبر چلے

پیٹا کیے نصیب کا لکھا تمام عمر
جس کام کو ہم آئے تھے وہ کام کر چلے

جاتے ہیں خالی ہاتھ گلستان دہر سے
اک سنگ آرزو ہے جو سینے پہ دھر چلے

اے رہرواں منزل ہستی بتاؤ تو
آئے ہو تم کہاں سے یہاں اور کدھر چلے

مت پوچھ بزم یار کا احوال ہم صفیر
ہنستے ہوئے ہم آئے تھے با چشم تر چلے

ہم ایسے ٹھہرے منزل فانی میں جس طرح
آئے سرا میں شب کو مسافر سحر چلے

فرصت ٹھہرنے کی نہ ملی باغ دھر میں
مثل نسیم ہم ادھر آئے اُدھر چلے

اللہ خیر کیجیو رہزن ہیں گھات میں
آتے ہیں لوگ قافلے کے بے خبر چلے

مجنوں و کوھکن گئے اور ہم بھی جائیں گے
یعنی وہ ہم سے چند قدم بیشتر چلے

ہر ہر قدم پہ ہے یہاں کھٹکا لگا ہوا
رہرو نہ راستے میں کبھی بے خطر چلے

ان کے علاوہ یہ شعر اور تھے :

مانا کہ تصرف میں ہے وہ ماہ سے لے تا ماہی
بے چین پھر رہا ہے جس سر پہ ہے تاج شاہی

لے توشۂ رہ ساتھ اپنے اور کوچ کی کر تیاری
تنہا تجھے جانا ہوگا ، ہوگا نہ کوئی ہمراہی

ہر شے ہے فنا آمادہ ادنیٰ ہو وہ یا ہو اعلیٰ
درویشوں کی کیا درویشی ، کیا شاہوں کی شاہنشاہی

شعر کہنا وہ کبھی کا چھوڑ چکے تھے لیکن جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے یہ اشعار موزوں کیے ۔ ان سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے ۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ وہ ان اشعار کو بلا ناغہ دن میں کئی کئی بار پڑھتے اور ترنم سے پڑھتے ۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں میں پھر رہا ہے ؛ ندی پر وہ اپنی چارپائی کے اوپر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہوتے ، دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے خلا میں نہ معلوم کیا تکا کرتے اور اسی حالت میں بڑی غم ناک آواز سے مندرجہ بالا اشعار گنگناتے ۔ انگریزی محاورے کے مطابق در اصل یہ ان کا ''ہنس کا نغمہ'' تھا ۔

سردیاں خدا خدا کر کے گزر رہی تھیں ۔ کبھی کبھی کوئی دورہ پڑ جاتا ۔ اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت ڈاکٹر کی ضرورت

پڑ جائے ، انھوں نے ندی پر رھنا ترک کر دیا تھا ۔ نیا سال شروع ھو گیا ۔ جنوری ۱۹۴۶ء کے وسط میں انھیں ایک اور تسوبس لا حق ھوئی ۔ حکومت نے ھزار روپے کے نوٹوں پر پابندی عائد کر دی ۔ سکوں کی قیمت کے طور پر وصول شدہ رقم انھی نوٹوں کی شکل میں تھی اور ٹونک میں ان کی تبدیلی کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ چنانچہ انھیں یہ نوٹ لے کر جے پور جانا پڑا ۔ اتفاق سے وھاں بھی کامیابی نہ ھوئی ۔ ان کے دوست صاحب زادہ ولی احمد خان دھلی گئے ھوئے تھے ۔ ان کے صاحب زادے خلیل احمد خاں کو ساتھ لے کر انھوں نے بھی دھلی جانے کا ارادہ کیا ۔ ۱۷ ۔ جنوری کو باغ جنوری والا ، جے پور سے میرے نام ایک مختصر سا خط لکھا :

"میں رات کے دو بجے یہاں پہنچا ۔ یہاں مجھے کوئی کامیابی نہیں ھوئی ، سوائے اس کے کہ فارم ٹائپ کرائی ۔ آج رات کو خلیل میاں کے ساتھ دھلی جا رھا ھوں ۔ صاحب زادہ ولی احمد خاں وھیں ھیں ۔ شاید ان سے کار بر آری ھو سکے ۔ باقی خیریت ھے ۔"

لیکن وہ دھلی نہ جا سکے ۔ جے پور کے اسٹیشن پر تھے کہ دورہ پڑا ، بہت گھبرائے ۔ رقم خلیل میاں کے حوالے کرکے فوراً گھر لوٹ آئے ۔ بس اس کے بعد ان کی گری ھوئی طبیعت نہ سنبھلی ۔ دو چار دن گھر ٹھہر کر ایک دن دل گھبرانے لگا ۔ مجھے ، دادی جان کو اور اپنی ھمشیرہ کو ساتھ لے کر تانگے میں ندی پہنچ گئے ۔ چار پانچ روز وھاں رھے ۔ سردی غضب کی پڑ رھی تھی اس لیے واپس آنا پڑا ۔ انھی دنوں دھلی سے روپیہ آیا ۔ ٹونک میں جدید طرز کا کوئی بینک نہ تھا ۔ دو ھندو سیٹھ ساھوکارے کا کام کرتے تھے ۔ یہ اجمیر والے اور رتلام والے کرکے مشہور تھے ۔ باوجود کمزوری کے خود سوار ھو کر رتلام والوں کے ھاں گئے اور ھم بہن بھائیوں کے نام روپیہ جمع کروا کے آئے ۔

چند روز بعد ایک دن پھر ندی پر چلنے کو کہا ۔ دادی جان کے ایما پر میں نے عرض کی کہ باھر بادل ھو رھا ھے اور بارش کے آثار

ھیں ۔ خاموش ھو گئے لیکن دوسرے دن پھر اصرار کیا ۔ سہارا دے کر تانگے میں سوار کرایا گیا ۔ فرمانے لگے ''ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے کہ انسان دوسروں کا محتاج ھو جائے ۔'' اب ان پر غنودگی طاری رھنے لگی تھی ۔ اگلے دن پوچھنے لگے ''ھم کہاں ھیں'' بتایا گیا ۔ پھر دریافت کیا ''میں یہاں کیسے پہنچا'' عرض کیا ''ھم آپ کو تانگے میں لے کر آئے تھے''۔ بولے ''اچھا!'' اس سے پہلے متعدد بار اپنا مزار ندی پر بنوانے کا خیال ظاھر کر چکے تھے ۔ اس دن پھر تاکید کی ، کہنے لگے شہر کے قبرستان میں میرا دل گھبرائے گا ۔ دوسرے دن بولے ''مجھے شہر لے چاو، شفاخانے میں داخل کروا کے تم لوگ گھر چلے جانا ۔'' شہر لے کر آئے لیکن ھسپتال میں داخل نہیں کروایا ۔ گھر کی نچلی منزل میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا ، چناں چہ ایک عزیز نے گود میں لے کر اوپر پہنچایا ۔ یہ ۱۳- فروری کا واقعہ ہے ۔ ان کے متوفی دوست ڈاکٹر ڈیسائی کا چھوٹا بھائی بھی ڈاکٹر تھا ۔ ھمیشہ اسی سے علاج کراتے تھے ۔ اسے بلوایا گیا ۔ اس نے مارفیا کا ٹیکا لگا دیا ۔ اس کا اثر دو دن تک رھا ۔ بے ھوشی کے عالم میں بار بار چونکتے ۔ آخر پندرہ فروری کو سول سرجن آیا ۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ انھیں دوا کی نہیں آرام کی ضرورت ہے ۔ یہ جمعے کا دن تھا اور ربیع الاول ۱۳۶۶ھ کی بارہ تاریخ تھی ۔ اسی رات سوا دس بجے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ۔ ''کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام'' دوسرے دن ان کی وصیت کے مطابق ندی کے کنارے مکان کے لیے کھدی ھوئی بنیادوں کے درمیان ان کا جسد خاکی سپرد خاک کر دیا گیا ۔

ھر بہار گل از زیر گل بر آرد سر
گلے برفت کہ ناید بہ صد بہار دگر

ان کے بعض مداحوں اور دوستوں نے وفات کی تاریخیں کہیں ۔ سید ھاشمی صاحب فرید آبادی کی کہی ھوئی تاریخ جو رسالہ ''ھماری زبان'' میں شائع ھوئی تھی ، درج ذیل ہے :

پردیسی تھا ، دنیا سے گیا ، دنیا نے اس کو جانا کم
روئے گا اسے اب کون یہاں ، ہاں عالم علم کرے ماتم

ہو اصل پہ نقل جہاں فانی ، اور وہم حقیقت پر غالب
اس ملک ملمع پرور میں گم ہو زر خالص تو کیا غم

بت جعل و ریا کے توڑ گیا ہاں نام وہ اپنا چھوڑ گیا
محمود کے گرز سے کیا کم تھی شیرانی کی شمشیر قلم

اس رحلت غم انگیز پہ میں تاریخ وفات کی فکر میں تھا
برجستہ کہا ہاتف نے کہ "قل موت العالم موت العالم"

۱۳۶۶ھ

میں اپنی جانب سے حافظ صاحب مرحوم کی سیرت اور علمیت پر رائے زنی کرنا سوئے ادب خیال کرتا ہوں اس لیے ان کی وفات پر بطور تعزیت آئے ہوئے بہت سے خطوط میں سے چند اقتباس سپرد قلم کیے دیتا ہوں ۔

مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا :

"افسوس صد ہزار افسوس! ایک ایسا شخص ہم میں سے اٹھ گیا جو اپنے اخلاق و سیرت اور علمی ذوق اور تبحر میں اپنی آپ نظیر تھا ۔ ان کی موت ایک قومی سانحہ ہے ۔"

علامہ سیاب اکبر آبادی :

"علامۂ مرحوم دنیائے علم و ادب کے محسن اور فیض رساں بزرگ تھے ....مولانا کے علمی کارنامے زندہ ہیں تو گویا وہ خود زندہ ہیں ۔ موت تو جاہلوں کو آتی ہے ، ارباب علم و خبر کی موت زندگی سے کم نہیں ہوتی ۔"

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی :

"اصل صدمہ یہ ہے کہ ایسا شخص ہم سے اٹھ گیا جس کا مثل لاکھوں میں ایک نہیں ملتا ۔ مرحوم گھاٹے میں نہیں رہے ۔ ہم

جو زندہ ہیں ان کو ایسا بڑا نقصان اٹھانا پڑا کہ ایسی ذات سے محروم ہو گئے جس کا ہر لمحہ علم کے ندر تھا اور جس کی زندگی کا ہر دن ہمارے لیے علم کا ایک تحفہ پیش کرتا تھا ۔"

سر شیخ عبدالقادر :

"مجھے اس خبر سے بہت صدمہ ہوا ۔ نہ صرف اس لیے کہ مرحوم میرے گہرے دوست تھے بلکہ علمی اور ادبی دنیا کے لیے ایک منبع فیض تھے ۔ ان کی جگہ آسانی سے پر نہ ہو سکے گی .... انھوں نے جس ایثار کے ساتھ علم کی خدمت کی انھی کا حصہ تھا ۔"

سید ہاشمی فرید آبادی :

"تعلقات ذاتی کے علاوہ میرے دل میں مرحوم کے علم و فضل کی ایسی وقعت تھی کہ بیان کرنا مشکل ہے - افسوس ہے ہمارے جہالت پسند ملک نے ان کی جیسی چاہیے قدر نہ کی ۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب ان کے فضائل علمی کا لوگ حیرت کے ساتھ اعتراف کریں گے ۔"

پروفیسر سید طلحہ :

"وہ ان اصحاب میں سے تھے کہ رفتند و آدمیت را بخاک بردند ۔ اہل علم و فضل کو حق ہے کہ ماتم کریں اور مخلص احباب کی جماعت کو حق ہے کہ خوب آنسو بہائیں ....معاصرت سے آدمی کی قدر نہیں معلوم ہوتی ۔ کون شخص ہے جو کسی نہ کسی طرح تمھارے باپ کا ممنون نہ ہوگا ۔ اگر کوئی امیر ہے تو اس کو علم و فضل کی دولت سے فائدہ پہنچا ہوگا ، کسی کو اقتصادی نفع پہنچا ہوگا ، کسی کو اور طرح سے ۔ اس قدر عمیم الاحسان ، کثیر الافادہ آدمی اس دور میں کہاں ۔ تمھارے خاندان کے لیے فخر خاندان ، وطن کے لیے فخر وطن ۔ احباب کو ان پر جس قدر فخر و ناز تھا وہ اس سے زیادہ کے مستحق تھے ۔"

پروفیسر سید عبدالقادر اسلامیہ کالج لاہور :

"مرحوم میرے دیرینہ کرم فرما اور دوست تھے ۔ نہایت

خوش اخلاق اور هم درد انسان تھے ۔ ان کی وفات سے ایک بے نظیر اور مرنجاں مرنج انسان دنیا سے اٹھ گیا ھے ۔

علم و فضل کے اعتبار سے شیرانی صاحب کو بحرالعلوم کہا جائے دو بجا ھے .... ان کے تحقیقی مضامین ان کی وسعت معلومات کا زندہ ثبوت ھیں ۔ بڑے بڑے فاضل ان کے سامنے خم کھاتے تھے اور علم دوست حضرات ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا اپنے لیے باعث صد افتخار سمجھتے تھے ۔''

پروفیسر شریف علی ، وکٹوریہ کالج ، گوالیار :

''جو جو احسانات استاد مرحوم کے مجھ پر ھیں ، ان کا بیان میری طاقت سے باھر ھے ۔ ان کا فیض عام تھا ، هر شخص کو ان کی ذات گرامی سے فائدہ پہنچا ۔ استاد مرحوم میرے حال پر خاص طور پر مہربانی فرماتے تھے ۔ اکثر میں اس سر چشمۂ مہر و محبت و علم و فضل سے سیراب ھوا ۔''

پروفیسر نجیب اشرف ندوی ، اسماعیل کالج ، بمبئی :

''وہ هم سب کے باپ تھے اور اگرچہ میں نے ان سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن میں ان کو همیشہ اپنا استاد سمجھتا تھا اور آپ نے از راہ شفقت بزرگانہ مجھے یہ عزت دے رکھی تھی کہ میں اپنے کو ان کا شاگرد سمجھوں ۔ اس غم میں هم کیا ساری علمی دنیا آپ کی شریک ھے ۔''

پروفیسر ابراهم ڈار ، احمد آباد

''شیرانی صاحب کی موت کا الم انگیز سانحہ علم و تحقیق کی موت ھے .... حیران ھوں کہ ان کی کس کس خوبی کو یاد کرکے روؤں ۔ وہ محض ایک فاضل متبحر ، نام ور محقق اور وسیع النظر ناقد ھی نہ تھے بلکہ ایک شفیق استاد ، مہربان دوست اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نہایت ھی اچھے انسان بھی تھے۔ مرحوم کے تمام احباب و تلامذہ کے دلوں پر ان کے مکارم اخلاق کا نقش ثبت ھے ۔ مدتوں اهل علم کی نگاھیں اس شیر بیشۂ تحقیق

کو ڈھونڈھا کریں گی۔ نقد و تحقیق کی محفل کے اس صدر نشیں کے اٹھ جانے کے بعد ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پر ہونا محال ہے۔"

کٹر سید عبداللہ :

"حادثہ اتنا سخت اور غم اتنا گہرا ہے کہ قلم تفصیل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بابا کا ماتم کیسے کروں۔ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں" خدا کی قسم دل شق ہو رہا ہے۔"

اب ایس۔ اے رحمان :

"ان کے اٹھ جانے سے ادبی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ کم لوگ ان کے تبحر علمی تک پہنچ سکیں گے۔"

شی حسین بٹالوی :

"آج یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ایک عالم کی موت واقعی ایک عالم کی موت ہے......یہ نقصان تنہا آپ کا نقصان نہیں بلکہ اس میں سارا ہندوستان شریک ہے۔ علمی دنیا میں مرحوم کا جانشیں یا ثانی پیدا ہونا محال ہے۔ ان کی خوبیاں ان کے ساتھ ہی رخصت ہوگئیں۔"

حافظ صاحب مرحوم نے لاہور سے ٹونک آجانے کے بعد اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ کار آمد کتابیں جمع کر لی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ہماری خواہش تھی کہ یہ بھی یونیورسٹی لائبریری میں ان کے مجموعۂ کتب کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ چناں چہ پروفیسر اقبال صاحب کے توسط سے یہ معاملہ انجام پایا۔ سکون کا البتہ افسوس رہا اور رہے گا۔ علاوہ ازیں بعض دیگر آثار قدیمہ جن میں کئی ہزار تانبے کے سکے بھی شامل تھے، تقسیم ملک کے بعد نقل مکانی کی بھینٹ چڑھ گئے[۱]۔ لیکن سب سے بڑا نقصان

۱۔ نقل مکانی کے وقت مکان میں جو سامان چھوڑا گیا اس میں تانبے کے سکوں کے کئی توڑے اور ایک پوری پرات تھی۔ وہ ایک کمرے میں دوسرے سامان کے ساتھ مقفل کیے گئے۔ یہ سامان اور سکے لٹ گئے۔

مرحوم کے تحریر کردہ ان کاغذات اور غیر مطبوعہ صفحات کا ہوا جو اس افراتفری میں برباد گئے ۔

میں یہ مقالہ اسادی ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون ''کتاب خانۂ شیرانی کے نوادر'' (مطبوعہ رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۴۶ء) کے اس اقتباس کے ساتھ ختم کرتا ہوں :

''پروفیسر شیرانی ہمارے دور کے بہت بڑے نقاد مورخ تھے - وہ واقعات کی صحت و صداقت پر جان دیتے تھے اور اس معاملے میں کسی غلطی اور غلط بیانی کو معاف نہ کرسکتے تھے - سچائی کی تلاش ان کا ایمان تھا جس کی خاطر انھوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کی بھی پروا نہ کی - انھوں نے تاریخ و ادب کی بڑی بڑی غلطیوں کی اصلاح کی اور ایسے ایسے پختہ نظریوں کے طلسم کو توڑا جن کی جڑیں علمی دنیا میں بہ طور ایک حقیقت ثابتہ کے راسخ اور پکی ہو چکی تھیں......محض روایت پر وہ اعتماد نہ کرتے تھے بلکہ درایت کو بھی کام میں لاتے تھے......اگرچہ شیرانی صاحب کے تعمیری کاموں کی کچھ کمی نہیں ، پھر بھی ادب اور تاریخ کے بہت سے غلط نظریوں اور عقیدوں کو انھوں نے جس شدت اور قوت کے ساتھ توڑا اس کی بنا پر اگر انھیں......بت شکن کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔''

مقالات

ریختہ

(از 'اورینٹل کالج میگزین' بابت مئی ۱۹۲۶ء)

اردو زبان کو ریختہ کہنے کی وجہ تسمیہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے عجیب عجیب قیاس دوڑائے ہیں ۔ منشی درگا پرشاد صاحب نادر خزینۃالعلوم میں کہتے ہیں :

''ریختہ بمعنی گرے ہوئے کے ہیں ؛ پس جو زبان اسی اصلیت سے گر جائے اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں ۔ چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت شامل ہوئے اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں ۔ اسی طرح حسب تحریر بالا زبان ریختہ ھندی کو زبان اردو[1] سمجھتے ہیں۔'' (خزینۃالعلوم فی متعلقات المنظوم ، صفحہ ۱۴ مطبع مفید عام ، لاھور ۱۸۷۹ء) ۔

حضرت آزاد 'آب حیات' میں فرماتے ہیں :

''اس زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں ، کیوں کہ مختلف زبانوں

---

[1] ۔ اس عقیدے کے برخلاف مولوی فضل حق خیر آبادی اپنے رسالے 'تحقیق الفتویٰ' میں اسی زبان اردو کو 'ریختۂ اردو' کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ان کے الفاظ ہیں :

''سوال ۔ چہ می فرمایند علمائے دین متین و مفتیان مخلصین از اہل صدق والیقین در حق کسے کہ یک رسالہ بزبان ریختۂ اردو در بیان بعض مسائل اعتقاد بہ برائے ناقص عوام کہ سواد فارسیت ہم ندارند تالیف دادہ . . . . الخ''

اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ ریختۂ ھندی اور ریختۂ اردو میں کوئی فرق نہیں رہا اور حضرت نادر کا نظریہ غلط ہو گیا ۔

ے اسے ریختہ کہا ہے؛ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا اور
سمدی وغیرہ سے ریختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنے ہیں
گری پڑی پریشان چیز؛ چوں کہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں
اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں۔''

صاحب جلوۂ خضر بیان کرتے ہیں:
''اس زبان کا نام ریختہ شاہجہاں کے وقت میں رکھا گیا۔ چونکہ
ریختہ گچ کو کہتے ہیں، پختگی کے لحاظ سے اس کو ریختہ
کہنے لگے۔''

ہمارے مخدوم حضرت سرخوش 'اعجاز سخن' میں رقم طراز ہیں:
''اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنے ہیں مگر زبان
کے تعلق سے نظرتاً اس سے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی
جا سکتی ہے۔''

فارسی زبان میں ریختن متعدد معنوں میں آتا ہے۔ اور معنوں سے
قطع نظر وہ ایجاد کرنے، کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی
چیز پیدا کرنے اور موزوں کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔
مثلاً ریختن بنا و ریختن بوت۔ نظیری نیشاپوری:

هر طرف رنگے به گل بسرشته شد
قالب گبر و مسلماں ریختند

اثیرالدین:

سبحان الله ز فرق سر تا پایت
در قالب آرزوی من ریخته اند

مثال دیگر:

بر نمی خیزد چو من افتادهٔ از روے خاک
می تواں صد بید مجنوں ریختن از سایه ام

مثال دیگر :

و آنکه ار الماس بهر جان ما
تیغ ابرو رمح مژگاں ریختند

مثال موزوں شد :

مصرع زلف بتاں چوں بر زبان شانه ریخت
موشگافاں را کلمد گفتگو دندانه ریخت

یہاں ریخت مصرع اول میں بہ معنی موروں شد ہے - یہی حالت مصرعۂ ریختہ و معنئی ریختہ کی ہے - اس کا اطلاق ایسے مصرع یا معنے پر ہوتا ہے جو بے تکلف و تامل ذھن میں آ جائے - طغرا :

داریم حوشاند صمر تا روئے دھد
چوں مصرعۂ رلف مصرعۂ ریختہ

لیکن ہندوستان میں ریختہ نے ساتویں قرن ھجری میں نئے معنے پیدا کر لیے - اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دھلوی نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئی چیز پیدا کی اور اس کے لیے نئی اصطلاحات مثلاً قول ، ترانہ ، معروق ، صوب ، بسیط ، دوبحر ، چہار اصول ، نقش ، فارسی ، غزل وغیرہ وغیرہ وضع کیں وہاں ریختہ کی اصطلاح بھی ایجاد کی - اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک راگ اور ایک تال میں بندھے ہوں اس کو ریختہ کہتے ہیں - ریختہ کے لیے کسی پردے کی قید نہیں ہے ، وہ ہر پردے میں باندھی جا سکتی ہے - میں اپنی سند کے اصل الفاظ ذیل میں نقل کرتا ہوں :

''و اصطلاح دیگر آں که هر 'فارسی' که با مضمون خیال هندوی مطابق باشد و الفاظ هر دو زبان را در یک تال و یک راگ بر بست نموده باشند و انضمام و اتصال داده سرایند آں را ریخته گویند و این ریخته را در هر پرده مي بندند و ذوق و لذت افزوں می دهند -''

اس عبارت میں 'خیال' اور 'فارسی' قابل تشریح ہیں - خیال کسی شرح کا محتاج نہیں کیوں کہ اب بھی موسیقی میں اس کا رواج ہے - رہی فارسی اس کے لیے میری سند کے یہ الفاظ ہیں :

"فارسی اصطلاحی آں را نام نہند کہ یک بیت را با بانائی مقرون ساختہ بر بست کنند -"

گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی کے اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون ، راگ اور تال کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے ، ترکیب دے دیے جاتے تھے - مثال میں امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جا سکتی ہے جس کا مطلع ہے :

ز حال مسکیں مکن تغافل در آئے نیناں بنائے بتیاں
جو تاب ہجراں ندارم اے جاں نلیو کاہے لگائے چھتیاں

مولانا بہاؤالدین بن حاجی معزالدین شیخ رحمت اللہ گجراتی کے ، جو محمود بیگڑہ (۸۶۳ھ و ۹۱۹ھ) کے پیر ہیں ، مرید تھے ؛ باجن تخلص کرتے تھے اور فارسی و ہندی میں نظم لکھتے تھے ؛ اپنی ایک تالیف میں جو مریدوں کی ہدایت اور اپنے مرشد کے حالات میں تصنیف کی ہے ذیل کا ریختہ دیتے ہیں :

یہ صوفی سر الٰہی این مرتبہ دارد شاہی
یہ مظہر عین خدائی

درآں مجلس کہ مظہر عین خدا باشد آں جا عین شین خدا باشد
آجان بارد رحمہ اللہ

آں جا ساقی رسول اللہ آں جا روئے نوشیں اللہ
آں جا ہمہ اللہ باشد نہ غیر اللہ

اب شیخ باجن جن کا زمانہ منتصف آخر قرن نہم ہجری ہے ، اس سرود کو ریختہ کے نام سے یاد کرتے ہیں - میں انھی کے کلام سے ایک اور مثال دیتا ہوں :

باجن یہ وہ روپ نہ ہوئے جو کوئی بکھانے
بکھانے آپ کو جیوں سبہ کوئی جانے

آں نرویست کہ من وصف جمالس دانم
ایں حدیث از دگراں پرس کہ من حیرانم

باش تا جاں برود در سر آں یار لطیف
کہ دگرے بہ ازیں کار نیاید جانم

سیخ سعدی[1] دور اکبری کے ایک بزرگ ہیں جن کو غلطی سے عوام شیخ سعدی شیرازی مانتے ہیں - ان کا ایک ریختہ مسہور ہے جس کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے - میں صرف مقطع پر قناعت کرتا ہوں :

سعدی کہ گفتہ ریختہ ، دُر ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ، ہم ریختہ ہم گیت ہے

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کر لی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا جس میں دو زبانوں[2] کا اتحاد ہو - چناں چہ شیخ باجن اور شیخ سعدی کے ہاں ریختے کا یہی مفہوم ہے ، بلکہ شیخ سعدی نے تو اس کو واضح کر دیا ہے کہ ریختہ اور گیت ایک ہی چیز ہے - دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریختہ ایسی نظم ہوتی تھی جس میں ہندی فارسی کے اشعار یا فقرے متحد ہوتے تھے - یہاں ایک اور مثال بارھویں قرن ہجری کے ریختے کی دی جاتی ہے جو خواجہ حافظ کی مسہور غزل کی تضمین ہے :

ریختہ

سوکھ چین کی منڈل سوں سبہ جا کرو پکارا
دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدا را

---

۱ - بدایونی نے اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے -
۲ - بہار عجم میں کلام مخلوط بہ دو زبان کو ریختہ کہا ہے -

اکھیاں نیں جھڑ لگایا رسوا کریں گی آخر
دردا کہ راز پنہاں خواهد شد آشکارا

اے مرگ ٹک امن دے دل کی مراد یوں ہے
باشد کہ باز بینم آن یارِ آشنا را

دو دن کی زندگانی مت کر جفا کسی پر
نیکی بجائے یاراں فرصت شمار نسارا

من من کیا ہے لوھو، لوھو کیا ہے پانی
دلبر کہ در کف او موست سنگ خارا

اکثر گناہ کرکے اب ہو رہے ہیں تائب
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اندر سرائے گلشن بلبل پکاری ہے
ھات الصبوح ہبّوا یا ایہا السکارا

محتاج یک نظر کا دربار پر کھڑا ہوں
روزے تفقدے کن درویش بے نوا را

دنیا کی فکر مت کر کہتا ہے خواجہ حافظ
کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

لیکن گیارھویں صدی ہجری میں ریختہ کا اطلاق بالعموم اردو نظم پر ہونے لگا ۔ ذیل کی غزل ریختہ ہے :

جاناں رحم ترساوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں
ایتا بھی کیا ترساوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

تیری فراقوں دن این ، لہو سیں ہیں رکھوییں
کب لگ یہ مہ ترساوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

ہے بے کلی مجھ دات کوں، آ خواب میں ٹک رات کوں
سینہ لگا بٹھلاوناں[1] ، یا مجھ بلا یا آوناں

---

۱ - دور قدیم میں ''ٹ'' کی ''ط'' کی جگہ چار نقطے لگانے کا دستور تھا (مرتب)

کیتا کہوں اے نانرس، یک یک گھڑی گزری برس
بیگی [1] خبر کہلاؤناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

پیارے شتابی کر دوا ، خون غریباں نیں روا
مجھ جیو کوں بچاوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

تجھ راہ اوپر ہے نظر ، ٹک اس طرف فرما گزر
یک بار آھیں جاوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

ہے دل منیں یہ آرزو ، یک روز اپنے روبرو
اے جاں من ٹھلاوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

یہ حسن ہے دن چار کا ، جوں پھول ہے گلزار [کدا] کا
آخر کوں ہے کملاوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

ساجن کروں کتنا گلا ، اب وصل کا شربت پلا
وہ جگر بھچاوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

ایتا نہ ہووے باک توں ، آخر ہے مشت خاک توں
کچھ حق ستی شرماوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

یہ دل جلے کا قول ہے ، ہر یہ سخن بے مول ہے
مطلب حقیقی پاوناں ، یا مجھ بلا یا آوناں

یہ یاد رہے کہ ریختہ اس عہد میں نظم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کو نثر کے ساتھ یا زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ استاد ولی کے ہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں بعض امثال حوالۂ قلم ہیں :

(۱) ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے [2]
سنے تو اس کوں جان و دل سوں حساں عجم آ کر

---

۱ - بیگی یعنی جلد۔ راجستھانی زبان میں آج بھی مستعمل ہے (مرتب)۔

۲ - ریختہ بولنا ترجمہ ہے ریختہ گفتن کا اور مرادف ہے سخن گفتن و شعر گفتن کا۔

(۲) امید مجھ کوں یو ہے ولی کیا عجب اگر
اس ریختہ کو سن کے ہوں معنے نگار بند

(۳) یو ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا تو
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

ان اشعار میں ریختہ کا اطلاق زبان پر خارج از بحث ہے۔ یہاں اس کے معنے نظم یا شعر یا کلام منظوم کے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح شعر کا استعمال بھی ملاحظہ ہو:

(۱) تیرا یو شعر جگ میں مؤثر ہے اے ولی
تو دل سے ہر ایک کے جا کر اثر کیا

(۲) ولی شعر میرا سراسر ہے درد
خط و خال کی بات ہے حال حال

(۳) یوں شعر تیرا اے ولی مشہور ہے آفاق میں
مشہور جیوں کر ہے سخن اس شمل سرار کا

(۴) ولی مجھ شعر کے سنے ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں میرے شراب پرتگالی کا

ریختہ بہ معنی زبان اردو بارھویں صدی کے آخر میں استعمال ہونے لگا ہے۔ سودا لکھتے ہیں:

مظہر کا شعر، فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقیں جان کہ روڑا ہے باٹ کا

آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا

سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فروز شہ کی لاٹ کا

شاہ عبدالقادر اپنے ترجمۂ قرآن (۱۲۰۵ھ) میں ریختہ اور ہندی زبان میں کچھ فرق مانتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ضرور نہیں کیوں کہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے - اگر وہی ترکیب رہے تو معنے مفہوم نہ ہوں - دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف [کہ] عوام کو بے تکلف دریافت ہو -''

شاہ صاحب کس چیز کو ریختہ کہتے ہیں کس چیز کو ہندی ، اس سے ہم قطعاً تاریکی میں ہیں - اس زبان کے آغاز کے متعلق صاحب 'ظہیرالانسا' کہتے ہیں :

''ہر گاہ سریر سلطنت از جہانگیر متجاوز شد نوبت شاہجہان رسید - این جا کہ بہ سبب مصاحبت و معاشرت علمای دین فی‌الجملہ خودداری و شرع غالب بود این زبان ریختہ معجون مرکب بسبب آمد و رفت تاجران ہر دیار در بازارہا بہ ضرورت خرید و فروخت و معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شا تا زبان یکے بہم دیگرے در آید - چون بازار را در ترکی و فارسی اردو گویند ضرورت استعمال این زبان مرکب در بازارہا ضروری‌تر شد خصوصاً در بازار خاص بادشاہی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اردوے معلیٰ بود ؛ لہذا نام زبان پارہ مرکب نیز اردوے معلیٰ قرا یافت با اینکہ بانقراض ازمنہ آن مخصص آداب شاہی باقی نماند - آ التزام لفظ معلیٰ ہم نماند فقط اردو باقی ماند - پس وجہ تسمیہ ارد ہمین است و اسم بامسمیٰ ریختہ است یعنی زبان عربی و فارسی درو ریختہ اند -''

اردو کے آغاز پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے - بہ وجۂ قلت فرصت 'ظہیرالانسا' کے بیانات پر تنقید کے نظر میں اپنے مضمون ک ختم کرتا ہوں - آئندہ فرصت کے وقت تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے گی یہ چند سطور محض حضرت حسب اڈیٹر کے ارشاد کی تعمیل میں عجلتاً لکھ دی گئی ہیں -

---

اردو زبان

اور

اس کے مختلف نام

(از 'اورینٹل کالج میگزین' بابت مئی ۱۹۲۹ء)

لفظ اردو قرن سابع ہجری کے خونیں واقعات کی یاد ہمارے دل
ہی تازہ کر دیتا ہے ۔ جب ۶۱۷ھ میں چنگیزی لشکروں نے قراقرم سے
روج کر کے اور مختلف دستوں میں تقسیم ہو کر دنیا کی فتح کا بیڑا
ٹھایا تھا ، ان میں سے ایک دستے نے بہ سرکردگی چنگیزخان ترکستان ،
راسان اور افغانستان کو تسخیر کر لیا ۔ دوسرا دستہ مغرب کی طرف
ڑھا اور آذر بائیجان ، ارمن و گرجستان فتح کرتا ہوا جنوبی روس میں
ا کر ٹھہرا ۔ تیسرے دستے نے مشرق کا رخ کیا ؛ ممالک چین ان کی
اخت و تاراج کی جولان گاہ بنے اور عن قریب بعد سلطنت فغفوری
ن کے زیر نگیں آ گئی ۔

ان وحشیوں نے اپنے خروج اور سلسلۂ فتوحات کے دوران میں
نسانی خوں رَیزی اور بلاد و امصار کی تباہی میں کوئی دقیقہ اٹھا
ہیں رکھا ۔ آباد شہروں کو ویران کیا اور ان کے باشندوں کو تلوار
کے گھاٹ اتارا ۔ اور ممالک کے مقابلے میں ایران خصوصیت کے ساتھ
ن کے بے پناہ غیض و غضب کا شکار بنا ۔ اس کے عظیم الشان اور آباد
شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ۔ ان کی عمارات کو زمین کے
رابر پست کر دیا گیا اور ان کی آبادی سپرد تیغ ہوئی ۔ سمرقند ، بخارا ،

بلخ ، طوس ، ہرات ، نیشا پور اور خوارزم وغیرہ صرف چند مثالیں ہیں جہاں یہ خونیں واقعات انتہائی شدت کے ساتھ ظہور پزیر ہوئے ہیں ۔

یہ اس قیامت عظمیٰ کی بنا پر ہے جو نسل انسانی کی تاریخ کا سب سے زیادہ خونیں واقعہ ہے کہ لفظ 'اردو' ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں میں داخل ہو جاتا ہے ۔

یہ لفظ اصل ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے ، یعنی اوردا ، اوردہ ، اردہ ، اوردو اور اردو جس کے معنے فرودگاہ لشکر اور پڑاؤ نیز لشکر و حصۂ لشکر ہیں ۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال خیمہ ، بازار لشکر ، حرم گاہ ، محل و محل سرائے شاہی[1] و قلعے[2] پر بھی ہوتا ہے ۔ اقوام مغول کسی شہری اور مدنی زندگی کی پابند نہیں تھیں ۔ ان کو بسا اوقات جدید سبزہ زاروں اور چشمہ ساروں کی تلاش میں یا بہ ضرورت جنگ و پیکار یا بہ غرض تاخت و غنیمت ایک مقام سے دوسرے مقام پر نقل مکانی کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی ۔ وہ اپنے گلوں اور مویشیوں کے ساتھ گاڑیوں میں سفر کرتے اور ان کے سفر کی محرک صحرائی جانوروں اور طیور کی آوازیں ہوتی تھیں جن سے شگونوں کی روشنی میں وہ اپنے خیمے برپا کرتے اور ایک مقام پر آباد ہو جاتے یا وہاں سے ترک سکونت کرتے ۔ ہر خاندان کا خیمہ جداگانہ ہوتا تھا جس کو ان کی اصطلاح میں 'یورت' کہا جاتا تھا ۔ یہ یورت اون کے بنے ہوتے تھے ۔ متعدد یورت کا مجموعہ دراصل 'اردو' یا 'اول' کہلاتا تھا ۔ یہی اردو یا اول ان کی غیر متمدن زندگی کے مرجع و مرکز تھے ۔ یہی ان کے قلعے تھے اور یہی ان کے شہر ۔ سردار کا خیمہ بہ غرض امتیاز ، سر اوردہ یعنی اردوے معلا کے نام سے منسوب ہوتا تھا[3] ۔

اردو کا لفظ غالباً سب سے پہلے بہ شکل 'اردا' مقدسی (تقریباً ۳۷۵ھ)

---

۱ ۔ نورالابصار قلمی نوشتۂ عہد محمد شاہی مملوکہ پروفیسر محمد شفیع ۔
۲ ۔ ہابسن جابسن صفحہ ۶۳۰ ۔
۳ ۔ تاریخ مغول انگریزی از ہاورتھ' صفحہ ۱۰۴، جلد اول' ۱۸۷۸ء

کے ہاں ملتا ہے جو ترکستان کے کسی شہر کا نام ہے[1] - اردو کے نام پر ایک ترکی قبیلہ بھی ہے جو سولھویں صدی عیسوی میں اس نام سے مشہور ہوا - اس قبیلے کے اجداد چنگیز خاں اور اس کے جانشیں سلاطین کے مقابر کی تولست سے ممتاز تھے - یہ مقبرے حوں کہ چنگیز خاں کے زمستانی اردو میں واقع تھے اس لیے ان مغولوں کی اولاد اردو کے نام سے مشہور ہو گئی - ترکیبی حالت میں 'اردو قند' اور 'اردو بالیغ' دو شہروں کے نام ملتے ہیں - ان میں 'اردو قند' کاشغر کا مغولی نام ہے - 'اردو بالیغ' اس شہر کی بنیاد اوگتائی قاآن نے رکھی تھی - بعد میں قراقرم کے نام سے مشہور ہوا[2] - لیکن 'گدس اوردو' ان سے زیادہ قدیم نام ہے جو ہماری تاریخوں میں بلاساغون کے نام سے مذکور ہے[3] -

چنگیزی طوفان کے ختم ہونے پر جب ایران میں مغولی حکومت قائم ہو گئی ، ایرانی مورخین و مصنفین لفظ اردو فارسی زبان میں اختیار کر لیتے ہیں - ان میں غالباً سب سے سابق علاؤالدین عطا ملک جوینی ہیں - ان کی تصنیف 'جہاں کشا' میں یہ لفظ عام طور پر مستعمل ہے - میں یہاں ایک مثال عرض کرتا ہوں :

''و خان ہر وقت کہ عزیمت شکار بزرگ کند و وقت آن دخول زمستان باشد فرمان رساند تا لشکرہا کہ در مدار محط رحال و جوار اردوہا باشد مستعد شکار گردند -'' (جلد اول صفحہ ۱۹) -

اس کے بعد یہ لفظ عام ہو جاتا ہے اور 'جامع التواریخ' ، 'بناکتی'، 'وصاف' ، 'روضۃ الصفا' و 'حبیب السیر' وغیرہ میں عام طور پر ملتا ہے - یورپ میں اس لفظ کا داخلہ باتو خاں بن جوجی بن چنگیز خاں کے حملۂ مغرب سے تعلق رکھتا ہے جس کی فتوحات

---

۱ - ببلیوتھیکا جیوگریفورم عرابیکورم ، جلد سوم ، صفحہ ۲۷۵ -
۲ - جہاں کشائے جوینی صفحہ ۴۰، جلد اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو بالیغ ہی قدیم نام تھا -
۳ - بریتھالڈ ، صفحہ ۳۱۲ -

مغرب اقصیٰ تک پہنچ گئی تھیں ۔ اس کا صدر مقام سرائے دریائے والگا پر واقع تھا اور اس کی فرودگاہ 'اردوے مطلا' کے نام سے معروف ہوئی۔ اردوے مطلا کے زیر عنوان جوجی کے تمام فرزند اور مطیع قبائل شامل ہیں جن کا رسمی سردار جوجی کا خلف اکبر اوردا تھا ۔ وہ اردوے مطلا کے دست چپ کا حکم ران تھا جس کو آق اوردا ، یا اردوے بیصا کہتے تھے ۔ اس سے دست راست کو ممیز کرنے کے لیے جس کا افسر باتو خان تھا ، قاق اوردا یا اردوے ازرق کہتے تھے ۔ لیکن باتو خان حقیقت میں اس تمام اردو کا حاکم اعلیٰ تھا ۔

ممالک مغرب میں یہ لفظ پولینڈ کے راستے سے پہنچتا ہے ۔ اس ملک میں 'اوردا' کے ابتدائی 'الف' کو 'ھے' کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا اور 'ھوردا' بنا لیا ۔ اس شکل میں یہ لفظ یورپ کے مختلف ملکوں میں پہنچا ۔ چناں چہ جرمنی میں 'ھوردے' ، سویڈن میں 'ھورد' ، اطالیہ میں 'اوردا' ، اندلس و پرتگال میں 'ھوردا' ، فرانس میں 'ھوردے' ، اور انگلستان میں 'ھورڈ' بولا جاتا ہے ۔

شویلر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی قوم فی زماننا اس لفظ کا استعمال بہ حیثیت کلمۂ تحقیر ایشیائی اقوام کے لیے کرتی ہے [۱] ۔

انگریزی زبان میں سب سے پہلا استعمال ۱۵۵۵ء میں ایڈن کی تصنیف 'ڈکیڈز' میں ہوتا ہے ۔ بعد کی مثال جینکنس کے سفر نامہ مطبوعہ ۱۵۶۰ء میں موجود ہے ۔

سرزمین ہندوستان میں اس کا رواج ظہیر الدین بابر (۹۳۲ھ و ۹۳۷ھ) کے زمانے سے متصور ہونا چاہیے ۔ اس عہد کی تلمیح خود اس بادشاہ کی ترکی تورک میں ملتی ہے ، اور جلال الدین اکبر کے عہد (۹۶۳ھ و ۱۰۱۴ھ) سے تو ہمارے مصنفین عام طور پر اس کا استعمال کر رہے ہیں ۔

---

۱ ۔ ترکستان جلد اول صفحہ ۳۰ ۔

لیکن 'طبقات ناصری' مصنفہ قاضی منہاج سراج نوشتہ ۶۵۸ھ میں ایک مقام پر اور تاریخ فیروز شاہی من شمس سراج عفیف میں جو تیموری حملے کے عن قریب بعد یعنی ۸۰۱ھ کے گردوپیش میں لکھی گئی ہے ، ایک ہی صفحے میں دو مقام پر یہ لفظ نظر آتا ہے۔ طبقات کی عبارت حسب ذیل ہے :

''ملک شیر خان از آن جا عزیمت ترکستان کرد و بطرف اردوی معلی رفت۔'' (صفحہ ۲۷۷ طبع ایشیاٹک سوسائٹی ، بنگال)

لیکن طبقات کے فاضل مترجم میجر راورٹی نے اسی حملے کے متعلق ایک حاشیہ دیا ہے جس کا مطلب ذیل میں درج ہے :

''یہ سارا جملہ تمام نسخوں میں ناقص ہے۔ مشکل سے دو نسخوں میں بھی یکساں نہیں ملتا۔ ایک نسخے میں لفظ 'ترکستان' کے بعد کسی قدر مزید عبارت بھی ہے یعنی ''وہ لاہور کی طرف بڑھا اور جس نے اسے دیکھا مرعوب ہو کر اس کے سامنے سجدے میں جھکا'' (در سجدہ افتاد) ۔ (انگریزی ترجمہ طبقات صفحہ ۲-۷۹۳)

میرے پاس طبقات کا جو نسخہ ہے اس میں بھی عبارت یوں ہے :

''ملک شیر خان از آنجا عزیمت ترکستان کرد و بطرف لوہور و این حوالی رسید با ملک جلال الدین مسعود شاہ بن السلطان پیوست'' (ورق ۳۷۵)

اس شہادت کی رو سے عبارت بالا میں اُردو کا استعمال بہت کچھ مشتبہ ہو جاتا ہے ؛ اور کوئی تعجب نہیں اگر عہد اکبری میں جب کہ قدیم تاریخوں میں دل چسپی کا اظہار کیا گیا ہے ، ایک ناقص جملے کو معنی پہنانے کے لیے کسی قدر ترمیم کر دی گئی ہو ۔ تاریخ فیروز شاہی میں ایک جملہ یوں ہے :

''باوارہ بذل و عطا از ہر چہار جانب خلق متوجہ اردوی او گردید'' (صفحہ ۵۳ ، تاریخ فیروز شاہی ، طبع ایشیاٹک سوسائٹی)

لیکن اڈیٹر نے اس کا اختلافی نسخہ بھی لکھا ہے جو اسی جملے

میں خلق کے بعد سے شروع ہوتا ہے ۔ یعنی :

''۳ ن ۔ خلق تارید چاکر می شد'' (صفحہ ۵۳)

میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ متن کی عبارت کے مقابلے میں زیادہ چسپاں اور موزوں ہے ۔

اسی تاریخ میں اسی صفحے پر ذیل کا جملہ بھی ملتا ہے :

''در ہردو لشکر اخبار مختلف مذکور می شد کہ خواجۂ جہان درآں قرارداده کہ جون لشکر سلطانی بدھلی رسد امراء کہ در اردوی ظفر قرین اند اتباع آنہا را دیده در پلۂ منجیق نہاده خواهد انداخت ۔'' (صفحہ ۵۳—۵۴)

ہندوستان میں ان ایام میں اردو کے لفظ سے شناسائی ہونے کے متعلق کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اس ملک پر مغلوں کے بار بار حملوں سے ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ضرور رہا ہوگا ۔ چناں چہ طبقات ناصری میں مغلوں اور ان کے مراسم و اوضاع کے مفصل حالات درج ہیں ۔ لیکن جو امر لفظ اردو کے استعمال کے متعلق ہمارے شبہ کو زیادہ تقویت دیتا ہے یہ ہے کہ ان تاریخوں کے سوا باقی تاریخوں میں یہ لفظ کہیں نظر نہیں آتا ۔ مثلاً امیر خسرو اور ضیاء برنی کے ہاں نہیں ملتا ۔ اگر رائج تھا تو ہر تاریخ میں ملتا یا جن تاریخوں میں موجود ہے ان میں عام طور پر ملتا ۔ اس لفظ کا ندرت کے ساتھ استعمال بہت کچھ اس کے خلاف ہے ۔ 'اردوے ظفر قرین' کی ترکیب تو ایسی ہے جس کا نویں صدی کی ابتدا میں رائج ہونا قرین قیاس نہیں ، البتہ اکبر کے عہد میں وہ اصطلاح کا حکم رکھتی ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا ۔

عہد اکبری میں بلا شک و شبہ یہ لفظ ہندوستان میں عام طور پر رواج پا چکا ہے اور اس عہد کے تمام مورخ بالعموم اس کا استعمال کرتے ہیں ۔ اکثر اوقات ترکیبی حالت میں ملتا ہے ، مثلاً 'اُردوے علیا' 'اُردوے معلیٰ' ، 'اُردوے لشکر' ، اُردوے حضرت' ، 'اُردوے ظفرقرین' ، 'اردوے عالی' ، 'اردوے بزرگ' ، وغیرہ جس سے ان کا مقصد شاہی

لشکر اور شاہی فرودگاہ ہے ۔ مثلاً بعض جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو صرف منتخب التواریخ بدایونی و طبقات اکبری سے ماخوذ ہیں ۔

(۱) ''و ہر شب جمعے از لسکر او جدا شدہ نزد حضرت بادشاہ می رفتند و آردوی علیا کوچ کردہ در ہم کروھے لشکر میرزا کامران نزول فرمودند و دریں شب اکثر لسکریان میرزا کامران گریختہ باردوی حضرت آمدند ۔'' (ص ۲۱۲ طبقات اکبری ۔ طبع نول کسور)

(۲) کابل را بہ میرزا بخسید و اردو را گذاشتہ بایلغار بجلال آباد کہ 'آردوی بزرگ' بخدمت شاہزادۂ بزرگ دراںجا بود معاودت می نمایند ۔'' (ص ۲۳۶ منتخب التواریخ بدایونی طبع نول کسور) ۔

(۳) شنیدہ ام کہ دران ایام کہ شاہم بیگ از 'آردوی معلیٰ' بہ جون پور رفت ۔'' (ص ۱۳۷ منتخب)

(۴) ''چون حوالی موضع ہالی کہکر مقام نزول 'اردوی عالی' گردید'' (ص ۱۸۰ طبقات)

(۵) ''فرمان شد کہ دولت خان و دریاب او را امان دادہ اموالش بقلم آوردہ بہ سپاہیان ، آردوی ظفر قرین' قسمت نمایند ۔''(ص ۱۸۳ طبقات)

(۶) '' برادران مسفق و یاران موافق خواہی نخواہی اورا گاہے بہ نصیحت و گاہے بزجر و تہدید و ملامت و سرزنش نگاہ میداشتند تا آنکہ 'آردوی ظفرقرین ' بمستقر سلطنت رسید ۔'' (ص ۱۷۱ منتخب)

(۷) '' و بعد از فتح کس ' باردوی لشکر' کہ در قندھار بود رفت'' (ص ۲۱۲ طبقات)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردوے ظفر قرین کا ایک مختصر بیان جس سے ہماری مراد اکبر کا لشکر بہ وقت کوچ و مقام ہے ، یہاں دے دیا جائے ۔ یہ بیان آئین اکبری سے ماخوذ ہے ۔

در فرود آمدن اردو

ایک ہموارہ قطعۂ زمین جس کا طول ۱۵۳۰ گز ہوتا تھا مقام شاہی و حرم سرائے شاہی کے لیے منتخب کیا جاتا تھا ۔ سب سے مقدم

'گلال باڑ' ایک قلعہ نما صد در صد گز احاطہ یا چوبیں سراپردہ ہے جو دیوار خرگاہ کے مشابہ ہے۔ وہ سرخ پارچے کا بنا ہے، نواڑ کی گوٹ ٹکی ہے؛ مضبوطی کی غرض سے جگہ جگہ تسمے لگے ہیں، آسانی کے ساتھ نہ ہو سکتا ہے، اس کے دروازے مضبوط اور تالے کنجی سے لیس ہیں۔ اس کے پورب میں ایک دو سرغہ[1] بارگاہ ہے جس کے ۵۴ حصے ہیں۔ ہر حصہ ۲۴×۱۴ گز طول و عرض میں ہے۔ وسط میں ایک بڑی چوبیں راوٹی[2] ہے جس کے دس ستون ہیں اور چاروں طرف سرا پردے لگے ہیں۔ اس سے ملحق ایک دو آشیانہ چوبیں محل[3] ہے جس میں بادشاہ سلامت صبح کے وقت عبادت کرتے نظر آتے ہیں۔ محل کی عورتیں بغیر اجازت اس میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ زاں بعد چوبیس چوبیں راوٹیاں ۱۰×۶ گز کے طول و عرض میں کھڑی ہیں جو قناتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ ان میں حرم شاہی کی مخدرات رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد خیمے اور تمبو اور ہیں جو خاص خاص بیگمات کے لیے معین ہیں۔ زردوزی مخمل کے ان کے سائبان ہیں۔ ان سے متصل ساٹھ گز طول و عرض کا ایک گلیم سراپردہ ملتا ہے جس میں مختلف خیمے لگے ہیں۔ یہاں اردو بیگیاں (اردا بیگنیاں) اور دیگر ملازم عورتیں رہتی سہتی ہیں۔ یہاں سے لے کر دولت خانۂ خاص تک ڈیڑھ سو گز کے طول اور سو گز کے عرض میں ایک فراخ میدان ہے جس کا نام مہتابی ہے۔ اس کے دونوں طرف

۱۔ دوسرغہ یعنی دو چوبہ جس کے صرف دو ستون ہیں۔

۲۔ اس میں چوکیوں کا فرش ہوتا تھا، دس ستون اور دو دروازے ہوتے تھے۔

۳۔ اس کی دو منزلیں ہوتی تھیں؛ پہلی منزل کے چھ چھ گز لمبے اٹھارہ ستون ہوتے تھے۔ اس کی ہیئت مجموعی بارہ دری[4] سے ملتی جلتی ہے۔ بالائی منزل کے ستون صرف چار چار گز لمبے تھے۔ اس کی شکل چوبیں راوٹی سے ملتی ہے۔ دوسری منزل پر جانے کے لیے سیڑھی لگی ہوتی تھی۔

ردے تن رہے ہیں جن کے ساتھ دو دو گز کے فاصلے پر چھ چھ گز
سے بانس جو گز گز بھر زمین میں گڑے ہیں ، پیوست ہیں ۔ بانسوں
کے سرے نیچے پر بری لٹو یا قبے لگے ہیں ۔ بانس باہر اور اندر سے ڈوریوں
سے بندھے ہیں اور پہرے والے متعین ہیں ۔ مہتابی کے وسط میں ایک
بڑا چبوترہ ہے جس پر چار چوبہ نمگیرے[۱] کا سائبان ہے ۔ بادشاہ سلامت
شام کے وقت یہاں تشریف لاتے ہیں اور خاص خاص لوگوں کو سلام
کی اجازت ہوتی ہے ۔ گلال باڑ سے ملحق ایک اور احاطہ ہے جو بارہ
حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ تیس گز طول میں ہے ۔ مزید براں
۰ گزی حوبیں راوٹی اور چالیس زمین دوز کمرے ہیں جن پر دوازدہ گزی
ارہ شامیانے سایہ کیے ہیں اور قناتوں کے ذریعے سے جدا جدا ہیں ۔
س احاطے کا نام ایچکی ہے ۔ ہر کمرے سے ملحق 'صحت خانہ' ہے ۔
ادشاہ سلامت نے طہارت خانے کے لیے یہ نام تجویز کیا ہے ۔
یچکی کے ساتھ ایک سراپردہ ہے جو ایک سو پچاس گز عرض و طول میں
ہے اور حسب معمول حوب اور قبوں سے مزین ہے ۔ اس کے وسط میں
بارگاہ بزرگ ایستادہ ہے جس کو ایک ہزار فراش کھڑا کرتے ہیں ۔
اس کے بہتر در ہیں اور اس میں دس ہزار آدمیوں کی نشست کی
گنجائش ہے ۔ بارگاہ کی چوب پندرہ گز بلند ہے ۔ اس کے گرد و پیش میں
ایک خیمہ نما قلندری محیط ہے جو موم جامے کی بنی ہے تاکہ بارس اور
دھوپ سے بارگاہ کا کپڑا خراب نہ ہو ۔ بارگاہ کے گرداگرد دوازدہ گزی
پچاس شامیانے سایہ انداز ہیں ۔ اس بارگاہ کا نام دولت خانۂ خاص ہے ۔
اس کے بھی دروازے اور پٹ موجود ہیں ۔ یہاں جلیل القدر
امراء اور افسران سپاہ حسب الحکم سلام کو حاضر ہوتے ہیں ۔ ہر ماہ
اس کے متعلق تجدیدی احکام جاری ہوتے رہتے ہیں ۔ یہ بارگاہ
اندر باہر سے خوب صورت اور رنگین فرش و فروش سے آراستہ ہے
اور باغ سدا بہار کا حکم رکھتی ہے ۔ بارگاہ سے علیحدہ ۳۵۰ گز کے
طول میں ایک اور احاطہ ہے جس کے گرد ڈوریاں کھچی ہیں اور

۱۔ نمگیرہ شامیانے کی طرح ہے اور چار چوب پر قائم ہے ؛
دائیں اور بائیں طرف سے دو دو ڈوریوں سے چوبیں بندھی ہیں ۔

تین تین گز کے فاصلے سے چوبیں گڑی ہیں ۔ احاطے کے گرد سپاہی پہرے پر کھڑے ہیں ۔ اس کا نام دیوان خانۂ عام ہے ۔ دیوان خانۂ عام کے خاتمے پر شصت گزی بارہ طناب کے فاصلے پر نقارخانہ ہے اور اس وسیع میدان کے وسط میں آکاس دیا ایک بہت بڑے فانوس کی شکل میں ۴۰ گز بلند ستون پر جل رہا ہے ۔

محولہ بالا بیان پادشاہی دولت سرا اور حرم سرا سے تعلق رکھتا ہے جس کے ساتھ مہتابی و دیوان خاص و عام شامل ہیں ۔ اس کیمپ کی تین طرف یعنی عقب ، دست راست و دست چپ میں ۳۶۰ گز زمین خالی چھوڑ دی گئی ہے جس پر چوکیداروں کے سوا کوئی غیر شخص قدم نہیں رکھ سکتا ۔ یہاں سو گز کے فاصلے پر جانب قول مریم مکانی گلبدن بیگم ، دیگر شہزادیوں اور شہزادۂ دانیال کے خیمے نظر آتے ہیں ؛ دست راست پر شہزادۂ سلطان سلیم اور دست چپ پرشہزادۂ سلطان مراد کے خیمے لگے ہیں ۔ شاہی فرودگاہ کے متوازی دونوں بازوؤں پر شہزادۂ سلیم کے دست راست و شہزادۂ مراد کے دست چپ پر بیوتات پھیلے ہوئے ہیں ۔ حویج خانہ ، نان باخانہ ، میوہ خانہ ، تنبول خانہ ، شربت خانہ اور آب دار خانہ سلیم کی طرف ہیں اور آفتابچی خانہ ، خوشبو خانہ ، توشک خانہ ، خیاط خانہ ، کراکراق خانہ ، چراغ خانہ اور مشعل خانہ مراد کی سمت میں ہیں ۔ نقار خانے کے ایک طرف دفتر خانہ اور دوسری جانب زین خانہ ہیں ۔ شاہی کیمپ کے چاروں گوشوں سے چار بازار شروع ہوتے ہیں ۔ دست چپ کے گوشے والے بازار کے متوازی اندرونی جانب اصطبل ، داروغۂ اسپاں ، مشرف اسپاں وغیرہ کے ڈیرے ہیں ؛ دست راست کے گوشے والے بازار کے بالمقابل اندرونی سمت میں سکھ پال ، بہل خانہ ، توپ خانہ اور چھتہ خانہ ہیں ۔ سب سے آخر میں بہ جانب قول چوکیداران پنج شنبہ و جمعہ و شنبہ ہیں ؛ دست راست پر چوکیداران یک شنبہ ، دو شنبہ اور دست چپ پر چوکیداران سہ شنبہ و چہار شنبہ ہیں ۔ ان سے بعد علی قدر مراتب امراء کے خیمے شروع ہوے ہیں جو اپنے متبعین اور حشم کے ساتھ مقیم ہیں ۔ یہ متحرک شہر جو درحقیقت کئی میلوں میں بسا ہوا ہے

شہنشاہ اکبر کا 'اردوے ظفر قرین' ہے ۔

اس امر کی دلیل کہ اکبر نے اپنے لسکر کا نام 'اردوے ظفر قرین' رکھا تھا ہمارے پاس یہ ہے کہ اس نے اپنے لشکر کی ٹکسال کا نام 'اردوے ظفر' قرین رکھا تھا۔ ذیل میں اس کا بیان دیا جاتا ہے ۔

اردو ظفر قرین

ہندوستان میں سفری ٹکسال سے سکہ لگانے کی رسم ظہیرالدین بابر کے عہد سے وجود میں آئی ۔ بابر اپنی لسکری ٹکسال کو 'اردو' کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ اس ٹکسال کا ایک نقرئی درم ضرب ۹۳۷ھ لاہور میوزیم میں محفوظ ہے جس پر عبارت ذیل منقوش ہے :

''السلطان الاعظم والخاقان المکرم ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ ضرب اردو[1]۔''

میں نے صرف دوسرے رخ کی عبارت نقل کی ہے ، پہلے رخ پر حسب معمول کلمہ ہے ۔

اکبر کی لسکری ٹکسال 'اردو ظفر قرین' یا 'اردوے ظفر قرین' جو خاص خاص موقعوں پر اردو بھی کہلائی ہے سونے ، چاندی اور تانبے کے سکے ضرب کرتی رہی ہے ۔ ان میں سب سے قدیم ایک مدور طلائی مہر ہے جس کی تاریخ ۹۸۳ھ ہے ۔ اشرفی ہذا انڈین میوزیم کلکتہ کے قبضے میں ہے اور میوزیم کی فہرست[2] مسکوکات جلد سوم صفحہ ۱۴ پر بہ ذیل نمبر ۱۰۰ مذکور ہے ۔ اس کی عبارت بہ خط نستعلیق[3] حسب ذیل ہے :

۱۔ فہرست مسکوکات شاہان مغلیہ در خزانۂ پبلک میوزیم لاہور ۔ صفحہ ۳ ، جلد دوم ۔

۲۔ فہرست مسکوکات انڈین میوزیم کلکتہ جلد سوم (سلاطین مغل) از نلسن رائٹ ۔

۳۔ ہندوستان میں مسکوکات پر خط نستعلیق کا رواج اسی عہد سے تصور کرنا چاہیے ۔ اس لحاظ سے بھی (باقی حاشیہ صفحہ ۲۲ پر)

رخ اول : لااله الا الله محمد الرسول الله (وسط میں) به صدق ابی بکر،
به عدل عمر، بهحیاے عثمان، ۹۸۳ / به علم علی (هر چهار جانب)

رخ دوم : جلال الدین محمد اکبر بادشاه غازی

ضرب اردوے ظفر قرین

اس ٹکسال کے اکثر سکے ایسے هیں جن پر تاریخ 'الف' یعنی ایک هزار مرقوم هے ۔ اس سے مراد سال هجرت نہیں هے بلکه وه هزار ساله مدت مراد هے جو شیوع اسلام سے لے کر سنه ۹۹۰ھ پر ختم هوتی هے ۔ گویا اس میں رسالت کی وه مدت شامل کر لی گئی هے جو رسول الله صلی الله علیه وسلم نے مدینے کی طرف هجرت کرنے سے قبل مکه میں گزاری هے ۔ اس رسالت کی مدت دس سال هے ، اس لیے اگر سنه ۹۹۰ھ کے ساتھ جو الفی سکوں کی ضرب کا سال هے ، رسالت مکه کے دس سال جمع کر لیے جائیں تو کل مدت اشاعت اسلام اس وقت تک ایک هزار سال هو جاتی هے اور لفظ 'الف' یہی مدت ظاهر کررها هے۔ اس زمانے میں به قول بدایونی شهنشاه اکبر نے ان لوگوں کے اثرات میں جو اس کے عبادت خانے میں شامل هوتے تھے اور جو اس کو ایک جدید مذهب کی ترویج پر مائل کر رهے تھے ، مذهب اسلام سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا ۔ یه امر شهنشاه کے ذهن نشین هو گیا تھا که ایک هزار سال کے اختتام پر دین اسلام کا خاتمه هو جائے گا ، اس لیے اکبر نے اپنے جلوس کے اٹھائیسویں سال کی ابتدا میں جو ۱۵ صفر ۹۹۰ھ کے مطابق هے ، جشن نوروز و سال نو منانے کے بعد جو اٹھاره روز تک رها ، سب سے پہلا حکم یه دیا که سکوں پر تاریخ الف بهٔ غرض اظهار خاتمهٔ دین اسلام لکھی جایا کرے ۔

میرا یه بیان بدایونی کے ذیل کے بیانات پر مبنی هے :-

(صفحه ۲۰ کا باقی حاشیه) یه اشرفی غالباً قدیم ثابت هوگی ۔ اکبر کے الٰهی سکوں پر جو سنه ۳۰ جلوس سے چلتے هیں نستعلیق بالالتزام ملتا هے ۔ لیکن کامران مرزا والئی کابل سب سے پہلا شخص هے جس کے سکوں پر نستعلیق کو جگه ملتی هے ۔

''و چون در زعم خویش مقرر ساختند که هزار سال از بعثت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ مدت بقائے این دین بود تمام شد و ہیچ موانعے برائے اظہار دواعی خفیہ کہ در دل داشتند نماند و بساط از مشایخ و علما کہ صلابت و مہابت داشتند و ملاحظۂ تمام از آنہا بایستے نمود خالی ماند نفراغ خاطر در صدد دواعی ابطال احکام و ارکان اسلام و بربست ضوابط و قواعد نو مہمل و مختل و ترویج بازار افساد اعتقاد درآمدہ اول حکمے کہ فرمودند این بود در سکہ تاریخ الف بنویسند۔'' (صفحہ ۱۳۸ ، منتخب التواریخ)

بدایونی کا دوسرا بیان حسب ذیل ہے :

''و تاریخ ہجری عربی را بمہر دادہ ابتداء آن از سال جلوس گرفتند کہ نہصد و شصت و سہ بود و ماہ ھا را بر رسم ملوک عجم کہ در کتاب نصاب مذکور است اعتبار کردند و عیدھا نیز موافق اعیاد زردشتیان در سالے چہاردہ قرار دادہ شد وعیدھائے مسلمانان و رونق آن بشکست مگر برای خاطر خطبۂ جمعہ کہ پیران مفلوک ناشناس رفتہ باشند و آنرا سال و ماہ الٰہی نامیدند و در تنکہا و مہرھا تاریخ الف[1] نوشتند باین اعتبار کہ مشعر باشد از انقراض دین متین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کہ بیش از ہزار سال نخواہد بود و عربی خواندن

---

۱ - یہاں بدایونی کو کسی قدر سہو ہو گیا ہے ؛ الفی سکوں کا اجرا اور سنہ الٰہی کی ترویج ایک ہی وقت کے واقعے نہیں ہیں بلکہ مقدم و مؤخر ہیں ۔ الفی سکوں کی اشاعت کے وقت اکبر دین اسلام سے برگشتہ نہیں ہوا تھا کیوں کہ اس کے تمام سکوں میں جن میں الفی سکے بھی شامل ہیں کلمہ شریف و اسمائے اصحاب اربع بدستور درج ہیں ۔ البتہ الٰہی سکوں کی ضرب کے وقت جو غالباً سنہ ۳۲ جلوس میں جاری ہوئے ہیں یہ انقلاب پیش آتا ہے جب کہ سکوں کی عبارت بالکل بدل دی جاتی ہے ۔

الفی سکے اکبر کے سب سے آخری سکے ہیں جن میں کلمہ موجود ہے اور شاید عوام الناس میں یہ سکے (باقی حاشیہ صفحہ ۴۳ پر)

و دانستن آن عیب شد ۔ (صفحہ ۲۴۰ ، منتخب التواریخ ۔ نولکشور)

گویا اس ماحول میں الفی سکے رواج پاتے ہیں اور چوں کہ کثرت کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں ، اس لیے گمان گزرتا ہے کہ تاریخ الف کے سکے کئی سال تک برابر ضرب ہوتے رہے جو اردوے ظفر قرین کی ٹکسال کا نتیجہ ہیں ، کیوں کہ اکبر کی باقی ٹکسالیں جو تعداد میں ساٹھ سے بھی زیادہ ہیں ، بہ‌دستور سال ہجری اپنے اپنے سکوں پر دکھا رہی ہیں ۔

طلائی اور نقرئی الفی سکے بالعموم مربع ہوا کرتے ہیں اور عبارت ذیل ان پر منقوش ہوتی ہے :

رخ اول : ''لا الہ الا اللہ محمد الرسول‌اللہ ۔ بصدق ابوبکرؓ ، بعدل عمر ، بحیاے عثمان ، بعلم علی ۔''

رخ دوم : ''جلال الدین محمداکبر بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ ۔ ضرب اردو ظفر قرین ۔''

(صفحہ ۲۲ کا باقی حاشیہ) اسی بنا پر زیادہ مقبول ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کثرت کے ساتھ ملتے ہیں ۔ لوگ انھیں تبرک کے طور پر رکھتے ہیں اور ان کی نسبت عجیب و غریب خواص مانتے ہیں ، مثلاً مریضوں کو ان کا پانی پلایا جاتا ہے ، عورتوں کو درد زہ کی شدت کے وقت بھی یہی پانی دیا جاتا ہے ۔ ہندو اور مسلمان اس عقیدے میں شریک ہیں ، بلکہ ہندو زیادہ مانتے ہیں ۔ عوام میں یہ سکے کلمے کے روپیوں کے نام سے مشہور ہیں ۔ یہ مقبولیت دیکھ کر بلوچیوں نے اچھی خاصی تجارت قائم کر لی ہے ۔ یہ لوگ ہر سال ہزاروں سکے بناتے ہیں اور ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں بیچ آتے ہیں ۔ ناواقف کلمے کا روپیہ سمجھ کر خرید لیتے ہیں ۔ کلمے کے سکے اکبر کی اور ٹکسالوں کے بھی موجود ہیں اور دیگر سلاطین کے بھی ، لیکن یہ احترام صرف الفی سکوں کو حاصل ہے ۔ گویا یہ جواب ہے اکبر کی دہریت کا جو اس کی رعیت نے دیا ہے ، کیوں کہ ان سکوں کی حرمت قدیم سے چلی آتی ہے ۔

دیکھو نمونہ نمبر ۱ طلائی و نمبر ۲ ، نمبر ۳ ، نمبر ۴ نقرئی و نمبر ۵ ربع روپیہ -

مسی سکوں پر جو 'دام' کہلاتے تھے ، یہ الفاظ مکتوب تھے :

رخ اول : ''فلوس الف ضرب -''

رخ دوم : ''اردو ظفر قرین -''

سنہ الٰہی کی ترویج کے بعد یہ عبارت ہوتی تھی :

''دام ضرب ۳۸ الٰہی -''

رخ اول : ''فلوس اردو -''

رخ دوم : ''ظفر قرین ۳۶ الٰہی-'' دیکھو نمونہ نمبر ۱۰، دام ضرب ۳۸ الٰہی -

رخ اول : ''ضرب فلوس اردو -''

رح دوم : ''ظفر قرین ۳۸ الٰہی -'' دیکھو نمونہ نمبر ۱۱ -

دام ضرب ۳۹ الٰہی -

رح اول : ''صرب فلوس اردوی -''

رخ دوم : ''طفر قرین ۳۹ الٰہی -'' دیکھو نمونہ نمبر ۱۲ -

اکبری دام ایک تولہ آٹھ ماشہ اور سات سرخ وزن میں ہوتا تھا ؛ اس کا مضاعف ٹنکہ کہلاتا تھا ؛ چناں چہ ٹکا اب بھی دو پیسوں کے لیے بولا جاتا ہے - دام کی پھر مختلف تقسیمیں تھیں ؛ مثلاً پون دام ، نصف ، ربع اور ہشتم حصہ جس کو دمڑی بھی کہا جاتا تھا - دمڑی دام کی سب سے چھوٹی تقسیم تھی ؛ اس پر عبارت ذیل ہوتی تھی :

رخ اول : ''ضرب فلوس -''

رخ دوم : ''ظفر قرین -'' ملاحظہ ہو نمبر ۱۳ و نمبر ۱۴ -

اردو ظفر قرین کے ایسے طلائی اور نقرئی سکے بھی موجود ہیں جن پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے - ان کی عبارت الفی سکوں کے مطابق ہے - صرف یہ فرق ہے کہ ان میں لفظ 'الف' داخل نہیں ہے (ملاحظہ ہوں نمبر ۱۵ و نمبر ۱۶) - انھی میں ایک مدور نصف روپیہ قابل ذکر ہے

جس کے رخ اول پر حسب معمول کلمہ وغیرہ ہے اور رخ دوم پر یہ الفاظ ہیں :

''جلال‌الدین محمد اکبر بادشاہ غازی - اردو ظفر قرین''

(ملاحظہ ہو نمبر ۱۷)

یہ یاد رہے کہ اردو ظفر قرین ایک سفری ٹکسال ہے اور اس کا کام اسی وقت جاری ہوتا ہے جب کہ بادشاہ سفر میں ہو ؛ جہاں سفر ختم ہوا اور بادشاہ سلامت دارالسلطنت پہنچ گئے اس ٹکسال کا کام بند ہو گیا -

اکبر کے جانشین نورالدین جہانگیر ۱۰۱۴ھ و ۱۰۳۷ھ کے عہد میں یہ ٹکسال موجود تھی اور خالی اردو کے نام سے یاد کی جاتی تھی ؛ لیکن یہ سکے بے حد نادر ہیں ؛ اب تک صرف دو سکے دریافت ہوئے ہیں - جہانگیر کا شوق فنون لطیفہ و شعر کے ساتھ اس کے سکوں سے بھی نمایاں ہے - اس کے اکثر مسکوکات پر اشعار درج ہیں ؛ چناں چہ ان دونوں سکوں پر بھی اشعار درج ہیں -

ان میں پہلا سکہ ایک روپیہ ہے جو تاریخ ۱۰۲۵ھ مطابق سنہ ۱۱ جلوس کا ہے اور لکھنؤ میوزیم میں موجود ہے - شعر ذیل اس پر نقش ہے :

بار دو سکہ در راہ دکن زد شاہ بحر و بر
شہنشاہ جہاں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر[1]

دوسرا سکہ ایک اشرفی ہے جو برج[2] حمل کی تصویر کی حامل ہے اور سال ۱۰۳۶ھ موافق سال بست و دوم جلوس کی ضرب ہے ، مسٹر نیلسن رائٹ کے قبضے میں ہے - یہی اشرفی برلن میوزیم میں بھی ہے - یہ شعر اس پر منقوش ہے :

---

۱ انگریزی فہرست مسکوکات پبلک میوزیم لکھنؤ جلد دوم (سکہ جہانگیری نمبر ۱۲۸۰) -

۲ - جہانگیری سکوں کا یہ سلسلہ جس میں دوازدہ بروج کی تصویریں ہوا کرتی تھیں ، سکہ شناسان ہند (باقی حاشیہ صفحہ ۲۶ پر)

باد رواں تا کہ بود مہر و ماہ
سکۂ اردوی جہانگیر شاہ[1]

شاہ جہان (۱۰۳۷ھ و ۱۰۶۸ھ) کا صرف ایک نثار[2] ضرب 'اردوی ظفر قرین' معلوم ہے ، جس کا ذکر فہرست پبلک میوزیم لاہور میں (صفحہ لط) ملتا ہے ۔

اورنگ زیب عالم گیر (۱۰۶۸ھ و ۱۱۱۸ھ) کا اکثر حصۂ عمر اردو میں گزرا ہے ، مگر اس کی اردو ٹکسال کا کوئی سکہ اب تک دریافت نہیں ہوا ؛ اس لیے ہم خیال کرتے ہیں کہ اس عہد میں اردو ٹکسال کا رواج ترک ہو چکا تھا ۔

لفظ اردو لشکر کا عام خطاب ہونے کی بنا پر بہ وجوہ کثرت استعمال کئی مرکب الفاظ کی ایجاد کا باعث بنا ہے ؛ مثلاً قاضی اردو ، اردو بیگی ، اردو کا مندر اور اردو بازار وغیرہ ۔

(صفحہ ۲۵ کا باقی حاشیہ) کی رائے میں ہندوستانی مسکوکات میں سب سے بہتر اور خوب صورت مانا گیا ہے ۔ یہ سلسلہ زیادہ تر آگرے اور احمد آباد کی ٹکسالوں کا مشہور ہے جس میں طلائی و نقرئی سکے شامل ہیں ؛ باقی ٹکسالوں کے نمونے کم ملتے ہیں ۔

۱ ۔ نمو مسٹک سپلمنٹ حصۂ اول صفحہ ۵۰۳، ۱۹۰۴ء ۔

۲ ۔ نثار اگرچہ شکل میں سکے کی طرح ہوتا ہے ، لیکن سکۂ رائج کی فہرست میں داخل نہیں تھا ۔ وہ سلاطین کی آمد کی تقریب پر مسکوک ہوتا تھا اور شہر میں سواری کے داخلے کے وقت نثار کر دیا جاتا تھا ۔ فقراء و مساکین اس کو لوٹ لیا کرتے تھے ۔ نثار پر لفظ نثار ، نام بادشاہ و تاریخ و نام شہر نقش ہوتا تھا ۔ بڑے نثار روپے کے برابر ہوتے تھے ، چھوٹے اس کے نصف یا ربع ہوتے تھے ۔ جہانگیر ، شاہ جہان ، عالم گیر و فرخ سیر کے نثار مختلف عجائب گھروں میں موجود ہیں ۔

قاضی اردو

پرانا نام قاضی العسکر یا قاضی لشکر ہے ۔ اسلام میں قضاء عسکر ایک قدیم منصب ہے ۔ صلاح الدین ایوبی (۵۶۴ھ و ۵۸۹ھ) کے عہد میں یہ منصب موجود تھا ۔ اس کے قاضی عسکر کا نام بہاؤالدین تھا ۔ عہد اکبری میں یہ عہدہ دار قاضی اردو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔ اس قاضی کے فرائض میں آور امور کے علاوہ جنگ و غنیمت کے موقعوں پر لشکر کے طرز عمل کی نگہ داشت بھی شامل تھی ۔ خلاف شرع کارروائیوں پر وہ روکتا اور ٹوکتا تھا ، حتیٰ کہ بشرط دیانت و تقویٰ خود بادشاہ کے مخالف شرع احکام پر بھی اعتراض کرتا تھا ۔ عبارت ذیل میں قاضی اردو قاضی طوایسی کی موقوفی کا ذکر ہے ۔ اس موقوفی کا باعث قاضی کا وہ احتجاج ہے جو اس نے بعض اسیران جنگ کے بارے میں کیا تھا جن کے لیے شہنشاہ اکبر نے گردن مارنے کا حکم دیا تھا اور قاضی مذکور نے بادشاہ کے اس حکم کو غیر شرعی بیان کیا تھا ۔

''و در واقعۂ قتل اسیران مردم خان زمان چون قاضی طوایسی[1] قاضی اردو که به صفت دیانت و حق گوئی و امانت انصاف داشت بعرض رسانیده بود که کشتن این جماعه بعد از جنگ و تصرف در اموال ایشان حسب شرع شریف جائز نیست ، از وی رنجیدند و قاضی یعقوب ساکن کڑا را که به علم فقه و اصول فقه مسهور و داماد قاضی فضیلت شیر شاهی که او را قاضی فضیحت میگفتند و با اینهمه خالی از مطائبه و هزلے نبود انتخاب کرده بجای قاضی طو ایسی نصب کردند ۔''
(منتخب التواریخ صفحه ۵-۱۹۶ نولکشور)

اردو بیگی یا 'اورده بیگی'

ہمیں اردو بیگی یا اوردہ بیگی کے منصب کی اصلی کیفیت سے

---

۱ ۔ طوایس من توابعات خراسان (منتخب التواریخ صفحه ۳۰۶ ، نولکشور ۱۸۶۸ھ) ۔

قرار واقعی اطلاع نہیں ہے۔ میرزا حیدر دوغلت اپنی تاریخ رشیدی میں قراباشا میرزا ایک امیر کو خاندان اردو بیگی کا سرپرست بیان کرتا ہے[1]۔ آئین اکبری سے مفہوم ہوتا ہے کہ اردو بیگی شاہی محل سرا میں ایک اونچی قسم کی ملازمہ ہوتی تھی ۔ چناں چہ فقرۂ ذیل میں یہ نام ملتا ہے :

''و پیوست آں بطول و عرض شصت گر گلیم سرا پرده ایستاده کنند و خیمۂ چند در آن برسب یابد ؛ اردو بگیان و دیگر زنان پارسا را آرامش جا باشد[2] ۔''

فرہنگ نورالابصار میں مرقوم ہے :

''اورده به معنی خانه و خانۂ بادشاه آمده و ازان است اطلاق اورده بگی بر زنانے که در خانۂ بادشاه اهتمام دارند[3] ۔''

گزشتہ صدی یعنی مغلوں کے آخری فرماں رواؤں کے دور میں دیکھا جاتا ہے کہ اوردہ بیگی مردانہ لباس میں ملبوس ہوتی تھی ۔ سر پر پگڑی ، کمر میں پٹکا یا سیلا باندھتی اور جریب ہاتھ میں رکھتی تھی ؛ محل سراؤں میں بادشاہ اور بیگموں کی چاکری بجا لاتی تھی ۔ اردو زبان میں اوردہ بیگی کا اردا بیگنی بنا لیا گیا تھا جس کی جمع اردا بیگنیاں ہے ۔ جمع کی حالت میں اس لفظ کا زیادہ رواج ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس نام کا اطلاق ایک جماعت پر ہوتا تھا ۔ یہاں 'بزم آخر' سے ایک مثال نقل ہے :

''کہاریاں ہوادار لائیں ، بادشاہ سوار ہوئے ، اردا بیگنیاں مردانے کپڑے پہنے ، سر پر پگڑی ، کمر میں دوپٹے باندھے ، جریب ہاتھ میں لیے اور حبشنیاں ، ترکنیاں ، قلماقنیاں جریب پکڑے تخت کے ساتھ ساتھ ہیں ۔''

۱۔ انگریزی ترجمہ تاریخ رشیدی از ڈاکٹر ڈینی سن راس صفحہ ۳۰۷ ۔

۲۔ آئین اکبری مرتبہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ صدر امین ضلع بجنور صفحہ ۳۲ ، مطبع اسماعیلی واقع دہلی ، ۱۲۷۲ھ ۔

۳۔ نسخۂ قلمی مملوکۂ پروفیسر محمد شفیع ۔

فرہنگ آصفیہ میں اس کی تشریح میں لکھا ہے :

"مردانہ لباس کی ہتھیار بند عورت جو شاہی محلوں میں پہرا چوکی دیتی ہے ۔"

اردو کا مندر

اس موقع پر جینی فرقے کے ایک مندر کا ذکر کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے جس کا نام اردو کا مندر ہے اور قلعۂ دہلی کے لاہوری دروازے کے قریب واقع ہے ۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ شاہجہان بادشاہ کے عہد میں تیار ہوا تھا اور دہلی میں جینیوں کے مندروں میں سب سے قدیم ہے ۔ بہ روایت مشہور یہ مندر ان جینی سپاہیوں نے تعمیر کیا تھا جو شاہجہان کی فوج میں ملازم تھے ۔ گویا خود مندر کا نام اس کے بانیوں کا تعلق اردوے شاہجہانی[1] سے ظاہر کر رہا ہے ۔اس عمارت کی بابت یہ قصہ شہرت حاصل کر چکا ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ عالمگیر نے اس مندر میں نوبت بجانے کی ممانعت کر دی ! جینیوں نے شاہی حکم کی تعمیل میں نوبت موقوف کر دی ؛ لیکن یہ ساز بغیر انسانی ہاتھ کے لگے ایک حیرت خیز طریقے سے خود بہ خود بجتا رہا ۔ اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع بادشاہ کے گوش گزار کر دی گئی ؛ عالمگیر کو یقین نہیں آیا اور اصل واقعے کی تفتیش کی غرض سے بہ ذات خود موقع پر آیا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نوبت بغیر کسی انسانی ہاتھ کی امداد کے آپ سے آپ بج رہی تھی ۔ یہ فوق العادت معرکہ دیکھ کر بادشاہ نے اپنا امتناعی حکم واپس لے لیا اور پجاریوں کو نوبت بجانے کی اجازت دے دی[2] ۔

اردو بازار

بازار ہر عہد میں مشرقی لشکروں کا ایک ضروری عنصر تھا ۔

---

۱ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو بازار یا اس کے قرب میں واقع ہونے کی بنا پر اردو کا مندر کہلایا ۔

۲ ۔ "واقعات دارالحکومت دہلی" از بشیرالدین احمد جلد دوم صفحہ ۲۰۶ ، ۱۹۱۹ء ۔

ایک پرانا حوالہ لطائف الطوائف میں سلطان سنجر اور رشید وطواط کے قصے میں ملتا ہے جو حسب ذیل ہے :

''سلطان فرمود کہ رشید را پیدا کنند ۔ بعد از تفحص بلیغ او را درگوشۂ یافتند و خبر بہ سلطان آوردند ؛ حکم کرد او را بر سر اوردوی بازار برند و بہفت پارہ کنند ۔''

ایک مغربی حوالہ ۱۵۶۰ء کا ھاسن جاسس میں صفحہ ۶۴ پر ٹیریرو کی تصنیف سے منقول ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :

''یہ لوگ اس مقام (یا پڑاؤ) کو اردو بازار کہتے ہیں۔''
(طبع ۱۸۲۹ء باب ہفدھم صفحہ ۴۵)

ہندوستان میں یہ اصطلاح مغلوں کے عہد سے رائج ہے اگرچہ کوئی قدیم تحریری سند مجھ کو معلوم نہیں ہے ۔ نورالانصار میں جو عہد محمد شاہی کی ایک فرہنگ ہے ، 'اوردو' کی شرح میں بیان ذیل ملتا ہے :

''بازار سے کہ نزدیک بہ خیمۂ بادشاہی ہمراہ باشد ؛ بنا بر قرب خیمہ اطلاق کنند۔''

اس عہد کی ایک اور سند جو نادر شاہ ۱۱۴۸ھ و ۱۱۶۰ھ کے لشکر سے متعلق ہے اور اردو بازار اور افسر بازار کی مجمل کیفیت پر روشنی ڈالتی ہے ، ایک انگریز تاجر سیاح ایران کی تالیف میں ملتی ہے ۔ ذیل میں اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے :

''لشکر کا وہ حصہ جو ترکی زبان میں اردو بازار یا بازار لشکر کہلاتا ہے ، چوکی خانے کے سامنے والے چوک سے شروع ہوتا ہے اور طول میں نصف میل تک پھیلا ہوا ہے ۔ یہ بازار ایک گلی کی طرح خیموں کی دو طرفہ قطار پر شامل ہے اور بہ خط مستقیم سیدھا چلا گیا ہے ۔ جہاں تک کہ زمین کی حالت اجازت دیتی ہے اس کی نگہ داشت ایک افسر کے سپرد ہے جو 'اردو بازاری' کہلاتا ہے ۔ بہ غرض امن دن میں کئی مرتبہ وہ بازار کی گشت لگاتا ہے ؛ جہاں کہیں

جھگڑا فساد ہوتا دیکھتا ہے فریقین کو داروغۂ بازار کی خدمت میں بھجوا دیتا ہے۔''

اسی صدی کی ایک اور مثال 'ھیر وارث شاہ' میں بہ صورت 'ارد بازار' ملتی ہے:

ترا طور کچھ ہور دا ہور جاپے خوار خجلاں دا چشم چار دانی
وارث شاہ کچھ رخت وھاج لیئے ہوھا ہے کھلا ارد بازار دانی[1]

'ارد بازار' اصل میں اردو بازار ہے جو اس تصنیف میں کئی موقعوں پر مستعمل ہوا ہے۔

۱۰۵۸ھ میں شاہجہان بادشاہ نے نئی دھلی تعمیر کی؛ اس کی تاریخ اس مصرع سے برآمد ہوتی ہے:

شد شاہ جہان آباد از شاہ جہان آباد

اس سے پیشتر سال گزشتہ میں قلعۂ دھلی تیار ہو چکا تھا۔ قلعۂ دھلی کا مغربی دروازہ جو چاندنی چوک کو جھانکتا ہے اور شہر پناہ کا مغربی دروازہ (جو ایک دوسرے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہیں) دھلی اور لاھور کی شاھراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے لاھوری دروازوں کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان دروازوں کے مابین شہر کا بازار خاص واقع تھا جو قلعے کے لاھوری دروازے سے شروع ہو کر سارے شہر کو چیرتا ہوا شہر کے مغربی دروازۂ لاھوری پر ختم ہوتا تھا۔ زمانۂ حال میں اس بازار کے مختلف حصے مختلف ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں؛ مثلاً کوتوالی، گھنٹہ گھر، چاندنی چوک، فتح پوری اور کھاری باؤلی۔ اس بازار کا قلعے کی طرف والا حصہ گزشتہ صدی کے وسط میں اردو بازار کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے متعلق سید احمد خان بہادر اپنی تصنیف 'آثار الصنادید' میں تحریر فرماتے ہیں:

''اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار

---

۱ ۔ ھیر وارث شاہ صفحہ ۱۸۲ طبع شیخ برکت علی شوکت علی کشمیری بازار لاھور ۔ ۱۹۲۶ء

شامل ہیں ۔ مگر اگلے زمانے میں یہ بازار لاہوری بازار یا اردو بازار کہلاتا تھا. . . . . یہ بازار قلعے کے لاہوری دروازے سے فتح پوری تک ہے ۔ اس بازار کے پہلے حصے کو تو اردو بازار کہتے ہیں اور اس کے آگے جہاں ترپولیہ اور کوتوالی ہے وہ اسی نام سے مشہور ہے اور اس کے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے. . . . . . . اور اس کے آگے فتح پوری کا یہ بازار ہے ۔ چالیس گز کے عرض سے بیس گز ادھر اور بیس گز اُدھر ، بیچ میں سرتا سر نہر جا رہی ہے ؛ ارد گرد نہر کے دو دشتہ درخت لگے ہوئے ہیں ۔"

لیکن اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ و ۱۲۵۳ھ) کے عہد کی ایک تصنیف سے جس کے ایک نسخے نوشتہ ۱۲۳۶ھ کے چند اوراق میرے پاس ہیں اور جو شہر دہلی کی عمارات و کٹبات و شوارع کے ذکر پر مشتمل ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اردو بازار سارے بازار کا نام تھا ۔ اس کی عبارت ہے :

"بازار اردو کہ پس دروازۂ مرسوم قلعۂ مبارک است از لاہوری دروازۂ قلعہ تا لاہوری دروازۂ شہر پناہ ۔"

یہ نا معلوم مصنف پورے بازار کی اکثر مگر چیدہ چیدہ عمارات کا ذکر کرتا ہے ۔ پہلے بازار کے شمالی بازو کو تفصیلاً بیان کرتا ہے پھر جنوبی بازو کو لیتا ہے ۔ اس بازار کا مفصل بیان جیسا کہ ۱۲۳۶ھ میں وہ تھا یہاں ذکر کرنا اگرچہ دل چسپی سے خالی نہیں ، لیکن میں بہ خوف طوالت اس سے دست کش ہوتا ہوں اور صرف دو ایک امور کا ذکر کرتا ہوں ۔

مصنف کے بیان کے مطابق کوتوالی چبوترے کے سامنے ایک اونچا لکڑا گڑا تھا جس کا نام 'لعل خاں لکڑ' تھا ۔ مجرموں کو اس کے ساتھ باندھ کر پیٹا جاتا تھا ۔ کچھ عرصہ قبل تک یہاں ایک چرخ یا شکنجہ بھی تھا جس کے ذریعے سے خونیوں کو سزا ملتی تھی ۔ بازار کی جنوبی سمت میرزا اشرف بیگ کا شیش محل تھا جس کے قریب اسی میرزا کا گھڑیال تھا ۔ چاندنی چوک کے وسط میں حوض فیض نہر تھا جو اب گھنٹہ گھر کا محل وقوع ہے ۔

گزشتہ صدی کے پہلے ربع میں اگرچہ تمام بازار اردو بازار کے نام سے موسوم تھا لیکن شاہ جہان کے اواخر عہد کے ایک کتبے سے جو کٹڑہ میداگراں کے دروازے پر مزید پارچہ کے قریب کھاری باؤلی میں نصب تھا ، معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کا سارے بازار پر اس وقت اطلاق نہیں ہوتا تھا - یہ کتبہ جو خاصا دراز ہے ، در حقیقت محمد معروف المخاطب بہ خواص خاں کا وصیت نامہ ہے جس کی رو سے خان موصوف نے اپنی تمام جائداد یعنی چند منزل کٹڑے ، حویلیاں ، دوکانیں ، حمام ، چند قطعات باغ اور زمین مع پندرہ منزل دیگر دوکانات کے اپنی بہن کے نواسے محمد اسماعیل کی تولیت میں برائے مصارف آثار شریف و تبرکات و عرس مولود نبی کریم و درس علوم دینی و مسجد جامع و خانقاہ مبارک وقف کر دی تھی - اس کتبے میں کھاری باؤلی کو 'گذر لاھوری دروازہ' کے نام سے عبارت ذیل میں یاد کیا گیا ہے - چنانچہ :

''واقع اندرون شہر پناہ گذر لاھوری دروازہ نزدیک مزید پارچہ مقرر کرد -''

اس سے یہ امر تو صاف ظاہر ہے کہ اس عہد میں اس بازار کا کوئی خاص نام نہیں تھا - علیٰ ھذا محمد وارث جو عہد شاہ جہانی کا مورخ ہے اور اپنی تاریخ میں اس بازار اور اس کے دونوں چوکوں کا ذکر کر رہا ہے اور کسی قدر اس کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے ، کسی خاص نام سے اس کو یاد نہیں کرتا - اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو بازار کا استعمال خواہ تمام بازار کے لیے ، خواہ اس کے ایک حصے کے واسطے ، اس عہد سے بعد کا معاملہ ہے جو عالمگیر کے عہد میں کسی وقت ظہور میں آتا ہے - اس زمانے کی ایک سند ہمیں تاریخ 'منتخب اللباب' خافی خاں میں ملتی ہے جو ذیل میں ھدیۂ ناظرین ہے :

''تا آنکہ روزے پادشاہ بہ نماز جمعہ تشریف می آوردند از در قلعۂ مبارک تا مسجد جامع آنقدر ہنود فراھم آمدہ بقصد استغاثہ سر راہ خلد

مکان گرفتند و اژدهام نمودند که راه تردد مردم مسدود گردید و صرافان و بزازان و کل کاسبان اردو بازار و جمیع اهل حرفۂ شہر ترک کسب و پیشه نموده به مرتبه ما بین راه جمع آمدند که بعد سوار شدن بادشاه باوجود فرمودن اهتمام از روی زجر که سرو دست و پای جمعے شکست رسیدند ، سواری خاص تا مسجد متعذر گردید -'' (صفحہ ۲۲۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اردو بازار پورے بازار کے لیے مستعمل تھا ، بعد میں یہ اس حصۂ بازار کے لیے مخصوص ہو گیا جو قلعے کی جانب سے شروع ہو کر جونی دروازے پر ختم ہوتا ہے ۔ مسٹر کار اسٹیفن اپنی تالیف ''مونومینٹل ریمنز آف دھلی'' (یادگار اثریات دھلی) میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

''بازار کا وہ حصہ جو قلعے کے لاھوری دروازے اور دریبے کے دروازے معروف بہ 'جونی دروازہ' کے مابین واقع ہے ، اردو بازار یا لشکر کا بازار کہلاتا ہے ؛ غالباً اس بنا پر کہ قلعے کی مقامی فوج کا ایک دستہ کسی وقت وھاں مقیم رہ چکا ہے[۱] ۔''

یہ بازار یا اس کا اکثر حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تباہ ہو گیا ہے ۔ اس کے متعلق ایک تلمیح میرزا اسد اللہ خان غالب کے ایک خط میں جو میر مہدی کے نام ہے ، مذکور ہے اور تلمیحی فقرہ یہ ہے :

واہ رے حسن اعتقاد! ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رھا ، اردو کہاں ! دلی کہاں ! واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے ، چھاؤنی ہے[۲] ۔

میں نے اس بازار کے ذکر میں کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے ، مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر مصنفین اس بازار کے نام پر ہماری زبان کا نام اردو رکھ رہے ہیں جو بہ ظاہر ایک بے قرینہ اور ناموزوں بات معلوم ہوتی ہے ۔ اس کے مقابلے میں لشکر کی بناء پر

---

۱ - صفحہ ۲۴۶ ، ۱۸۷۶ء

۲ - اردوے معلی ، غالب ، طبع اکمل المطابع ، ۱۸۸۴ء ۔

جس کو اردو بھی کہا جاتا تھا ، زبان کا نام اردو کہا جانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے ، اور بعض بزرگوں کی رائے بھی یہی ہے ، لیکن اکثریت اس کے خلاف ہے ۔ ان کے نزدیک بازار کی بناء پر زبان کا نام اردو رکھا گیا ۔ اس بارے میں ہر مصنف کی رائے مختلف ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ اردو بازار دھلی کی وجہ سے یہ نام ملا ؛ بعض نے اس میں تعمیم کر دی ہے اور بازار لشکر پر قناعت کی ہے ۔ پھر ایک گروہ ایسا ہے جو شاہ جہانی لشکر کے ساتھ زبان کی ایجاد منسوب کرتا ہے ۔ میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ان مختلف رایوں کو ذیل میں درج کر دوں ۔

سب سے بیشتر صاحب 'ظہیرالانشا' کی رائے نقل کرتا ہوں جس میں زبان اردو کی وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے :

''چوں بازار را در ترکی و فارسی اردو گویند ضرورت استعمال این زبان مرکب در بازارہا ضرور بر شد ، خصوصاً در بازار خاص بادشاھی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اردوے معلّی بود ۔ لہذا نامزد تازہ مرکب نیز اردوے معلّی قرار یافت تا این کہ بانقراض ازمنہ آن تخصیص آداب شاھی باقی نماند ، آن التزام لفظ معلّی ھم نماند ، فقط اردو باقی ماند ۔ پس وجہ تسمیۂ اردو ھمین است ۔''
(منقول 'ازجلوۂ خضر') —

اس بیان کی رو سے اردو بازار تعظیماً اردوے معلّی کہلاتا تھا لیکن اردو بازار کے بیان میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ۔ لشکر کے لیے اردوے معلّی کا خطاب اکبر کے عہد سے مستعمل رہا ہے ، لیکن میر امنؒ بھی اس بازار کو اردوے معلّی کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ چناں چہ :

''جب حضرت شاہ جہان صاحب قران ثانی نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب شاہ جہان آباد مشہور ہوا ۔ اگرچہ دلی جدی ہے ۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے ۔ اور وہاں کے بازار کو اردوے معلّی خطاب دیا ۔'' (صفحہ ۴ 'باغ و بہار')

سید احمد خاں بہادر کتاب 'آثارالصنادید' میں لکھتے ہیں :

''اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے ، اور بادشاہی امیرالامرا اسی کو بولا کرتے تھے - گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی - ہوتے ہوتے خود اس زبان کا نام اردو پڑ گیا -''

مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرۂ 'گلستان سخن' میں کہتے ہیں :

''چو کہ یہ لوگ اردوے معلی سلاطین کے متعلمین سے تھے ، اہل ہند ان الفاظ کو زبان اردو کہتے تھے ، یعنی یہ الفاظ جو ہماری زبان میں مل گئے ہیں سلاطین کے اردو کی بولی کے ہیں - لیکن رفتہ رفتہ یہ زبان بارہ کہ مجموع الفاظ ہندی و لغات السنۂ مختلفہ سے بہم پہنچی تھی ، زبان اردو کے اسم سے مسمی ہو گئی -''

(صفحہ ٦٥ ، تذکرۂ گلستان سخن ، طبع ۱۲۷۱ ھ ، ۱۸۵۴ ء)

عبدالغفورخاں بہادر نساخ رسالہ در تحقیق زبان اردوے معلی موسوم بنام تاریخی ''زبان ریختہ'' میں یوں رقم طراز ہیں :

''معلوم ہو کہ زبان اردو کو اردو کیوں کہتے ہیں ؛ اس کی وجہ تسمیہ کو بعضوں نے اس طرح پر لکھا ہے کہ زبان فارسی و ترکی میں اردو لشکر کو کہتے ہیں اور چونکہ یہ زبان لشکری و حضوری ایستادگان پائے تخت شاہی کی زبان پر جاری ہوئی اس لیے اس زبان کا نام اردو پڑ گیا -''

(صفحہ ۲ ، زبان ریختہ ، طبع نولکسور ۱۲۷۴ ھ)

خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم میں منشی درگا پرشاد گویا ہیں :

''جبکہ شاہجہاں کے عہد دولت میں اردو بازار کی جو قلعے کے نیچے تھا ، اردو زبان مقرر ہوئی -''

(خزینۃ العلوم ، صفحہ ۵۲ طبع منشی گلاب سنگھ ، ۱۸۷۹ ء)

شمس‌العلما مولوی محمد حسین آزاد کی رائے 'آب حیات' میں یہ ہے :

''ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں - اردوے شاہی اور

دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے ، وھاں کی بولی کا نام اردو ہوگیا ۔ ایسے فقط شاھجہان کا اقبال کہنا چاھیے کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو کی طرف منسوب مشہور ہو گئی ۔''
(آب حیات ، صفحہ ۲۰-۲۱ ، ۱۸۸۱ء)

زبان اردو کی تاریخ میں منشی چرنجی لال کا خیال ھے :

''چوں کہ لشکر کے بازار کو اردو کہتے تھے اس وجہ سے اس بازار کی بولی کا نام بھی اردو ہو گیا ۔''
(صفحہ ۳۶ مطبع رضوی ۔ دھلی ستمبر ۱۸۸۳ء)

سید احمد مصنف 'فرھنگ آصفیہ ' کا عقیدہ ذیل میں درج ھے :

''چوں کہ اول اول شاہ جہانی لشکر سے ابتدا ھوئی لہذا اس کا نام بھی اردو پڑ گیا ۔ قلعۂ معلیٰ کے لاھوری دروازے کے سامنے اردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا جو بلاقی بیگم کے کوچے اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع تھا ۔''
(دیباچہ فرھنگ آصفیہ)

ایک امر قابل لحاظ ھے کہ بارھویں صدی ھجری میں یعنی محمد شاہ (۱۱۳۱ھ و ۱۱۶۱ھ) کے دور میں اردوے معلیٰ خاص معنوں میں مستعمل ہو رہا ھے ۔ اس کے ذیل میں نہ صرف لشکر داخل ھے بلکہ درباری لوگ و دیگر اراکین و ملازمین شاھی بھی شامل ھیں ۔ دوسرے الفاظ میں اھل سیف و اھل قلم کی جماعتیں اس میں محسوب ھیں ۔ خان آرزو 'عرائب اللغات' میں جو اردو الفاظ پر ایک رسالہ ھے اور عبدالواسع ھانسوی کے رسالۂ ھندی لغات کی ایک اضافہ شدہ و اصلاح یافتہ اشاعت ھے ، لفظ چھنال کی تشریح میں کہتے ھیں :

''چھنال در رسالہ زنے کہ سر از خانہ بیروں کند و چوں کسے بیند باز پس شود ۔ لیکن چھنل معلوم نیست کہ لغت کجا ست ۔ ما مردم کہ از اھل ھندیم و در اردوے معلیٰ می باشیم نشنیدہ ایم و ظاھرا چھنال بہ معنی مطلق زن بدکارہ آمدہ ۔''

اردوے معلی سے خان صاحب کی مراد غالباً شہر دھلی کی آبادی کا وہ حصہ ھے جو قلعۂ معلی کے قرب و جوار میں بوجہ ملازمت شاھی زیادہ آباد ھے اور جس میں فوجی و منصب دار و درباری و دیگر ملازمین و شاگرد پیشہ شامل ھیں۔ یہ لوگ شہر کے دیگر محلوں اور آبادی سے مقابلے میں زیادہ شستہ و مہذب تھے اور ظاھر ھے کہ اس طبقے کی زبان زیادہ صاف اور ستھری ھو گی۔

سید انشاء اللہ خان اپنی تالیف 'دریاے لطافت' میں قریب قریب اسی رائے کا اظہار کرتے ھیں۔ ان کا بیان ھے :

"بعد تامل به قدر سلیقه و فهم این هیچ مدان چنین معلوم میشود و ظاهر که راست باشد که زبان شاه جهان آباد زبان اشخاص قابل مصاحبت نسبه دربار رس و گویائی زنان بری پیکر و کلام اهل حرفه از مسلمانان و گفت گوئی شهدها و الفاظ خدم و نیز از قبیل شاگرد پیشهٔ امراء است تا خاکروب هم داخل همین جماعت باشد این مجمع هر جا که برسد اولاد آنها دلی وال گفته شوند و محلهٔ ایشان محلهٔ اهل دهلی۔ و اگر تمام شهر را فراگیرند آن شهر را اردو نامند لیکن جمع شدن این حضرات در هیچ شهرے سواے لکھنؤ نزد فقیر ثابت نیست ، گو باشندگان مرشد آباد و عظیم آباد برعم خود خود را اردو دان و شهر خود را اردو دانند۔ زیرا که شاه جهان آبادیان به قدر یک محله در عظیم آباد جمع باشند و در وقت نواب صادق علی خان عرف میرن و نواب قاسم علی خان عالی جاه همین قدر در مرشد آباد یا زیاده۔"

(صفحہ ۷۰–۷۱ ، دریاے لطافت ، انجمن ترقی اردو)

یا اردوے معلی سے مقصد محض لشکر ھے کیوں کہ زبان اردو سے مراد زبان لشکر ھے۔ وارستہ جو بہار اور خان آرزو کا معاصر ھے ، اپنی کتاب 'مطلع السعدین' تصنیف ۱۱۶۸ھ میں مجدالدین علی قوسی شوستری کے حوالے سے لکھتا ھے :

''لہذا مجدالدین قوسی شاستری در کتاب لغت[1] خود کہ مسودۂ آن بہ خط خودش بہ نظر این بے سواد رسید ''پہلوی از عالم زبانے کہ در اردوے معلی بادشاهی بدان متکلم باشند'' نوشتہ بل گروهے برین رفتہ اند کہ پہلوی و دری یکے اسب چہ دری زبان مردم درگاہ ملوک اسب و پہلوی زبان اردو۔''

بہرحال لشکر یا بازار یا خدم و حسم شاهی کی بنا پر یہ زبان ابتدا میں اردوے معلی کہلائی ؛ لیکن یہ خیال کہ شاہ جہان کے عہد سے اس زبان نے رواج پایا ، قرین قیاس نہیں ، کیوں کہ یہ زبان شاہ جہان کے عہد سے قبل موجود تھی اور اردو کا استعمال زبان کے تعلق میں شاہ جہان کے عہد سے بہت بعد کا واقعہ ہے اور سید محمد تقی میر ، شاعر مشہور پہلے شخص ہیں جو اس لفظ کا استعمال بہ معنی زبان ریختہ کرتے ہیں ۔ 'تذکرۂ نکات الشعراء' میں جو بہ قول علامہ شروانی[2] احمد شاہ (۱۱۶۱ھ و ۱۱۶۸ھ) کی تالیف ہے ، میر صاحب تحریر فرماتے ہیں :

''پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کہ شعریست بہ طور شعر فارسی بزبان اردوے معلی شاہ جہان آباد دهلی کتابے تا حال تصنیف نشدہ ۔''
(صفحہ ۱ ، 'نکات الشعراء سلسلۂ' انجمن ترقی اردو)

میر صاحب کے بعد محمد حسین عطا خان تحسین المخاطب بہ مرصع رقم ہیں ؛ جب وہ فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں

---

۱ ۔ مجدالدین قوسی کی تصنیف سے مراد 'فرهنگ قوسی' ہے ۔ اس کتاب کی تاریخ تالیف سے ہم نا واقف ہیں لیکن اس کے حوالے کتاب عین عطا تالیف ۱۱۶۲ھ و سراج اللغۃ خان آرزو تالیف ۱۱۴۷ھ میں ملتے ہیں ۔ بلا خمین اپنے مضمون فارسی لغات میں (رسالہ ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال بابت ۱۸۶۸ء صفحہ ۲۶) اس کا ذکر کرتا ہے ۔

۲ ۔ ملاحظہ ہو مقدمہ نکات الشعراء از حبیب الرحمان خان شروانی صفحہ ۲ ۔

داخل ہوئے ہیں ، ایک روز انھوں نے امیر خسرو کی ، چار درویش ، فارسی کے مجوزہ ترجمے کا ایک حصہ نواب وزیر کو سنایا ؛ اس نے بہت پسند کیا اور کتاب کی تکمیل کی فرمائش کی ۔ مؤلف نے ہمہ تن مصروف ہو کر اس کام کو سر انجام دیا اور کتاب جس کا نام 'نو طرز مرصع ' تھا نواب کی خدمت میں پیش ہونے والی تھی کہ ۱۱۸۸ ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا ۔ تحسین کچھ عرصے خاموش رہا ، بعد میں دیباچۂ کتاب میں ایک قصیدہ بہ مدح نواب آصف الدولہ داخل کر کے کتاب مذکور نواب کی خدمت میں پیش کی[1] ۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کی نوابی کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہو گا ۔ 'نوطرز مرصع' کا فقرہ جس میں 'زبان اردوے معلیٰ' مذکور ہے ، حسب ذیل ہے :

''اور یہ کہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوے معلیٰ کا رکھتا ہو ، مطالعہ اس گلدستۂ بہارین کے سے ہوس و شعور فحوای کلام کا حاصل کرے ۔''

اس عہد کے اکثر مصنفین زیادہ تر اردوے معلیٰ لکھنے کے عادی ہیں ؛ یہاں چند اور حوالے ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں :

''بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امروھہ بود برخوردم ۔ آن عزیز مرا تکلف موزون کردن ریختہ کہ شعریست بہ طور شعر فارسی بزبان اردوی معلیٰ بادشاہ ہندوستان و در آن وقت رواج داشت ، کرد ۔ خودکشی کردم و مشق خود بہ مرتبۂ رسانیدم کہ موزونان شہر را مستند شدم ۔''

(ذکر میر ، تالیف ۱۱۹۶ ھ' صفحہ ۶۷' طبع انجمن ترقی' اردو)

''کہ شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوے معلیٰ شاہ جہاں آباد موزون بکنید ۔'' (قدرت)

---

۱ - پروفیسر بلومہارٹ ، فہرست مخطوطات ہندوستانی' انڈیا آفس لائبریری میں کتاب پیش کرنے کا سال ۱۷۸۰ء — ۱۱۹۳ء خیال کرتے ہیں ۔

''محمد قادری کے طوطی نامے کا ، جس کا ماخذ طوطی‌نامۂ ضیاءالدین نخشبی ہے ، زبان ہندی میں موافق محاورۂ اردوے معلیٰ کے عبارت سلیس و خوب ، الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطی نامہ رکھا ۔''
(سید حیدر بخش حیدری ار طوطا کہانی تالیف و طبع ۱۲۱۵ھ)

''اور اب اس عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے مطابق سن بارہ سے پندرہ اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خان نے جو متخلص بہ اشک ہے ، بموجب خواہش مسٹر گلکرائسٹ صاحب عالی شان والا مناقب کے ، واسطے نو آموزوں زبان ہندی کے اس قصے کو زبان میں اردوے معلیٰ کے لکھا ، تا کہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے ۔'' (داستان امیر حمزہ از خلیل علی خاں)

بعد کے اردو نگار لفظ معلیٰ ترک کرکے صرف 'زبان اردو' کہتے ہیں ۔ ان میں سب سے مقدم شیخ غلام ہمدانی مصحفی شاعر شہور ہیں ۔ ذیل میں ان کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں :

۱) البتہ مصحفی کو ہے ریختہ میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زبان داں اردو کی وہ زباں کا

۲) خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اس موقع پر ہمیں لاہور کے پیروں کے خاندان کے ایک فرد ر مراد شاہ کا تذکرہ کرنا چاہیے ۔ یہ اپنے والد ماجد پیر کرم شاہ کی یت میں ۱۱۹۶ھ میں ہندوستان گئے اور لکھنؤ میں زیادہ قیام کیا ۔ الد کی وفات کے بعد پیر مراد شاہ نے ایک منظوم خط ۱۲۰۳ھ میں ران وطن کے نام ارسال کیا ہے ۔ اس خط سے دو شعر یہاں نقل رتا ہوں :

برائے تحفۂ یاران آں سو
گہرہا آرم از بازار اردو

وہ اردو کیا ہے یہ ھندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

باقی حوالے بہ قید تاریخ یہاں عرض کیے جاتے ھیں :

۱۲۱۵ھ : "ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر۔"

(باغ اردو از میر شیر علی افسوس ، ۱۲۱۵ھ)

۱۲۱۷ھ : "حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے۔"

(باغ و بہار ، میر امن صفحہ ۴)

۱۲۲۰ھ : "ختم شد اردو ترجمۂ تاریخ شیر شاهی بہ تاریخ ۵ جمادی الاول ۱۲۲۰ھ"

۱۲۲۱ھ :
"اپنے رتبے میں گو ہر ایک زباں
حسن ترتیب سے رکھے ہے شاں
ان میں سے پر زبان اردو کی
ہے لطافت میں معدن خوبی"

(صرف اردو منظوم از مولوی امانت اللہ)

۱۲۳۱ھ : "بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنی عربی و فارسی و ترکی و پرجی و غیر آن۔"

(دریائے لطافت از انشا)

۱۲۳۵ھ : "رسالۂ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے ، تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر ، لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ هوویں۔"

مغربی مصنفیں میں مسٹر گلکرائسٹ پہلے شخص ھیں جو اپنی انگریزی تالیف 'قواعد زبان ھندوستانی' طبع ۱۷۹۶ء مطابق ۱۲۱۰ھ میں اردو کا استعمال کرتے ھیں ۔ ان کے جملے کا ترجمہ یہ ہے :

"ریختہ وہ مخلوط زبان جس کو اوردو یا دربار کی شستہ زبان بھی کہتے ھیں۔"
(صفحہ ۲۶۱)

اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ لفظ عام رواج میں آ جاتا ہے اور زبان کے دوسرے پرانے نام مثلاً ہندی و ریختہ متروک الاستعمال ہونے لگتے ہیں ۔

قبل اس کے کہ یہ مضمون اختتام تک پہنچایا جائے ، میں ایک امر کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں ۔ وہ یہ ہے کہ جناب حکیم شمس اللہ قادری لفظ اردو (بہ معنی زبان) کے لیے رسالۂ اردوے قدیم میں ایک بڑی قدامت کے مدعی ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ مغلوں کی آمد سے قبل یہ لفظ بہ معنی لسکر و زبان ہندوستان میں استعمال ہو رہا ہے ۔ اپنے بیان کی تائید میں حکیم صاحب نے 'مؤیدالفضلا' کے ایک فقرے سے استناد کیا ہے ۔ میں انھی کے الفاظ یہاں نقل کرتا ہوں :

"مؤیدالفضلا سے (جو فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے ایک عرصہ پہلے سلطان ابراھیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اسلامی لسکرگاھیں اردو کہلاتی تھیں اور زبان اردو کو اھل اردو کی زبان کہا کرتے تھے ۔ چناں چہ کتاب مذکور میں ایک مقام پر تحریر ہے :

"در زبان اھل اردو خون خرابا نامند"

بقول بلاخمین کتاب مؤیدالفضلا ۹۲۹ھ میں تالیف ہوتی ہے ۔ حکیم صاحب نے جو فقرہ نقل کیا ہے نولکشور کی مطبوعہ مؤیدالفضلا ۱۸۹۹ء سے ماخوذ ہے لیکن نولکشوری نسخہ ایک ایسے نسخے پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ و ۱۰۱۴ھ) کے عہد کے بعد بہ ظاہر تیار ہوا ہے ۔ اس میں سینکڑوں ایسے الفاظ موجود ہیں جو قلمی نسخوں میں نہیں ملتے ؛ اگرچہ نولکشوری نسخے کے مرتبوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا نسخہ مصنف علیہ‌الرحمۃ کے مسودۂ خاص سے تیار ہوا ہے :

"علی الخصوص از نسخۂ کہ خاص مسودۂ مصنف مذکور بود"
(صفحہ ۵۶۶ ، جلد اول ، مؤیدالفضلا)

تاهم دیکھا جاتا ہے کہ مؤبد کی جلد اول میں لفظ برسم کی تشریح کے سلسلے میں یہ عبارت مرقوم ہے :

''و فقیر گوید کہ این لغت را از مجوسے کہ در دین خود بغایت فاضل بود و اردشیر نام داشت و در عہد محمد اکبر شاہ از کرمان بہ ہندوستان آمدہ بود تحقیق نمودم ۔'' (صفحہ ۱۵۹)

یہ بیان مصنف مؤیدالفضلا کا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اکبر کے عہد کے بعد تک اس کا زندہ رہنا قرین قیاس نہیں ہے میں خیال کرتا ہوں کہ نولکشور نے ایک ایسا نسخہ طبع کیا ہے، جس میں کسی نامعلوم شخص نے عہد اکبری کے بعد بہت کچھ اضافے کیے ہیں ۔

لیکن سب سے اہم یہ امر ہے کہ حکیم صاحب کا منقولہ فقرہ ''در زبان اہل اردو چون حرابا گویند'' مجھے قلمی نسخوں میں نہیں ملا اور کوئی تعجب نہیں اگر مطبع کے مصحح نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو ۔

اردوے قدیم کے متعلق چند تصریحات

(ایک جواب)

(از 'اورینٹل کالج میگزین' بابت مئی ۱۹۳۱ء)

اس عنوان سے ڈاکٹر محمد باقر ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی ، پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے ماہ فروری کے رسالۂ 'اورینٹل کالج میگزین' میں ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جس میں صفحہ ۴۰ سے صفحہ ۴۶ تک انھوں نے میری بعض مزعومہ غلطیوں کو جو میری تالیف 'پنجاب میں آردو' طبع ۱۹۲۸ء کی تحریر کے وقت مجھ سے سر زد ہوئی تھیں ، بے نقاب کیا ہے ۔ ان کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) میں نے نامۂ مراد کا سال تالیف ۱۱۹۴ء مقرر کیا حالاں کہ یہ خط اس وقت سے سات سال بعد یعنی ۱۲۰۳ھ میں نظم کیا جاتا ہے ۔

(۲) نامۂ مراد کی تاریخ تصنیف معین کرنے میں غلطی کھا جانے کی وجہ سے میں نے یہ بھی لکھا کہ لفظ 'آردو' کا استعمال مراد شاہ کے ہاں تحسین کی طرح قدیم ہے ۔ گویا تحسین نثر میں اور یہ نظم میں سب سے پہلے لاتے ہیں ۔

(۳) ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ مصحفی کا تذکرۂ ہندی تحسین کی 'نو طرز مرصع' سے چار سال قبل تالیف ہوتا ہے ۔ نیز یہ کہ تحسین نے سب سے پہلے نثر میں آردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال نہیں کیا بلکہ یہ مصحفی ہے ۔

ان نمبروں کا جواب علیحدہ علیحدہ عرض کرتا ہوں -

(۱) مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے 'پنجاب میں اردو' سے میرے ایک قدیم بیان کو لے کر اس پر تنقید شروع کر دی اور میرے بعد کے بیان کو جو اس تالیف کے ایک سال بعد ہی 'اورینٹل کالج میگزین' ماہ مئی ۱۹۲۹ء کے نمبر میں شائع ہو چکا ہے ، نظر انداز کر دیا - یہ مضمون سال مذکور کے ماہ جنوری میں مینرڈ ہال میں پڑھا گیا تھا - اس کا عنوان ہے :

'اردو زبان اور اس کے مختلف نام'

میں اس مضمون سے ایک اقتباس ڈاکٹر صاحب کی اطلاع کے لیے یہاں درج کرتا ہوں :

''اس موقع پر ہمیں لاہور کے پیروں کے خاندان کے ایک فرد پیر مراد شاہ کا تذکرہ کرنا چاہیے - یہ اپنے والد پیر کرم شاہ کی معیت میں ۱۱۹۶ھ میں ہندوستان گئے اور لکھنؤ میں زیادہ قیام کیا - والد کی وفات کے بعد پیر مراد شاہ نے ایک منظوم خط (نامۂ مراد) ۱۲۰۳ھ میں یاران وطن کے نام ارسال کیا ہے - اس خط سے دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں :

برائے تحفۂ یاران آں سو
گہرھا آرم از بازار اردو

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

(صفحہ ۳۹ ، اورینٹل کالج میگزین ، بابت ماہ مئی ۱۹۲۹ء)''

(۲) اس نمبر کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

''یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مراد شاہ سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم میں سب سے پہلے 'اردو' کا استعمال زبان کے معنوں میں کیا ہے - غلام ہمدانی مصحفی ۱۱۶۴ھ سے لے کر ۱۲۴۰ھ تک یعنی مراد شاہ کے وقت میں بقید حیات تھے ؛ مندرجۂ بالا شعر ۱۲۰۳ھ

میں لکھا ہے اور مصحفی کا ایک شعر ہے :

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اس شعر میں بھی لفظ 'اردو' زباں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شعر ۱۱۶۴ھ و ۱۲۴۰ھ کے بین بین مراد شاہ کے پہلے ہی لکھا گیا ہو۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ مصحفی نے یہ شعر لکھا ہے، لیکن معین طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ شعر مصحفی نے عمر کے کس حصے میں نظم کیا ہے۔''
(صفحہ ۴۴، اورینٹل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۴۱ء)

ڈاکٹر صاحب اپنے بیان میں ڈھلمل اور مذبذب ہیں، یعنی نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ مصحفی کا شعر مراد ساہ کے شعر سے پہلے لکھا گیا تھا، نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ مصحفی نے کس حصۂ عمر میں لکھا تھا۔ اس بے یقینی کی حالت میں بھی وہ میرے بیان کی تردید کر رہے ہیں۔ تردید بغرض تردید اسی کو کہتے ہیں۔ ''ہو سکتا ہے'' تو کوئی وجہ نہیں لیکن مجھ سے سنیے : جب شیخ مصحفی کا یہ شعر میری نظر سے گزرا، میں 'اردو' کے استعمال میں مصحفی کی اولیت کا معاً قائل ہو گیا۔ اس کی ایک دلیل میرے پاس یہ تھی کہ شعر کی اندرونی شہادت سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تحریر کے وقت میر تقی میر متوفی ۱۲۲۵ھ اور مرزا سودا متوفی ۱۱۹۵ھ زندہ تھے جیسا کہ دعائیہ کلمے ''خدا رکھے'' سے ظاہر ہے۔ اب ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مصحفی کا یہ شعر ۱۱۹۵ھ سے قبل لکھا گیا ہو گا۔ چوں کہ نامۂ مراد ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا ہے اس لیے مصحفی کے شعر کا تقدم مراد شاہ کے شعر پر ثابت ہے۔ اسی بنا پر میں نے اپنے مضمون ''اردو زبان اور اس کے مختلف نام'' میں مصحفی کا ذکر پہلے کیا اور مراد شاہ کا بعد میں کیا۔ اس کا اقتباس حسب ذیل ہے :

''بعد کے اردو نگار لفظ معلیٰ ترک کر کے صرف زبان اردو لکھتے ہیں۔ ان میں سب سے مقدم شیخ غلام ہمدانی مصحفی شاعر

مشہور ہیں ۔ ذیل میں ان کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں :

(۱) البتہ مصحفی کو ہے ریختہ میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زباں داں اردو کی وہ زباں کا

(۲) خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے[1]

(صفحہ ۳۹ ''اورینٹل کالج میگزین'' بابت مئی ۱۹۲۹ء)

ڈاکٹر صاحب جہاں مصحفی کا ایک شعر دے رہے ہیں ، میں ان سے بارہ سال پیشتر دو شعر دے چکا ہوں ؛ آخر انہوں نے میری معلومات پر کون سا اضافہ کیا ۔

(۳) ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے : (الف) تحسین نے سب سے پہلے نثر میں 'اردو' کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ (ب) تحسین نے اپنے بیان میں ایک بار 'اردو' کی بجائے زبان اردو معلیٰ کے نام سے زبان کو یاد کیا ہے ، دوسرے ادیبان میں اس سے قبل مصحفی نے 'اردو' کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ مصحفی تذکرۂ ہندی میں نثار کے متعلق ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :

''چون اصلش معمار است لہذا بنائے ریختہ ہم بخوبی نہادہ ادائے زبان اردو چناں چہ باید از زبان بدرب بیاس میشود ۔''

مصحفی کا یہ تذکرہ جس میں اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ، تحسین کی تالیف 'نو طرز مرصع' سے کم از کم چار سال پہلے لکھا گیا ہے ، جیسا کہ شیرانی صاحب نے بیان کیا ہے ۔ 'نو طرز مرصع' کا سن تالیف ۱۲۱۳ھ ہے لیکن مصحفی کا تذکرۂ ہندی ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوتا ہے .... اس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ تحسین سے چار سال قبل مصحفی نثر میں

---

۱ ۔ محشر شاگرد میر درد کا یہ شعر بھی یاد رہے :

گفتگو اردو زباں کی کوئی ہم سے سیکھ جائے
کیا ہوا دہلی میں محشر اپنی پیدائش نہیں

اردو کے لفظ کو زبان کے معنوں میں استعمال کر رہا ہے ۔"
(صفحہ ۴۴ - ۴۶ ، اورینٹل کالج میگزین ، بابت فروری ۱۹۴۱ء)

(الف) ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جلد بازی سے کام لیا ہے؛ وہ میرا مطلب نہیں سمجھے ؛ میری مراد اردو نثر نگاروں سے تھی ۔ اس جماعت میں تحسین ہی ایسا شخص ہے جو سب سے پہلے اس لفظ کا استعمال کر رہا ہے ۔ اس کے پیش روؤں میں دو تین شخص مجھے معلوم ہیں لیکن وہ اردو یا اردوے معلیٰ زبان کے واسطے نہیں لاتے بلکہ 'ہندی' وغیرہ کے لیے ۔

(ب) ڈاکٹر کا یہ اعتراض کہ تحسین 'زبان اردوے معلیٰ' لکھتا ہے اور مصحفی محض 'اردو' ، ایک غیر ضروری باریک بینی اور موشگافی ہے؛ مقصد دونوں کا ایک ہے ۔ جن ایام میں تحسین نے قلم اٹھایا ہے ان ایام میں یہ زبان 'اردوے معلیٰ' یا 'زبان اردوے معلیٰ شاھجہان آباد' کے نام سے یاد کی جاتی تھی ۔ بلکہ یہ امر الٹا تحسین کے تقدم کو مصحفی پر ثابت کرتا ہے ، کیوں کہ زبان کا قدیم نام 'اردوے معلیٰ' تھا ، بعد میں معلیٰ (صفتی) حذف کر کے 'زبان اردو' یا بہ حذف زبان 'اردو' کہنے لگے۔

ڈاکٹر کا یہ قول کہ مصحفی کا تذکرۂ ہندی تالیف ۱۲۰۹ھ تحسین کی 'نو طرز مرصع' سے چار سال قبل تالیف ہوتا ہے ، صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ مولانا آزاد کی تالیف 'آب حیات' کے اثر میں بے شک میں نے نو طرز مرصع کی تالیف ۱۲۱۳ھ بیان کی ۔ بدنصیبی سے تحسین کی تالیف اس وقت تک میری نظر سے نہیں گزری تھی ؛ کچھ عرصے کے بعد جب اس تالیف کے ابتدائی اوراق جو زیادہ تر ایک نامکمل سے دیباچے پر شامل تھے ، میرے ہاتھ آئے ، ان کو پڑھ کر میں نے اپنی رائے بدل دی ۔ عبارت آئندہ اس کتاب کے زمانۂ تالیف پر روشنی ڈالتی ہے جو میں اپنے مضمون مذکورۂ بالا سے نقل کرتا ہوں :

"میر صاحب (میر تقی میر) کے بعد محمد حسین عطا خاں تحسین المخاطب بہ مرصع رقم ہیں ۔ وہ فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں داخل ہوتے ہیں ۔ ایک روز انھوں نے امیر خسرو

کی 'چار درویش' فارسی کے مجوزہ ترجمے کا ایک حصہ نواب وزیر کو سنایا ، اس نے بہت پسند کیا اور کتاب کی تکمیل کی فرمایش کی ۔ مؤلف نے ہمہ تن مصروف ہو کر اس کام کو سرانجام دیا اور کتاب جس کا نام 'نو طرز مرصع' تھا ، نواب کی خدمت میں پیش ہونے والی تھی کہ ۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا ۔ تحسین کچھ عرصہ خاموش رہا ، بعد میں دیباچۂ کتاب میں ایک قصیدہ نواب آصف الدولہ کی مدح میں داخل کر کے کتاب مذکور نواب کی خدمت میں پیش کی ۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کی نوابی کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہوگا ۔'' (صفحہ ۳۷ ، اورینٹل کالج میگزین ، بابت ماہ مئی ۱۹۲۹ء) ۔

اس طرح 'نو طرز مرصع' کی تاریخ تالیف ۱۱۸۸ھ کے عمر بعد مانی جا سکتی ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ 'نو طرز مرصع' کو ہر حال میں 'تذکرۂ ہندی' تالیف ۱۲۰۹ھ پر تقدم حاصل ہے ۔

میرے پاس 'نو طرز مرصع' کا جو نسخہ ہے وہ جیمز مارٹن کے واسطے ۱۲۱۳ھ میں نقل ہوا تھا ، اس کا خاتمہ یہ ہے :

''تمام شد قصہ نسخہ متبرکہ نو طرز مرصع من تصنیف حسین عطا خان المتخلص و مخاطب بہ مرصع رقم خان کہ در علم خوش نویسی وحیدعصر و مستثنیٰ بودند غفراللہ ذنوبہ ۔''

یہ نسخہ شجاعت علی کے نسخے سے نقل ہوا ہے جس پر ۱۲۰۹ ہجری فصلی درج ہے ۔

میں نے جب شاہ مراد کو نظم میں اور تحسین کو نثر میں سب سے اول 'اردو' کا لفظ استعمال کرنے والا کہا تھا ، اس وقت میرے پیش نظر اردو نگار تھے نہ فارسی نگار ؛ فارسی نگاروں میں 'اردو' لکھنے والے یقیناً اردو نگاروں سے اقدم ہیں ۔ ان میں خان آرزو سب سے قدیم ہیں جو 'غرائب اللغات' تالیف عبدالواسع ہانسوی کی اصلاح شدہ اشاعت میں ایک سے زیادہ موقعوں پر 'اردو' اور 'اصطلاح اہل اردو' لاتے ہیں ۔ بعض امثال ملاحظہ ہوں :

غرائب اللغات میں عبدالواسع ھانسوی لفظ 'رجواڑہ' بہ معنی قحبہ خانہ لائے ھیں ؛ خان آرزو اس لفظ پر معترض ھیں ؛ فرماتے ھیں :

''رجواڑہ بدین معنی اصطلاح شاہ جہان آباد است بلکہ اھل آردو است کہ این قسم اماکن اکثر در لشکر راجہا می‌باشند و الا دراصل رجواڑہ جاے بودن راجہاست ۔''

رجواڑہ کی مثال میں شاہ مبارک آبرو کا یہ شعر یاد رہے :

فاسق کے دل پہ ڈالی جب نفس بد نے برکی
رجواڑے کی گلی کا تب جا غبار دیکھا

'گزک' کی تشریح میں خان آرزو لکھتے ھیں : ''لیکن گزک بہ اصطلاح اھل اردو نوعی است از شرینی کہ ازکنجد و شکر سازند ۔''

ان مثالوں میں اصطلاح اھل آردو سے مراد یہی زبان ھے ۔
'نکتورہ' کے متعلق خان کا بیان ھے : ''نکتورہ در عرف اردو وغیرہ بہ معنی حرف نار و غرور است ۔''

'ھڑبھنا' کے متعلق گویا ھیں : ''لیکن ھڑبھنا بہ زبان آردو اھل شہرھا نیست ، شاید زبان قربات و مواضع باشد و بدین معنی نکلنا شہرت دارد ۔'' آخری مثال میں تو خان آررو صاف 'زبان اردو' لکھ گئے ھیں ۔

یہ مثالیں میں نے اپنے ایک مضمون 'آردو کی شاخ ھریانی زبان میں نالیفات' سے جو نومبر ۱۹۳۱ء میں شایع ھوا ، نقل کی ھیں ۔ اب جو باتیں میں لاھور میں بیٹھ کر ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۱ء میں لکھ چکا ھوں ، ڈاکٹر صاحب یورپ جا کر ان معلومات پر اضافہ تو درکنار ان کا پورا خاکہ تک اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش نہیں کر سکے ھیں ۔

غلطیاں ھر شخص سے ھوتی آئی ھیں اور میں کوئی استثنا قایم نہیں کرتا مگر میں محسوس کرتا ھوں کہ میری غلطیاں بتانے میں ڈاکٹر صاحب نے افراط و تفریط سے کام لیا ھے ۔ زیادہ رنج دہ یہ امر ھے کہ اس تمام واقعے کے متعلق وہ ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں مجھ کو لندن سے لکھ چکے ھیں اور میں جواب دے چکا ھوں ۔ میں نے خود ان کو

نامۂ مراد بھجوایا اور نامی صاحب سے جواب دلوایا ۔ ہم دونوں نے اپنی غلطی کا احساس کیا اور شرمندہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ۲۳ دسمبر کے خط میں نامۂ مراد کی رسید میں لکھتے ہیں :

''نامۂ گرامی اور نامۂ مراد ملا ؛ یاد آوری اور کرم فرمائی کا شکریہ ۔ آپ کو نامۂ مراد کی تحصیل کے لیے۔ بہت زحمت اٹھانی پڑی ۔''

دوسرے خط میں جو ۲۵ فروری ۱۹۳۹ء کا نوشتہ ہے، لکھتے ہیں :

''نامۂ مراد دیکھنے سے میں کہیں سے یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ تاریخ آپ نے کیسے معین کی ہے ۔ نامی صاحب نے کچھ مبہم سا بیان تحریر کیا ہے جس سے معنے در بطن شاعر رہ گئے ہیں اور صاف طور پر کہیں سے پتا نہیں چلتا کہ نامۂ مراد ۱۱۹۶ھ میں لکھا گیا تھا ۔''

ان خطوں کے آنے پر مجھے نامی صاحب کی تلاش کرنی پڑی ؛ جب وہ اپنے گاؤں سے تشریف لائے ان سے گفتگو ہوئی ۔ ان کو دکھایا گیا کہ اعتراض صحیح ہے، دوسرے ذرائع دیکھیے ۔ نامی صاحب جدا پریشان ہوئے۔ ان سے ڈاکٹر صاحب کے نام خط لکھوایا گیا اور دیگرضروری اطلاع بھجوائی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر یہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے تھا، خصوصاً اس صورت میں جب کہ نامی صاحب ان کو لکھ چکے تھے کہ ''شیرانی صاحب کو میری مبہم تحریر سے دھوکا ہوا ۔ دیباچے کی تحریر کو آپ اب وقیع نہ سمجھیں ؛ جو کچھ وہاں لکھا گیا ہے اسے نظر انداز کر دیں ۔'' لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے کو ختم نہیں ہونے دیا اور بقول : ع

دگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشاں را

اب از سرنو اس داستان کو 'اورینٹل کالج میگزین' میں دھرا رہے ہیں ۔ یہ صلہ ہے میری اس حماقت کا جس کو ڈاکٹر صاحب میری 'کرم فرمائی' کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ وہی مثل ہوئی ''نیکی برباد گناہ لازم ۔''

اس مرتبہ پھر مجھ کو ندامت سے سر جھکانا پڑتا مگر خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب کے مصحفی والے شعر نے میری مشکل کشائی کی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے خود کسی موقع پر یہ شعر نقل کیا تھا اور ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے میری اس مضمون کی طرف رہ نمائی کی جس میں یہ شعر آیا تھا ، یعنی 'اردو زبان اور اس کے مختلف نام۔'

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تالیفات سے اردو زبان کے وجود کا ثبوت

(از 'اورینٹل کالج میگزین' بابت نومبر ۱۹۲۹ء)

ہمارے اکثر اہل قلم کا عقیدہ ہے کہ اردو زبان کو عالم وجود میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ۔ ان کے نزدیک شاہ جہاں آباد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اس زبان کی بنیاد رکھی جاتی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ عہد اکبری کی یادگار ہے جب کہ شاہی دربار میں مختلف اقوام و ممالک کے لوگوں کا سنگھم ہوتا ہے ۔ مسٹر بلاک میں جو گزشتہ صدی کے ایک مشہور مستشرق ہیں ، سب سے منفرد رائے رکھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک عہد اکبری میں ٹوڈرمل کی مالی اصلاحات اس زبان کے وجود میں لانے کی ذمہ دار ہیں جن کی رو سے فارسی نے محکمۂ مال پر قبضہ جما لیا تھا ۔ چوں کہ یہ رائے عام طور پر معلوم نہیں ہے اس لیے میں اسے بہ غرض اطلاع ناظرین یہاں درج کیے دیتا ہوں ؛ ان کا بیان ہے :

''ٹوڈرمل کے حکم اور اکبر کی فیاض پالیسی جس کی بنا پر ہندو اعلیٰ ملازمتوں کے واسطے مسلمانوں سے مقابلہ کر سکتے تھے ، اس امر کی تشریح کرتی ہے کہ اٹھارہیں صدی کے خاتمے سے پیشتر ہندو قوم فارسی زبان میں مسلمانوں کی تقریباً استاد بن گئی تھی ۔ دوسرے یہ کہ بالائی ہند میں ایک نئی بولی یعنی اردو رواج میں آئی جو ہندوؤں کا ذریعۂ تعلیم بنے بغیر کسی حالت میں وجود پزیر

نہیں ہو سکتی تھی ۔''
(انگریزی ترجمہ آئین اکبری ، صفحہ ۳۵۲ ، جلد اول)

اردو زبان کی قدامت کا نظریہ جو آئندہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے ، اب تک جیسا کہ چاہیے اس پر کسی نے توجہ نہیں دی ہے ۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ہے ، اور جوں جوں ان کی سلطنت اس ملک میں وسعت اختیار کرتی گئی یہ زبان بھی مختلف صوبوں میں پھیلتی گئی ۔ دسویں صدی سے اس میں تصنیفات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جو سب سے پہلے گجرات میں اور بعدہ دکن میں شروع ہوتا ہے ۔ اس صدی سے پیشتر اس زبان کے وجود کا پتا صرف فارسی تصنیفات سے لگ سکتا ہے جو نویں ، آٹھویں اور ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ۔

ہندوستان میں فارسی تصنیفات غزنوی دور سے ملتی ہیں ۔ ان میں سب سے مقدم لاہور کے دو شاعر ابو الفرج رونی اور خواجہ مسعود سعد سلمان کے دیوان ہیں ۔ دہلی میں تاج الدین ریزہ ، منہاج سراج اور امیر خسرو ساتویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ آنے والی صدی میں امیر کے بعد ضیاء برنی اور محمد بن مبارک کرمانی ہیں ۔ ان کے بعد شمس سراج عفیف اور مولانا تاج الدین مفتی الملکی ہیں جو نویں صدی میں گزرے ہیں ۔ ان کے علاوہ ایک جماعت فرہنگ نگاروں کی ہے جو دہلی ، مالوہ ، بنگالہ اور گجرات میں ہوئے ہیں ۔

ان مصنفین کے ہاں ہندی الفاظ و محاورات کا ایک معتدبہ ذخیرہ ملتا ہے جو انھوں نے ضرورتاً دانستہ و نا دانستہ اپنی تالیفات میں داخل کیا ہے جس سے ہمیں صاف پتا چلتا ہے کہ وہی زبان جس کو آج کل ہم اردو کہنے کے عادی ہیں ، ان ایام میں موجود تھی اور مسلمان اپنے گھروں میں اسے بولنے کے عادی تھے ۔ الفاظ کے متعلق ممکن ہے یہ توجیہ پیش کی جائے کہ بنا بر ضرورت ان کو فارسی میں داخل کر لیا گیا ہے ، اس لیے صرف الفاظ کی شہادت پر مسلمانوں میں ایک ہندوستانی زبان

کے استعمال کا عقیدہ نہیں مانا جا سکتا - لیکن محاورات کے متعلق یہ توجیہ تسلیم نہیں کی جا سکتی - فارسی تصنیف میں ہندی محاوروں کے ترجمے کا استعمال اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا مصنف ہندوستانی ہے اور یہ کہ وہ ہندوستانی زبان میں غور و فکر کرنے کا عادی ہے - اسی طرح اس زمانے کے بعض مشاہیر کے ہندی نام اور عرف دیکھ کر بھی یہی حکم لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس ملک کی زبان سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے - اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اصل مضمون کی طرف رجوع کروں -

ہندی الفاظ کا استعمال سب سے پہلے عرب مؤرخین و سیاحین ہند کے ہاں ملتا ہے - مثلاً مسعودی ہندوستان کے مشہور میوے آم کو 'انبج' کے نام سے یاد کرتا ہے اور اصطخری نیبو کے ذکر میں لکھتا ہے کہ سندھی زبان میں اسے لیموں کہتے ہیں -

غزنوی دور میں ابو ریحان البیرونی اپنی مشہور تالیف 'کتاب الہند' میں جو ہندوؤں کے علوم و فنون پر لکھی گئی ہے ، سنسکرت کے علاوہ سیکڑوں ہندی الفاظ کا استعمال کرتا ہے - ان میں ایک موقع ایسا آگیا ہے جہاں ہندوؤں کے نصف ماہی ناموں کے ذکر میں اس نے ایک سے لے کر پندرہ تک گنتی گنائی ہے - مثلاً :

اوماس	برقه (کذا) پڑوه	بیه	تریه	جوب	پنجے	سب (کذا) چهٹه
ا	ب	ح	د	ه	و	ز

ستیں	ایں	نوں	دھیں	یاھے	دواھے	ترھے	چودھے	پنجاھے
ح	ط	ی	یا	یب	یج	ید	یه	یو

(کتاب الہند ، صفحہ ۲۹۵)

مذکورۂ بالا اعداد 'کتاب الہند' کے مرتب کا خیال ہے ایسی زبان سے علاقہ رکھتے ہیں جو بہت کچھ موجودہ سندھی کے قریب ہے -

فارسی کے میدان میں غزنوی دور سے ہندی الفاظ استعمال میں

آ رہے ھیں ۔ فردوسی ، عنصری ، فرخی ، منوچہری ، اسدی ، بیہقی
اور سنائی کے ھاں ذیل کے الفاظ ملتے ھیں :

پت ، دشمن ، شارہ ، کت ، چندن ، کوتوال ، نوبہار ، پیلک ،
لکہن ، شل ، کتار اور پانی ۔

ابوالفرج رونی

سلطان ابراھیم اور اس کے فرزند مسعود ثالث کے عہد کا شاعر ہے
اور لاھور کا باشندہ ہے : اس کے دیوان میں یہ ھندی الفاظ ملتے ھیں :

دند ، جوھر ، جت

میں مثالیں بھی درج کیے دیتا ھوں :

بشکل پیل یک دندش نگہ کن
نعم چوں پیل یک دندش ھزار است
(صفحہ ۲۰ ، طبع گلزار حسینی ، بمبئی)

آذرے کاندرو جواھر اوست
جوھر دیو پال ہو داؤں
(صفحہ ۹۰ ، طبع گلزار حسینی ، بمبئی)

گرد افغان وجت برغبت و حرص
پرہ زد موکب سوار ملک
(صفحہ ۶۲ ، طبع گلزار حسبنی ، بمبئی)

'دند' کے لیے صاحب فرھنگ رشیدی نے کہا ہے کہ یہ ھندی
لفظ ہے ۔ فرھنگ آنند راج میں لکھا ہے :

"گویا این مفرس دنب باشد کہ لغت ھندی است"

لیکن راقم کا خیال ہے کہ ابوالفرج لاھوری ہے ، اس لیے 'دند'
اس نے پنجابی زبان سے لیا ہے جو دانت اور ھاتھی دانت کے لیے آج بھی
بولا جاتا ہے ۔ 'پیل یک دند' سے شاعر کا مقصد اک دنتا ھاتھی ہے ۔

'جٹ' بھی اصل میں پنجابی لفظ 'جٹ' ہے جو ایک قوم کا نام ہے ،
ور جسے اردو میں جاٹ کہتے ہیں ۔ عرب مؤرخین 'زط' لکھتے ہیں ۔

جوہر سے مقصد راجپوتوں کی وہ رسم ہے جس میں دشمنوں سے
عہدہ برآ نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے مال و اسباب کو جلا کر
ور اہل و عیال کو قتل کر کے مقابلے میں آ ڈٹتے تھے اور جب تک
یک ایک کر کے ہلاک نہ ہو جاتے جنگ سے منہ نہ موڑتے۔

خواجہ مسعود سعد سلمان

سلطان ابراہیم مسعود ثالث اور ارسلان بن مسعود کے عہد کے
ںاعر ہیں ، لاہور وطن ہے ۔ خواجہ کے ہاں یہ ہندی الفاظ ہیں :

کٹ ۔ ماراماز ۔ برشکال ۔

مثال : ع

خوفغفور بر عجم و فور بر کٹ

خورعد ر ابر بعرید کوس محمودی
برآمد از پس دیوار حصن ماراماز

بر شکال اے بہار ہندوستان
اے نجات از بلائے تابستان

'کٹ' کی شرح میں فرہنگ نامۂ قواس میں لکھا ہے :

''تخت ہندواں باشد میان بافتہ ۔''

'بحرالفضائل' اور 'شرف‌نامۂ احمدمنیری' و 'مؤید الفضلا' میں 'کھٹ'
ہ ہائے مخلوط لکھا ہے اور وہی معنی دیے ہیں ۔ ہمارے ہاں 'کھٹ'
ی موجودہ شکل 'کھاٹ' ہے ، لیکن ضیاء برنی اور صاحب 'سیرالاولیاء'
کے ہاں پنجابی شکل میں 'کھٹ' ہی ملتا ہے ۔ بعض فرہنگ نویسوں کا
خیال ہے کہ 'کٹ' اصل میں چینی لفظ ہے جس کو تیموری
وجیں ایران میں روشناس کرتی ہیں ، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ

ہندوستانی الاصل ہے ؛ غزنوی عہد کے شعراء اس سے واقف ہیں اور ہندوستان کے سلسلے ہی میں ذکر کرتے ہیں :

فرخی

خلافت جدا کرد جیپالیان را
ز کتہاے زرین و شاہانہ زیور

اسدی

بدو گفت مہراب شہ را بگوی
دگر بارہ باز آمدم رزم جوی
کہ پر خون نمایم کب و افسرب
درم زین سراندیب بے تن سرب

'مارامار' پنجابی اور اردو میں عام ہے جس سے مقصد آپس کی مار پیٹ اور حملہ وغیرہ ہے ۔

'برشکال' ۔ برش + کال ، یعنی بارش کا موسم ۔

عثمان مختاری غزنوی

سلطان مسعود ثالث وارسلان کے عہد کے شاعر ہیں اور ہندوستان میں آئے ہیں ؛ ان کے ایک شعر میں دو ہندی لفظ 'چون' اور 'مار' ملتے ہیں :

زمن بدیدے باوے بجستہ گفتے چون
مگس بدیدے برمن نشستہ گفتے مار

حکیم سنائی متوفی ۵۴۷ھ

یمین الدولہ بہرام شاہ کے عہد کے شاعر ہیں ؛ ان کے ہاں دو لفظ 'کوتوال' اور 'پانی' ملتے ہیں ۔

امثال:

جای و جان ہر دو پیشکار تواند — کوتوال و نفس شمار تواند
نہ دران معدہ خدرۂ میدہ — نہ دران دیدہ قطرۂ پانی

'کوتوال' = کوٹ + والا یعنی مالک حصار - والا کا استعمال الفاظ کے آخر میں پنجابی اور اردو میں بہت عام ہے[1] -

'پانی' در اصل پانڑی ہے - پنجاب میں آج بھی پا نڑی[2] بارا ہے مخلوط ھندی بولا جاتا ہے ، اردو میں اس کی ثقالت دور کر دی گئی -

تاج الدین ریزہ

ان کو صاحب سیرالاولیاء و ھفت اقلیم تاج ریزہ اور مولانا جمالی سیرالاولیاء میں تاج سگریزہ لکھتے ھیں - یہ سلطان شمس‌الدین التتمش اور اس کے جانشینوں کے مداح ھیں -

محمد بن قوام شرح 'مخزن اسرار' مصنفہ ۹۵۷ھ میں لکھتے ھیں کہ تاج ریزہ کو ھاتھی کے پاؤں تلے مروا دیا گیا تھا - ان کے ایک شعر میں دو ھندی لفظ 'سیر' اور 'من' استعمال ھوئے ھیں :

حیز از مئے قدیم مرا سیر کن برطل
بگذار ازیں حدیث کہ یک سیر و یک من است

'من' اگرچہ فارسی میں مستعمل ہے لیکن فارسی خواں زیادہ تر سیر کے مفہوم میں لاتے ھیں ، مثلاً خواجہ حافظ :

دو یار ھمدم و از بادۂ کہن دو منے
فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

تاج ریزہ کے ھاں اس کا مفہوم ھندوستانی من یعنی ۴۰ سیر ہے -

---

۱ - کثرت استعمال سے 'والا' کا آخری 'الف' گر جاتا ہے - 'وال' کے لاحقے سے پنجاب میں بہت سے قصبات و دیہات کے نام بنائے گئے ھیں ، مثلاً موھلن وال ، ڈھولن وال ، دھاریوال ، سہجو وال ، بیگو وال ، بھڑ وال وغیرہ وغیرہ - (مرتب)

۲ - یہ تلفظ پنجابی کے علاوہ ھندی ، سندھی ، ملتانی و راجستھانی وغیرہ زبانوں میں بھی رائج ہے - (مرتب)

طبقات ناصری از منہاج سراج نوشتہ ۶۵۸ھ

قاضی منہاج الدین اپنی تاریخ ناصرالدین محمود متوفی ۶۶۴ھ کے نام پر معنون کرتے ہیں - ذیل کے ہندی الفاظ اس تصنیف میں موجود ہیں :

سیل - لک - بہار - سمندر - پایک - بہلہ -

امثال :

(۱) و او بر سلطان سیلے زد (صفحہ ۱۱۸)

(۲) بخشش او لک لک و کشش او لک لک (صفحہ......)

(۳) و بہار بہ لغت ہندوی اسم مدرسہ باشد (صفحہ ۱۴۸)

(۴) و او را بہ لغت ہندوی سمندر گوید (صفحہ ۱۵۸)

(۵) و مبانع مرد پایک و سوار از بہڑایچ بر سمت دہلی رواں شد (صفحہ ۲۰۹)

(۶) بعد از مدتے کہ آن خدمت بجا آورد بہلہ دار شد (صفحہ ۲۵۴)

'بہار' سنسکرت لفظ 'وہار' کی ہندی شکل ہے جو معبد و عبادت‌گاہ کے معنی دیتا ہے - بدھ مت کی بنا پر یہ لفظ ہندوستان سے باہر بھی پہنچ گیا ہے - یہ بیان کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایران میں یہ لفظ زردشتی عہد میں بھی معلوم تھا - بلخ میں بدھ مت کا ایک مشہور مندر تھا جس کا نام 'نو وہار' یعنی نیا مندر تھا - دین زردشتی کے ظہور پر یہ مندر آتش‌کدہ بنا لیا گیا اور 'نوبہار' نام رکھا گیا - زردشتیوں کی روایات میں یہ نہایت مقدس مانا جاتا تھا - شاہ لہراسپ خلع سلطنت کے بعد اسی آتش‌کدے میں انزواگزین ہوتا ہے - چناں چہ دقیقی لہراسپ نامے میں لکھتا ہے :

بہ بلخ گزین شد بدان نوبہار — کہ یزدان پرستان آن روزگار
مر آن خانہ را داشتندے چنان — کہ مر مکہ را تازیان این زمان

اس مندر کا متولی برمک یا برمک کے نام سے مخاطب تھا - آل برامکہ جو خلیفہ ہارون‌الرشید کی وزارت کے لیے مشہور ہیں اس معبد کے

قدیم متولی تھے ۔ برمک[1] بھی دراصل ہندی ہے ، جس کے معنی پیشوائے معبد ہیں ۔

'پایک'[2] سنسکرت پا دانک به معنی پیاده ۔ فارسی تاریخوں میں یہ لفظ اکثر اوقات ہندو پیادے کے لیے استعمال ہوا ہے ۔

'بہلہ' اہل لغت کہتے ہیں ''در ہندوستان خریطه طورے راگویند که همراه اهل دول باشد و زر خیرات و کاغذ هاے ضروری در آن بود[3]''۔ اس سے لفظ بہلہ دار بنا جس سے مراد ایسا ملازم ہے جو اس خریطے یا بٹوے کو لے کر آقا کے ساتھ ساتھ رہے ۔

امیر خسرو

امیر تصنیفات متعددہ کے مالک ہیں اور ان میں ہندی الفاظ بھی مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں ۔ میں سب سے پہلے 'قران السعدین' تصنیف ۶۸۸ھ سے شروع کرتا ہوں جس میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں :

چوبرہ ، ساغر ، عوض ، راوت ، پایک ، بگ ، کورہ ، بالا ، کیورہ ، سیوتی ، بل ، مولسری ، سال ، سول ، بیرہ ، گل صد برگ ، چونہ ، بنگ ، بلادر ۔

امثال :

(۱) چوبرہ و قصر بلندش در آب
گشت اران ساغر صافی حباب

(صفحہ ۳۲ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

---

۱ ۔ اس لفظ کی اصل سنسکرت لفظ 'پرمکھ' ہے جس کے معنی سردار ، بزرگ اور معزز شخص کے ہیں ۔ (مرتب)

۲ ۔ یہی لفظ فارسی میں 'پیک' به معنی قاصد کی صورت میں موجود ہے ۔ (مرتب)

۳ ۔ فرہنگ آنندراج (صفحہ ۵۱۵) طبع نولکشور ۱۸۸۹ء ۔ (مرتب)

(۲) لشکر مشرق زعوض تا به بنگ
چیره دل و خیره کش و تیز جنگ
(صفحه ۲۵ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۳) راوت ژوپین زن و خارا شگاف
پشت به پشت از پے روی مصاف
(صفحه ۳۶ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۴) پایک بازی گر و موزون خرام
داده بازی سر خود بہر نام
(صفحه ۳۶ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۵) اے دھلی وابے بتان ساده
پگ بسته و ریشه کج نهاده
(صفحه ۳۶ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۶) آب که باران بگل کوزه ریخت
کوزه بیفتاد و شکست و بریخت
صفحه ۶۰ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۷) هر گل بالا که دهد بوستان
بیشترے هست به هندوستان
(صفحه ۷۰ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۸) کیوره بر برگ چو سیم سپید
عود ازو سوخته چون مشک بید
(صفحه ۷۰ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۹) سیوتی خوش که کنندش گلاب
از همه سو رو بهمه روے آب
(صفحه ۷۰ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۰) یک گل بیل و ده دیگر درون
گل ز گل و گل ز گل آمد برون
(صفحه ۷۰ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۱) مولسری خورد و بزرگ از هنر
خورد و بزرگ از هنرش بهره ور[1]
(قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۲) ماہ نوے کاصل وے از سال خاست
یک مہ نو گشتہ بدہ سال راست
(صفحہ ۱۳۵ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۳) سبزۂ تنبول کہ صد برگ ست
چون گل صد برگ بیا مد بدست
(صفحہ ۱۸۵ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن

(۱۴) تا ز مئے مجلس شہ مردہ یافت
سنگ رہا کرد و بہ مجلس شتافت
(صفحہ ۱۱۲ ، قران السعدین ، علی گڑھ ایڈیشن

'ساغر' یعنی ساگر ، بہ معنی حوض و تالاب ۔
'عوض' یعنی اودھ ، ایک صوبے کا نام ہے ۔
'راوت' راجپوت ۔
'پایک' پیادہ ۔
'کوزہ' اور 'صد برگ' دو ہندوستانی پھولوں کے نام ہیں ۔ یہ فار
نام مسلمانوں نے ہندوستان میں رکھے ہیں ۔

امیر فرماتے ہیں :

اگرچہ پارسی نامند ایں ہا
ولے در ہند زادند از زمیں ہا
گر ایں گل در دیار پارسی زاد
چرا رویست در گفتار شان یاد
(صفحہ ۱۳۰ ، قران السعا

صد برگ کو آج کل ہزارہ کہتے ہیں ۔

---

(۱) صفحہ ۵۵ ، طبع نولکشور ، ۱۸۷۵ء (مرتب) ۔

خزائن الفتوح ۷۱۰ھ

یہ تصنیف علاؤالدین محمد شاہ خلجی (۶۹۵ھ ، ۷۱۵ھ) کے عہد کی بعض جنگوں کے حالات میں ہے ۔ امیر نے اسے اپنی طرز میں لکھا ہے ۔ یہ کتاب سلطانہ ہسٹوریکل سوسائٹی علی گڑھ نے گزشتہ سال شائع کی ہے ۔ ذیل کے الفاظ اس میں مستعمل ہیں :

پایک ، بیڑہ تنبول ، راوت ، دھانک ، چونہ ، گھٹی ، بسیٹھ ، مار مار ، رائے ۔

امثال :

(۱) و از درون ہندوان مار مار فریاد میکردند (صفحہ ۸۷)
(۲) چون بسیٹھانے رائے پس ساتبان لعل۔ . . .رسدند (صفحہ ۱۱۱)
(۳) درس همده روز گھٹانے گرشتہ شد و شب و فرازے معاینہ گست (صفحہ ۱۲۸)
(۴) کہ سنگ قلعہ را نیز چونہ سارند (صفحہ ۱۴۲)
(۵) خود را بہمست دھانکان خاص تسلیم کردم (صفحہ ۱۵۰)
(۶) راوناں را بیڑۂ تنبول باید داد (صفحہ ۱۶۰)
(۷) باشارت رائے همه برگستوانی و پایک تنبول شدند (صفحہ ۱۶۰)

بسیٹھ : ایلچی اور سفیر ۔

گھٹی : یعنی گھاٹی یا درہ ۔ امیر نے اس کو پنجابی لہجے میں لکھا ہے ۔

دھانک : سنسکرت لفظ دھانشک ہے بہ معنی تیر انداز و کمان‌دار ۔

اسلامی افواج کے ساتھ ہندو فوجیں بھی ہوا کرتی تھیں ، مسلمان لشکر سے تمیز کے لیے وہ ہندی ناموں سے پکارے جاتے تھے ۔ یعنی راوت ، پایک اور دھانک وغیرہ ۔

دیول رانی خضر خان ۷۱۵ھ

یہ بھی حضرت امیر کی تصنیف ہے ۔ الفاظ ذیل اس میں نظر سے گزرتے ہیں :

کیوره ، حائے ، دل ، کوزه ، پتوله ، کرنه ، لادی ، کرنا ،
رانی ، رانه ، راوت ، تنول ، رائے جنپه ، ماؤلسری ، سوتی ، دونه ،
سکھ آسن ، الاون ، دال ، نگه ، ڈوله -

امثال :

(۱)
سپاه و راوت و رانه ز حد بیش
پیاده خود چه گویم از عدد بیش
(صفحه ۶۵ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۲)
بدست افتاد باپیل و خزانه
جهانے پر شد از رای و رانه
(صفحه ۸۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۳)
سوم لادی گروهه بر سر این بار
که در هندی است لادی بار بردار
(صفحه ۱۰۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۴)
دوم کرنا که از نکس حبر بود
رسد چون نیم نام خویش کر بود
(صفحه ۱۰۰ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۵)
چسان سود آن پتوله گرچه دلبند
که جان پاره بتوان کرد پیوند
(صفحه ۱۲۶ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۶)
وران سو دلربائے عاشقان جائے
همه بس مهر دلها را شده جائے
(صفحه ۱۳۰ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۷)
دگر آن رائے چنپه شاه گلها
که بوئے مشکبار آمد چو ملها
(صفحه ۱۳۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۸)
دگر ماؤلسری کش طرفه نامے
برنگ طرفه مروارید فامے
(صفحه ۱۳۱ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۹) دگر دونه که آن ریحان هند است
ز تری بوش درخورد پسند است
(صفحه ۱۳۲ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۰) دگر کرنه که چون زوجست بوئے
معطر گردد از یک خانه کوئے
(صفحه ۱۳۲ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۱) نشاند اندر سکھ آسن آن پری را
چو گردون در ترازو مشتری را
(صفحه ۱۴۲ ، علی گڑھ ایڈیسں)

(۱۲) الاون را رگ از اندام بیرون -
کدو بر پشت و رگہا کرده پرخون
(صفحه ۱۵۷ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۳) دگر سار برنجیں نام آن تال
بر انگشت پریرویان قتال
(صفحه ۱۵۷ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۴) . . . .
پرنده سنکه چون در حشر نامه
(صفحه ۱۶۰ ، علی گڑھ ایڈیشن)

(۱۵) بدوله در نشست آن در کرم نشر
چو خیر مومنان در پلۂ حشر
(صفحه ۲۵۲ ، علی گڑھ ایڈیشن)

'لادی' آج کل بوجھ کے واسطے آتا ہے ، یعنی وہ وزن جو کسی جانور پر رکھا جائے۔ امیر کہتے ہیں کہ لادی بار بردار کو کہتے ہیں یعنی بار برداری کے جانور کو : ع

کہ در ہندی است لادی بار بردار

'بتوله' یعنی پٹوله ۔ فرہنگوں میں اس کے لیے لکھا ہے

''بافتۂ ریشمی کار هندوستان ۔''

'ماؤلسری' مولسری ، امیر نے دونوں طرح لکھا ھے ۔

'سکھ آسن' پالکی

'الاون' طنبور کی قسم کا کوئی ساز ھے ۔ بحرالفضایل میں اسے 'الاین' لکھا ھے اور شرح میں ''ساز هندوی است'' کہا ھے ۔ اس سے ظاهر ھے کہ الاون اور الاین ایک هی چیز ھے ۔

تاریخ فیروز شاهی از ضیاء برنی ۷۵۸ھ

مولانا ضیاءالدین نے یہ تاریخ فیروز شاہ کے عہد میں لکھی ھے ۔ اس تاریخ کے علاوہ وہ کئی مصنفات کے مالک هیں ، یعنے حسرت نامہ ، ثنائے محمدی ، صلواۃ کبیر ، عنایت نامہ الہٰی اور مآثر سادات [1] ۔ تاریخ آل برمک کا ترجمہ بھی انھوں نے فارسی میں کیا ھے ۔

بہ خوف طوالت میں امثال سے قطع نظر کرتا هوں اور الفاظ کی فہرست کے ساتھ ساتھ صفحات کا حوالہ هی دے دیتا هوں ۔ میرے زیر نظر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعہ تاریخ فیروز شاهی ھے ۔

(۱)	راناں و رانگاں	(صفحہ ۵۰)
(۲)	بلوندیہا	(صفحہ ۵۱)
(۳)	یک لک با یک و دھانک	(صفحہ ۵۲)
(۴)	در رمن جتّواں و منداهراں	(صفحہ ۵۳)
(۵)	چبوترۂ ناصری	(صفحہ ۵۴)
(۶)	دھولہا زناں	(صفحہ ۵۴)
(۷)	بجرها و کسبیها	(صفحہ ۸۴)
(۸)	دو لک آدمی	(صفحہ ۸۶)
(۹)	کہار و کہوانی	(صفحہ ۸۶)
(۱۰)	و کہت و مراس او بو بودے	(صفحہ ۱۱۷)

---

[1] ۔ سیرالاولیاء از محمد بن مبارک کرمانی ، (صفحہ ۳۱۳ ۔)

(۱۱) مسخرگان و بهندان (صفحه ۱۳۰)
(۱۲) از برای تنکه و جیتل (صفحه ۱۳۷)
(۱۳) دهنڈائی بهنڈاں (صفحه ۱٦۳)
(۱۴) ناداشتی و بهنڈائی (صفحه ۱٦۳)
(۱۵) ملک هرن مار (صفحه ۱۷۷)
(۱٦) ملک چهجو (صفحه ۱۸۱)
(۱۷) بیرهٔ تنبول (صفحه ۱۸۲)
(۱۸) و شراب کچهه حوار (صفحه ۱۸۲)
(۱۹) سلطان بر هوده نشسته بود (صفحه ۱۸۳)
(۲۰) . . .
(۲۱) دهگاں در شهر گرفتار شدند (صفحه ۱۸۹)
(۲۲) ٹیکهٔ برهمان (صفحه ۲۰۰)
(۲۳) کوتوال (صفحه ۲۱۰)
(۲۴) دب (صفحه ۲۱۲)
(۲۵) و غله به یک جیتل سیرے رسید (صفحه ۲۱۲)
(۲٦) مندل زنان (صفحه ۲۱٦)
(۲۷) ابریشم و بتوله آورد (صفحه ۲۲۳)
(۲۸) مرمود تاکشتها را جانب کره الاهو کنند (صفحه ۲۳۱)
(۲۹) ملک جونا (صفحه ۲۳۷)
(۳۰) ملک فخرالدین کهنڈ (صفحه ۲۳۹)
(۳۱) ملک رکن الدین انبه صفحه ۲۴۱
(۳۲) و اگر نوغصه خواهی کرد (صفحه ۲۴۵)
(۳۳) چهپر ها بسته بودند (صفحه ۲۷۸)
(۳۴) ملتانیان و ساهاں (صفحه ۲۸۹)
(۳۵) بکی و بنک . . . بکنی ُدراں (صفحه ۲۸۴)
(۳٦) بهٹیها (صفحه ۲۸۵)
(۳۷) بسوه کنند (صفحه ۲۸۷)
(۳۸) خوطان یا بلاهراں (صفحه ۲۸۷)

(۶۶) زمین اکھل (صفحہ ۴۹۹)
(۶۷) منگا طباخ......لدھا باغبان.....شیخ باہو نایک بچہ......پیرا مالی (صفحہ ۵۰۵)
(۶۸) و در آن آیام غصہ سلطان محمد بر خلق بیشتر بود (صفحہ ۵۱۳)
(۶۹) با سواران تپۂ خود (صفحہ ۵۱۴)
(۷۰) ملک قبول تو را باند (صفحہ ۵۲۸)
(۷۱) دھکران لشکر (صفحہ ۵۳۴)
(۷۲) پکھا در گردن انداختہ (صفحہ ۵۴۵)
(۷۳) نتھوسوڈھل ـــــ حسام ادھنگ (صفحہ ۵۴۷)
(۷۴) لکوک و کرور (صفحہ ۵۵۴)
(۷۵) دیہہا و باغہا و بھٹیہا مسلم داشتہ (صفحہ ۵۵۵)
(۷۶) موٹھی و کنجد (صفحہ ۵۶۸)
(۷۷) گل کر نہ و سیوتی . . . جنبھیری . . . کرنہ جھوانک . . . پونڈہ کھرنی و جموں . . . بڈھل . . . سینبل . . . پیپل (صفحہ ۵۶۹)
(۷۸) کنکھر (صفحہ ۵۹۰)
(۷۹) مہاوتاں (صفحہ ۵۹۳)
(۸۰) مشعلہا و ڈیوٹہا بسیار بر افرو ختند (صفحہ ۶۰۹)

'تلونڈی' اس کے معنی پنجابی میں موضع ، بستی اور نوآبادی کے ہیں ـ پنجاب میں آج بھی یہ لفظ مستعمل ہے ، مثلاً تلونڈی گوجران ـ برنی نے اسی طرح لکھا ہے ، یعنی دلونڈی کھوکھراں (صفحہ ۵۳)

'جٹواں' یعنی جاٹ جٹو ـ

بھنڈ ـ بھانڈ کی پنجابی شکل ہے ـ اسی سے بھنڈائی بہ معنی بھنڈیتی بنا لیا ہے ـ

'کھنڈ' کھانڈ کی پنجابی شکل ہے ـ قند اسی کا معرب ہے ـ

'هرن‌مار' بہ تقلید فارسی اسم فاعل بنا لیا گیا ہے ـ ایسی ترکیبیں آج بھی رائج ہیں ، مثلاً ہتھ چھٹ ، کھل اپاڑ ، لے لوٹ ، دل پھینک اور مکھی مار ـ

'ہگنی' ایک قسم کی شراب کا نام ہے ، اس سے 'ہگنی گر' بنا لیا ۔
'کری' یعنی کڑی ۔ ایک قسم کا محصول جو گھر پر لیاجاتا ہے ۔
'منڈہ' یعنی منڈی ۔
'دھاوہ' یعنی ڈاک کا ہرکارہ اور ڈاک ۔
'سوندھار' محاورے میں اب بھی ادھار سدھار بولا جاتا ہے ۔
اس میں سدھار کو تابع مہمل مانا گیا ہے ۔ سوندھار سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ لفظ با معنی ہے اور ادھار کا مرادف ۔
'ماتی' یعنی حتی ۔ حنفی مذہب کا دروس اور عالم ۔
'ڈانگ' لٹھ اور چوب دستی ۔
'منڈل' جلسہ اور جماعت ۔
'بلسب' بالسب کی پنجابی شکل ہے ۔
'سگا' مانگنا کی پنجابی شکل ہے ۔
'لدھا' یعنی لادھیا ۔
'جموں' جاموں کی پنجابی شکل ہے ۔
'موٹھی' اُن ایام میں بعض الفاظ کے آخر میں ایک یائے زائدہ
ملتی ہے ، مثلاً جوار کو جواری ، جھمر کو جھیری ، کھنہ کو کھنی
کہتے تھے ۔ پنجاب میں آج بھی ایسی 'ی' بعض الفاظ میں موجود ہے ،
مثلاً جواری ، مکی ، منگی ، مسری ، وغیرہ ۔

سیر الاولیا

یہ کتاب خواجہ نظام الدین اولیاء اور ان کے خلفا و معاصرین
وغیرھم کے حالات میں ہے ۔ اس کے مصنف سید محمد بن سید مبارک کرمانی
المتوفی ۷۷۰ھ ہیں ۔ الفاظ ذیل اس میں مرقوم ہیں :

چڈو گھر ، چوبرہ ، پہلو ، کھٹ ، جوس ، جواری ، لک ،
جیتل ، عورت ، مہین ، ملح کریلہ ، ڈولہ ، سدی ، شیخ موہن ،
بیگنہ ، بھوگا یعنی عیش ، پٹی کھٹ (ناصاف) ، بی بی رانی ،
کریل (درخت) ، کھنڈ سال ، لگھن ، ندی خانہ بھاگسی ، درخت بڑ ،
جامۂ جھمرتلی ، کھچڑی ، آبری ، پلنگ ، سانڈنی ، مولانا شہاب الدین

'کستوری ، پتھاؤلی (پتھاولی) ، آکلہ ، محمود پٹوہ ، رومال ، جگری ، چھپری ، چھپر دار -

'خوش' کا مفہوم وھی ھے جو اردو میں آتا ھے یعنی شاد و مسرور بغایت خوش شد - (صفحہ ٦٦)

اس کو میں ھندوستانی اثر کے نام سے یاد کرتا ھوں - خوش کے یہ معنی صرف ھندوستان میں آتے ھیں ، فارسی میں زیادہ تر مرغوب و پسندیدہ کا مفہوم لیا جاتا ھے -

'عورت' بہ معنی زن فارسی میں آتا ھے لیکن اردو میں اس سے مراد بیوی بھی لی جاتی ھے - صاحب 'سیرالاولیا' نے 'جہاں عورت او بود' (صفحہ ۸۴) میں بیوی یا زوجہ کے معنوں میں استعمال کیا ھے - یہ بھی ھندی اثر ھے - اردو میں آج بھی یہ معنے لیے جاتے ھیں -

'لنگھن' روزہ ھندواں - مثلاً :

لنگھنے گر ترا کند فربہ
سیر خوردن ترا بہ از لنگھن صفحہ ۴۰۱

'بھاگسی' قید خانہ و بید -

'جکری' اس میں بہ قول شیخ بہاء الدین برناوی زیادہ تر مشائخ کا شجرہ ھوتا تھا ؛ بعد میں اور مضامین بھی لائے جانے لگے - اصل میں 'ذکر' یا 'ذکری' تھا ، ھندوستانی اثرات میں جکری بن گیا -

تاریخ فیروز شاھی از شمس سراج عفیف

یہ کتاب امیر تیمور کے حملے کے بعد لکھی جاتی ھے - مصنف کے والد اور چچا فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ) کے ملازم تھے اور مصنف ان کے قائم مقام کے طور پر کام کرتا رھا - اس کتاب کے علاوہ مناقب محمد شاھی اور کتاب تاراھی بھی انھی کی تصنیف ھے - ذیل کے ھندی الفاظ اس تاریخ میں شامل ھیں - طوالت کے ڈر سے میں نے صرف الفاظ پر قناعت کی ھے اور حوالۂ صفحات ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی مطبوعہ تاریخ سے دیا ھے :

یک سیر کھچڑی (صفحہ ۲۱۶)

چوکیہا می باید نشاند (صفحہ ۲۲۶)

منگہ پنج تنگہ منے بود (صفحہ ۲۳۳)

طائفہ بندگان باھلی........ گھڑیال خانہ (صفحہ ۲۷۱)

محل داکھ........... محل چھجۂ چوبین (صفحہ ۲۷۷)

بند سالورہ .... ھشتاد پنی (صفحہ ۲۹۶)

درخت سینبل.......... کھنبی (صفحہ ۳۰۹)

باھن پچی کردہ (صفحہ ۳۱۱)

آنرا بہندوی کلس گویند.....زنار داران و سیوڑگان (صفحہ ۳۱۲)

طائفہ کہار و کھوانی (صفحہ ۳۲۵)

در جنگلے یا گیلے (صفحہ ۳۲۷)

اگر در ںلے و دھڈے ماھی بودے........

در آن ںل و دھنڈ اندارند (صفحہ ۳۲۸)

دو دیگ ڈولۂ آھنین (صفحہ ۳۲۸)

بند مالجہ..... بند مہپال پور..... بند سالورہ

.....بند سہپیہ (صفحہ ۳۳۰)

عبدالحق عرف جاھر سوندھار.....جونہ پر و راح

.....لکھوک (صفحہ ۳۳۱)

مہر نیم جیتل کہ آنرا ادہ گویند و مہردانگ جیتل

کہ بیکہ خوانند (صفحہ ۳۴۴)

پیش سمدھیان (صفحہ ۳۵۱)

برگ درختان نغزک کہ آنرا در عرف پتے گویند (صفحہ ۳۶۱)

میکھد (صفحہ ۳۶۲)

طائفۂ ادو تیان (صفحہ ۳۶۷)

دونفر ڈھولی (صفحہ ۳۷۰)

دانگانہ کہ آنرا دھنگانہ گویند (صفحہ ۳۷۹)

ھر دو را منسکہ می گفتند۔ (صفحہ ۳۸۵)

گردونہا.........کہ بہ زبان ھندوی پھرکرا

(بھر کہ) گویند (صفحہ ۳۹۳)
روزینہ در خزانہ (صفحہ ۳۹۸)
ملک ساھن (صفحہ ۴۰۳)
چو کھنڈی (صفحہ ۴۰۶)
اے غیانگان (صفحہ ۴۱۰)
چون درمیان دائرہ وزیر و دائرہ بادشاہ هیچ فرق نیست (صفحہ ۴۱۱)
بالائے پلنگ (صفحہ ۴۲۳)
ملک مذکور را آنجامہ بغایت حوس کرد (صفحہ ۴۳۴)
کروراب (صفحہ ۴۳۹)
ٹٹ (صفحہ ۴۳۹)
دھول (صفحہ ۴۳۹)
کبہت (صفحہ ۵۰۶)

'حرم گاہ' اصل میں حرگاہ ہے جو بڑے خیمے کے معنی دیتا ہے - چوں کہ خر+گاہ کی ترکیب سے ذم کا پہلو بھی مترشح تھا ، اس لیے سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ و ۷۵۲ھ) نے اس ترکیب میں اصلاح دے کر خرمگاہ بنا لیا -

'پلنگ' اهل لغات کہتے ھیں ''چار پایۂ چوبیں کہ بران نشینند و خسپند و بیشتر در هندوستان متعارف است و مماں آنرا بہ نوار بہ بافند و محکم کنند -''

'کھور' پرانے پر اطلاق ہوتا ہے - یہاں پرانی اینٹوں سے مقصد ہے جن کو پیس کر چونے میں ملاتے تھے -

'چندہ' صحیح فارسی لفظ چیدہ ہے ، بہ معنی منتخب و خاص ، لیکن عوام اردو میں اب بھی چندہ بولتے ھیں -

'کڑہ' 'کڑاہ' اس کی تصغیر کڑاھی ہے -

'مال' بہ معنی دولت - هندوستان میں اس لفظ نے جدید معنے پیدا کر لیے یعنی نفیس پکوان ، اور مصنف نے انھی معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا ہے - اردو میں آج بھی یہی مفہوم موجود ہے -

'منگہ' مونگ -

'گیل' گیلا ، یعنی راستہ ۔
'ڈولہ' یعنے ڈول ۔
'کرک' ایک وزن کا نام ہے ۔
'ادوتیاں' بہ حالت جمع قصہ خوان ۔

'غیبانکاں' بہ حالت جمع ، غیبانہ اس کا واحد اور غیبانی مونث ہے۔ آخری شکل میں یہ لفظ آج بھی اردو میں مستعمل ہے ۔ اہل لغت کا خیال ہے کہ غیبانی دراصل غائبانی ہے ، یعنی ایسی عورت جو چھپ کر حرام کرائے ۔ لیکن اس کے مذکر غیبانہ کی موجودگی میں یہ تشریح کمزور ہو جاتی ہے ؛ شمس سراج کے ہاں یہ لفظ ایک معصوم گالی کے طور پر آیا ہے ۔ شیخ باجن کی تصنیف میں بھی یہ ملتا ہے ۔

'روزینہ' بہ معنی روزانہ استعمال ہوا ہے ؛ عام اردو میں اب بھی روزانہ کی جگہ روزینہ بھی بولا جاتا ہے ۔

'دائرہ' اس موقع پر خیمے اور فرودگاہ کے مفہوم میں لایا گیا ہے ۔ یہ نئے معنے ہندوستان میں اس لفظ کو ملے ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ ڈیرہ بہ معنی خیمہ اسی کی ایک بگڑی شکل ہے[1] ۔

'پنی' باغات کی پیمائش کا ایک پیمانہ ۔

'پچی' کے واسطے کہا گیا ہے کہ سنسکرت لفظ 'پکشن' سے ماخوذ ہے جس کے معنی مضبوط و مستحکم اور جمے ہوئے کے ہیں ۔ فارسی کا لفظ پرچین یہی مفہوم ادا کرتا ہے : ''تحقیق آنست کہ پرچین کردن بہ معنی محکم و استوار کردن است'' پرچیں کاری کے لیے لکھا ہے: ''انواع نقاشی کہ از سنگ پارہا بر سنگ دیگر کنند آنرا پرچین کاری

---

۱ ۔ مصنف کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ یوں بھی دونوں لفظ باہم مترادف ہیں اور مردانہ بیٹھک یا چوپال کے معنوں میں مستعمل ہیں ۔ عموماً پنجاب کے مشرقی اضلاع میں 'ڈیرہ' اور مغربی اضلاع میں 'دائرہ' مروج ہے ۔ دونوں ہی ترکیبی حالت میں آبادیوں اور بستیوں کے ناموں کے لیے استعمال ہوئے ہیں ، مثلاً ڈیرہ بابا نانک ، دائرہ دین پناہ وغیرہ (مرتب) ۔

گوبند ۔'' پچی کاری بھی یہی مفہوم ادا کرتا ہے ۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ 'پچی' اور 'پچی کاری' فارسی 'ہسر حین' اور 'پسرحین کاری' کی بگڑی شکل ہے ۔

'دل' تال یعنی تالاب ۔

'دھنڈ'[1] پانی کی قدرتی جھیل یا بڑا تالاب ۔

'دھنگانہ' یعنی دانگانہ ۔ ایک قسم کا محصول جو اجناس پر فی من ایک دانگ کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے ۔

'سالینہ' یعنی سالانہ ۔

کتاب باراهی

یہ نجوم و تفاؤل و شگون پر ایک کتاب ہے جو ورھمہر روبیا داس برهمن کی سنسکرت کتاب ''بری ہتہ سمہتہ'' کا ترجمہ ہے ۔ دیباچے میں مرحوم کا نام عبدالعزیز شمس سراج بهادسری مؤلف تاریخ فیروز شاهی لکھا ہے ۔ فیروز شاہ تغلق (م وفی ۷۹۰ھ) کو قلعۂ کانگڑہ کی فتح کے وقت ایک کتاب خانہ هاتھ لگا تھا ؛ اس میں یہ کتاب بھی شامل تھی جو بادشاہ کے حکم سے ترجمہ ہوئی ۔ مترجم نے سیکڑوں سنسکرت الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ میں نے ان سے قطع نظر کر کے بعض هندی الفاظ کو لیا ہے جو اتفاقیہ آ گئے ہیں ۔ میرے پاس باراهی کا ایک ناقص قلمی نسخہ ہے ۔

مہینوں کے نام : چیت ، بیساکھ ، جیٹھ ، اساڑھ ، ساون ، بھادوں ، آسوج ، کارتک ، مگسر ، پوس ، ماگھ ، پھاگن ۔

تتھوں[2] کے نام یوں دیے ہیں : پڑوا ، دوج ، تیج ، چوتھ ،

---

۱ ۔ موجودہ صورت ڈھنڈ ہے جو مغربی پاکستان کے طول و عرض میں موجود ہے ۔ وادی کاغان میں 'ماهی ڈھنڈ' اور سندھ میں 'مکھی ڈھنڈ' 'منچھر ڈھنڈ' وغیرہ ۔ خالص سندھی صورت 'ڈنڈھ' ہے ۔ (مرتب)

۲ ۔ تتھ بمعنی قمری دن ۔ (مرتب)

پنچمیں ، چھٹہ ، ستمیں ، اشتمی ، نویں . . . . . . ایکاوسی ، دوادسی ؛ نرودسی ، چتروسی ، پونو ، اور دوسری قسم میں اماوس ہے ۔

'الفاظ' : بیغ و کٹارہ ، نتہ ، مندل ، بکہ ، یعنی نیمہ ، نھل یعنی زمیں ریگستان ، پوست درخت هابلہ و بلیلہ کہ آنرا بہندوی کساهلہ خوانند ۔ لشکریاں و مہنگاں ، جوگیاں و بقالاں و کھتریاں ۔ غلہ نخود و منگ و لوبیا و ماس و موٹھ ۔

مفرح القلوب

میں اس کی تاریخ تصنیف سے ناواقف ہوں ؛ صرف اسی قدر معلوم ہے کہ کتاب 'هتپدیش' کا ترجمہ ہے ، جس کو تاج الدین مفتی الملکی نے ملک الملوک الشرق و الغرب نصرہ الدولہ والدین مقطع شو بہار کے حکم سے کیا ہے ۔ بعض الفاظ قدیم کی موجودگی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب نویں صدی هجری میں کسی وقت لکھی گئی ہوگی ۔ مفرح القلوب میں گولہ و تفنگ کے الفاظ موجود ہیں ، اس وجہ سے شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے بعد لکھی گئی ہو ۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آلات آتش باری اس عہد میں هندوستان میں رائج ہو چکے تھے ، خصوصاً دکن میں ۔ فرشتہ تاج الدین فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰ھ و ۸۲۵ھ) کے عہد میں ان کا ذکر کرتا ہے ۔ فرهنگ شرفنامۂ احمد منیری میں جو باربک شاہ والئی بنگال (۸٦۴ھ و ۸۷۹ھ) کے عہد کی تصنیف ہے ، لفظ 'کشکنجیر' کی تشریح گولے سے کی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ گولہ و تفنگ کا استعمال اس قرن میں هندوستان میں ہو رہا تھا ۔ مفرح القلوب میں هندوستانی خیالات میں طرز تکلم کا اس قدر غلبہ ہے کہ قدم قدم پر اس کی جھلک نظر آتی ہے ۔ یہ خصوصیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک سنسکرت کتاب کا ترجمہ ہے یا یہ کہ اس میں هندوستانی طریق زندگی کا نقشہ ہے ، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس کا ترجمہ کنندہ ایک هندوستانی ہے جو هندی زبان میں غور و فکر کرنے کا عادی ہے ۔ الفاظ ذیل اس کتاب سے ماخوذ ہیں :

درخت باکھر	(صفحہ ۲۵)	جوگی	(صفحہ ۴۷)
کھبر	(صفحہ ۴۷)	مرابہ	(صفحہ ۷۷)
نہال گردیدن	(صفحہ ۹۲)	لنگوتی	(صفحہ ۱۴۴)
کچھونہ	(صفحہ ۱۴۴)	کاهل	(صفحہ ۱۸۹)
چتھر	(صفحہ ۱۹۳)	دیوهره	(صفحہ ۲۰۵)
دائرہ	(صفحہ ۲۰۵)	سحرک	(صفحہ ۲۱۳)
روزینہ و سبیمہ	(صفحہ ۱۱۳، ۱۵۷)		

'کھبر' پیالہ و رکابی -

'مرابہ' پورا جملہ یوں ہے ''مرابۂ بادشا هی بھہ نوعِ می یابند'' صحیح لفظ مرتبہ ہے یا بہ حالت جمع مراتب ، لیکن عوام الناس جہاں اور غلط الفاظ بولتے ہیں ، مراتبہ بھی بول جاتے ہیں ، مثلاً خدا تمھارا مراتبہ دونا کرے -

'نہال گردیدن' اردو کے محاورے 'نہال ہونے' کا لفظی ترجمہ ہے جس سے مراد سر سبز ، کامران ، شاد کام اور فائزالمرام ہونا ہے -

'کچھونہ' یعنی کچھنہ -

'چتھر' چھتری -

'کاهل' عربی اور فارسی میں سہ معنی سست مستعمل ہے ، هندوستان میں ڈرپوک اور بزدل کے معنوں میں آتا رہا ہے - چناں چہ 'مفرح القلوب' کا یہ جملہ ''هرکہ باشوا کارکند و عصہ بسیار دارد وکاهل و ترساں و غافل و بد بساں و دروغی باشد -'' (صفحہ ۱۸۹)

ایک پرانی مثال ضیاء برنی کی تاریخ سے ملاحظہ ہو :

''و بجائے آنچناں دانایان و کارداناں علام بچگاں کاهل بے سروپا و خواجہ سرایان بے ثمر را در آوردہ -'' (صفحہ ۳۶۷)

دکنی سے مثال :

تو ہم اک ناگ کو ماریں یہ دس مل
هموں کو کیا تمیں بوجھے ہو کاهل

'مؤید الفضلا' میں بد دل کی شرح میں کاهل لکھا گیا ہے -

'متحرک' اس لفظ کا استعمال اس جملے میں ہوا ہے : "اے ھدھد ہر کہ سخن متحرک استوار دارد ہمان معاینہ کند چناں چہ ملتانی ۔"
(صفحہ ۲۱۵)

یہاں متحرک دھوکے باز اور چال باز کے معنوں میں آیا ہے ۔ یہ ایسے معنے ہیں جو صرف ہندوستان میں اس لفظ کو ملے ہیں ۔ یہی حالت لفظ 'حرکت' کی ہے جس کے معنے اردو زبان میں چال ، دم اور جھانسے کے لیے جاتے ہیں لیکن ناظرین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اب سے ساڑھے پان سو سال پیشتر بھی یہ لفظ بعینہ انھی معنوں میں استعمال ہو رہا تھا ۔ میں شمس سراج کی تاریخ فیروز شاہی سے ایک مثال دیتا ہوں :

"باما آنقلندران حرکت کردہ لشکر مارا بہ تعبیہ از درون حصار بیرون آوردہ ۔" (صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

'شبینہ' یعنی شبانہ اردو میں جہاں عوام الناس سالنہ اور روزینہ بجائے سالانہ و روزانہ بول جاتے ہیں ، شبینہ بجائے شبانہ بھی کہہ دیا کرتے ہیں ۔

فارسی میں بعض الفاظ کے آخر میں یائے زائدہ لانے کا دستور ہے ؛ ہندوستان میں اس 'ی' کا بہت رواج رہا ہے ۔ پنجابی اور دکنی اردو میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں ، لیکن 'مفرح القلوب' سے یہ مثالیں ملاحظہ ہوں :

غروری بجائے غرور (صفحہ ۵)
منغصی بجائے منغص (صفحہ ۲۰۷)
قلبی بجائے قلب (ناسرہ) (صفحہ ۲۰۹)

یائے فاعلیت کی مثالیں :

زحمتی (مریض) (صفحہ ۱۴) - دروغی (صفحہ ۱۸۹) - چہار پائی (صفحہ ۲۷) علی ھذا دانائی اور دشمنی کی جگہ دانایگی اور دشمنایگی لایا گیا ہے ۔ (صفحہ ۳۰ ، ۳۲ ، ۱۱۱ ، ۱۲۹ اور ۱۵۰) - اردو میں عوام آج

بھی دانایگی اور دشمنایگی بول جاتے ھیں - اردو میں فعل 'رھنا' کسی امر کی مداومت کے اظہار کے لیے خصوصیت کے ساتھ لایا جاتا ھے ، جو کام فارسی میں 'می' یا 'ھمی' سے لیا جاتا ھے - مفرح القلوب اس خاص معاملے میں بالکل اردو کی تقلید کرتی ھے ، مثلاً 'بے خبر افتادہ ماند' (صفحہ ۶۱) یعنی بے خبر پڑا رھا - 'ایستادہ شدہ ماند' (صفحہ ۳۸) کھڑا کا کھڑا رھا - 'خدمت گاری کردہ خواھم ماند' (صفحہ ۱۴۸) خدمت کرتا رھوں گا - 'نزدیک دیو ھرہ نشستہ میماند' (صفحہ ۲۰۵) دیوھرے کے پاس بیٹھا رھتا - 'خرا از دیدن ما درون سوراخ شدہ ماندی (صفحہ ۲۱) -

فارسی زبان میں طریق تعدیہ کا استعمال کم ھے ، برخلاف اس کے اردو میں بہت عام ھے - چنانچہ اردو کا اثر ھم اس عہد کے مصنفین میں بھی دیکھتے ھیں ، مثلاً ضیاء برنی :

'در خرانہا جاروب دھانید ' (صفحہ ۱۸۴) گویا 'جھاڑو دلوا دی' کا ترجمہ کیا ھے - علی ھذا 'خلقے را کشانند' (صفحہ ۱۷۴) 'جاروب زنانند (صفحہ ۲۳۴) - و نام ایشان را از خطبہ دور کنانند و ایشان را معلب گویانید' (صفحہ ۴۹۳) - 'خود را سلطان محمد خوانانیدے و سلطان محمد گویا شدے' (صفحہ ۴۹۷) - کہ سالہا خود را ابو بنگال میخوانانیدند و مرد ھا میگویانیدند' (صفحہ ۵۹۳) -

مفرح القلوب سے اس کی مثالیں :

'تفاوت کنانید' (صفحہ ۲۷) 'سان ایشان یاری بود - عورتے زال جدائی کنانید' - (صفحہ ۹۶)

میں اس موقع پر اپنے مضمون سے گریز کرکے چند کلمے ایک ضروری امر کے متعلق کہنا چاھتا ھوں - ھمارے ھاں یہ عقیدہ ھے کہ مسلمانوں نے ھندوستان میں آ کر ایک دراز عرصے تک صرف فارسی زبان سے سروکار رکھا اور اس ملک کی کسی زبان سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا ؛ برخلاف اس کے میرا خیال ھے کہ انھوں نے خواہ

اس وقت جب کہ غزنوی دور میں پنجاب میں مقیم تھے ، اور خواہ اس وقت جب کہ قطب الدین کے ساتھ جا کر دھلی میں آباد ہوئے ، اس ملک کی زبانوں میں برابر دل چسپی لی ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستانی ماحول کے مطابق اپنے تمدن و زندگی میں ضروری تبدیلیاں بھی کر لی ہیں ۔

ان ایام میں سب سے زیادہ اقتدار عربی کو حاصل تھا ۔ وہ ان کی علمی و مذہبی و قانونی زبان تھی ۔ علما کے علاوہ طبقۂ مشائخ میں بھی مقبول تھی ۔ یہ شیخ اپنے مریدوں کو خلافت نامے تک اسی زبان میں دیتے تھے ۔ شیخ فریدالدین گنج شکر نے جو خط سلطان غیاث‌الدین بلبن کے نام لکھا ہے ، عربی میں تھا ۔ تمام کتبے مساجد و قبور و دیگر عمارات کے عربی میں ہوتے تھے ۔ ساتویں صدی ہجری بلکہ منتصف قرن ہشتم کے بعد تک یہی کیفیت رہی ۔ مسکوکات کی زبان عربی تھی یا سنسکرت ۔

فارسی کا درجہ دوسرے نمبر پر تھا ۔ یہ خیال کہ ہر شخص فارسی جانتا تھا ، قطعاً غلط ہے ۔ فارسی جاننے والوں کی تعداد فارسی نہ جاننے والوں کے مقابلے میں بہت کم تھی ۔ غلاموں کے زمانے میں مسلمان جماعت زیادہ تر ترک ، ایرانی ، خلج ، افغان ، ہندو اور ہندی مسلمانوں پر شامل تھی جن کی قومی زبانیں بالکل مختلف تھیں ۔ ان میں تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد بہت محدود تھی ۔ دربار کے سوا فارسی زبان عوام‌الناس میں کم سمجھی جاتی تھی ۔ البتہ ایک بڑی جماعت اس کی تحصیل و تعلیم میں ہر وقت مصروف تھی ۔ شعر و تاریخ و سیر و تصوف و انشا کے لیے فارسی سے زیادہ کام لیا جاتا تھا ۔ آٹھویں صدی سے اس میں فرہنگ نگار اور شرح نگار پیدا ہونے لگے ہیں ۔ مشائخ کی مجالس حال و قال میں جس طرح فارسی کی غزلیات پر لوگ سر دھنتے تھے ، اسی طرح عربی کے قول اور ہندی نغمات پر بھی وجد کرتے تھے ۔ مغلوں کے زمانے میں جو عروج فارسی زبان کو ہندوستان میں ملا ، اس سے قبل کبھی نصیب نہیں ہوا ۔

رہی ہندی زبان ، سلطان محمود نے لاھور میں جو سکہ چلایا تھا ،

اس میں ایک طرف عربی اور ایک طرف سنسکرت تھی ۔ محمود کے جانشینوں نے اس ملک میں جو سکے لگائے (یہ سکے چاندی اور تانبے کی آمیزش سے تیار ہوتے تھے) ان میں بالکل ہندی سکے کی طرز اختیار کر لی گئی تھی ، یعنی ایک طرف گھوڑے کا سوار ہے اور دوسری طرف نندی بیل کی تصویر ہے ۔ ایک طرف 'سری همیر' (امیر) اور دوسری جانب 'سمنتا دیو' به خط سنسکرت مرقوم ہے ۔ غوریوں نے اپنے زمانے میں غزنویوں کی تقلید کی ۔ معزالدین محمد بن سام (متوفی ۶۰۲ھ) کے مسکوکات پر کبھی 'سری همیر' ہے ، کبھی 'سری مہمد سام' (محمد بن سام) ہے ، بلکہ ایک دستار پر ایک جانب لکشمی کی تصویر ہے اور ایک طرف سری مہمد ون سام' (محمد بن سام) ہے ۔

جب علاؤالدین محمد خوارزم شاہ(۶۱۷ھ) کا ہندوستان کے کچھ علاقے پر قبضہ ہوتا ہے تو وہ بھی غزنویوں اور غوریوں کی تقلید پر مجبور ہوتا ہے ۔ اس کے اکثر سکوں پر نندی بیل کی تصویر ملتی ہے ۔

شمس‌الدین التمش (۶۳۳ھ) کے عہد میں بیل اور سوار کی تصویر کے سکے نہایت عام ہیں جن میں اس کا نام کبھی ''سری سرطان شمس دنڑ'' (شمس‌الدین) ، کبھی ''لمس'' (التمس) اور کبھی ''سمسیرلدیو'' (شمس‌الدین) ہے اور دوسری طرف ''سری کھلیہ'' (خلیفه) ہے ۔ بعض پر ''سری مسستسر'' (مستنصر باللہ ۶۲۳-۶۴۰ھ) ہے ۔ سنسکرت علاؤالدین محمد شاہ خلجی (۷۱۵ھ) کے آخر عہد تک سکوں پر برابر درج ہوتی رہی ہے ۔ نہ صرف سکوں میں انھوں نے ہندوستانی ماحول کا لحاظ کیا ہے بلکہ اور امور میں بھی، یعنی مالیات میں قدیم دستور کو ملحوظ رکھا ۔ پٹواری ، بلاهر اور چودھری به دستور رہے ۔ دیہی حسابات کا پٹواری کی ہی پر دارومدار رہا ۔ تنکہ ، دسوه' پیمایش میں' من اور سیر اوزان میں' جیتل اور تنکہ زر رائج میں قائم رہے ۔ طرز زندگی میں ہندوستانی بن گئے ؛ پلنگوں اور کھاٹوں پر سونے لگے، پان کھانے لگے ، کھچڑی کے بہت شائق تھے ، عرسوں کے موقعوں پر لوہے کے کڑھاؤں میں کھانا پکاتے تھے ، سلاطین اور شہزادگان کی وفات کے وقت ماتم داری کے ایام

میں زمین پر سوتے تھے[۱]، جس سے محاورہ 'زمین خفتن' نکلا۔ خسرو :

وز زمین خفتن ھمه آفاق شد پہلو کبود

ھندی موسیقی کے ساتھ ابتدا ھی سے ان کو شغف رہا ہے۔ شیخ بہاءالدین زکریا کی طرف ملتانی ٹوڈی منسوب ہے۔ شیخ نظام الدین اولیا (۷۲۴ھ) کو مولانا وجیہ الدین کی ھندی جکری پر حال آیا[۲] تھا۔ گوپال نایک دکن سے علاء الدین خلجی کے دربار میں آتا ہے اور اپنا کمال دکھاتا ہے۔ امیر خسرو اسی کے میدان میں اس کو شکست دیتے ہیں۔

سلطان محمود کے زمانے سے ھندو فوجیں بھرتی کی جاتی تھیں۔ سلطان مسعود شہید کے عہد میں سندر سپہ سالار کی وفات پر تلک کو ھندو فوجوں کا افسر بنا دیا جاتا ہے اور نیالتگین والئی ھند کی سرکوبی کے لیے جس نے بغاوت کا اعلان کر دیا تھا ، ھندوستان بھیجا جاتا ہے۔ تلک نے نیالتگین کو شکست دے کر بغاوت کو فرو کیا۔ اسی عہد میں ایک فوج ھندوؤں کی کرمان میں متعین کی جاتی ہے۔ عین گھمسان کی جنگ میں یہ لوگ پشت دکھاتے ہیں اور غزنویوں کو شکست ھو جاتی ہے۔ سلطان ان مفرورین کے پیشواؤں کو بلواتا ہے اور اس بزدلی کا باعث دریافت کرتا ہے۔ ان سرداروں میں سے چھ شخص کٹار کھا کر اپنے آپ کو ھلاک کر دیتے ہیں۔ سلطان مسعود کو اس حادثے کی اطلاع پہنچتی ہے اور وہ جھنجلا کر کہتا ہے :

''این کتاره بکرمان با یست زد۔'' (تاریخ بیہقی صفحہ ۵۳۴)

غلاموں کے زمانے میں بھی اسلامی فوجوں کے ساتھ ھندو شامل ہوتے تھے۔ ان میں راوت (راجپوت) دھانک (تیر انداز) پایک (پیادے) جنگ میں حصہ لیتے تھے۔ کہار اور کھوانی باربرداری کے کام میں

۱۔ دیکھو برنی ، صفحہ ۱۲۳

۲۔ سیرالاولیاء ، صفحہ ۵۱۲

مصروف تھے - دھاوے ڈاک کا کام کرتے تھے - دھکڑوں کے سپرد
کچھ اور خدمات تھیں - تاغلق وفیروز شاہ تغلق کے عہد میں شکار میں
امداد دیتے تھے - ملک چھجو والئی اودھ کی فوج جس نے جلال الدین
فیروز شاہ خلجی کے مقابلے میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا تھا ،
زیادہ تر ہندوؤں سے بھرتی کی گئی تھی -

ہندو طبیب بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور مسلمان
مریض بلا تکلف ان کی طرف رجوع کرتے تھے - ضیاء برنی علاؤالدین
خلجی کے ذکر میں ہندو اطباء کے واسطے یہ جملہ لکھتا ہے :

''و تا کَرتان و برهمان و جانبان در شهر طبیبان معروف و مشهور بودند
و مبارک نفسے (جون) مه جدر طبیب و مدرک مرضے همچو جا جا
جراح در هندوستان نبودند و بتانند که در نظر اول مرض را در یابند
و به علاج و مداوی دفع (به) کنند -''

(صفحہ ۳۶۳ ، تاریخ فیروز شاہی)

جوتشی بھی علی ھذالقیاس بے حد مقبول تھے ؛ عوام تو در کنار
سلاطین تک ان کی قدر کرتے تھے - مؤرخ موصوف ان ہندو نجومیوں
کے متعلق کہتا ہے :

''و نبیانیان که ار همه دریں علم نسمر بودند جندان صدقات ار
سلطان علاؤالدین و ار حرم او می‌یافتند که ایسان را ازان اسباب‌ها
می شد و در شهر از مسلمانان و هندوان منجم بسیار بودند -''

(صفحہ ۳۶۴ فیروز شاہی)

مسلمانوں کے پورے پورے ہندی بن جانے کا اس سے زیادہ اور کیا
ثبوت درکار ہے کہ وہ اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے تھے -
امیر خسرو :

ترک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

انھوں نے ہندی نام اور عرف تک اختیار کر لیے تھے ، مثلاً
ملک چھجو غیاث الدین بلبن (متوفی ۶۸۹ھ) کا بھتیجا تھا -

ملک جوناں محمد بن تغلق (۷۲۵ھ) کا نام تھا۔ اسی طرح ملک بھٹا خازن ، ملک مقبول عرف تورا بائد ، ملک فخرالدین کھنڈ ، ملک رکن الدین انبہ ، ملک هرن مار ، علاء الدین کڑک ، ہیرا مالی ، شیخ باہو نایک بچه ، لدھا باغبان ، سگا طباح ، اختیارالدین مدھو ، نتھو سوڈھل ، حسام اڈھگ شیخ موهن، مولانا شہاب‌الدین کستوری ، خواجه لطیف‌الدین کھنڈسالی ، محمود پٹوہ ، عبدالحق عرف جاھر سوندھار ، ملک ساھن ، مردوں کے ، اور لادی ، کرنا اور بی‌بی رانی عورتوں کے نام تھے ۔

یہی اصول بسنه وروں ، عہده داروں اور عمارات وغیرہ کے ناموں میں بھی کام کر رہا ہے ۔ مثلاً راوت عرض اور مہله دار ۔ امیر خسرو کے نانا راوت عرض تھے ۔ محل داکھ اور محل چھجۂ چوبیں ، کوشک ، مہندواڑی اور کوشک سالورہ ۔ نگنی گھر ، طاس گھڑیال ، گھڑیال خانہ ، حوض رانی ، حنڈو گھر ، بند سالورہ ، بند مالجه ، چوترۂ سبحانی ، چبوترۂ ناصری وغیرہ ھندی فارسی آمیز نام ھیں ۔

ان مثالوں سے ظاھر ھوتا ھے کہ یہ لوگ بالکل ھندوستانی بن گئے تھے اور ھندی زبان ان میں رچ گئی تھی ۔ وہ یہی زبان بولتے تھے ، اسی میں سوچتے تھے اور جب فارسی لکھنے بیٹھتے تو نادانستہ ھندی محاورے اور ضرب الامثال ان کے قلم سے ٹپک پڑتے تھے ۔

ناظرین کو علم ھو گا کہ امیر خسرو پر اعتراض ھوئے ھیں کہ وہ فارسی میں ھندی محاورات کا استعمال کر جاتے ھیں ۔ مولانا شبلی نے ذیل کے محاورے ، جو قابل اعتراض ٹھہرے ھیں ، اپنی تصنیف 'شعرالعجم' میں غالباً شرع‌الشعرا سے نقل کیے ھیں :

آوار کردن ، گفتار مکویم ، مالا کلام کردن ، زگرہ او چه می‌رود ،

ان ابیات میں یہ محاورے آئے ھیں :

(۱) سالہا شد کہ نیایم حبرو در کویت
دل ویران شده را آیم و آواز کم

(۲) من از سر زنده گردم گر تو یارا یک سخن گوئی
تو میدانم نه گوئی لیک من گفتار مہکویم

(۳) دعوائے خون بہائے دل خویش می کنم
یک بوسہ با لبم زن و مالا کلام کن

(۴) جان میرود ز من چو گرہ میزند بہ زلف
مردن مراست از گرہ او چہ میرود

راقم کا خیال ہے کہ 'آوار کردن' پر اعتراض حق بجانب نہیں۔ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں :

صائب

خضر در بادیۂ شوق ز ہمراہی من
آنقدر دور نماند است کہ آوار کم

سلیم

بے تکلف من نمیرفتم بہ بزم او سلیم
سرمۂ چشم در افسونش مرا آوار کرد

(بہار عجم)

'از گرۂ او چہ میرود' بہ ظاہر ''اس کی گانٹھ سے کیا جاتا ہے'' کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ وارستہ اور خان آرزو اس کو ترجمہ مانتے ہیں لیکن صاحب 'بہار عجم' اختلاف کرتے ہیں اور صائب کا شعر ذیل نقل کرتے ہیں :

خون میچکد زغنچۂ منقار بلبلاں
زین سقد پارہ کز گرہ روزگار رفت

صائب کے ہاں اس میں شک نہیں محاورے کی صورت کسی قدر بدلی ہوئی ہے۔ میرزا غالب کا یہ شعر بھی یاد رہے :

گوئی صباد در شکن طرہ خون شود
دل زان سبب از گرہ ما چہ میرود

'مالا کلام کرنا' کسی سودے یا معاملے کے انقطاع و فیصلے کے لیے راقم نے جے پور میں بولتے سنا ہے۔ گفتار مگوئیم ، بات کہتا ہوا کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ امیر خسرو کے ہاں اور ایسے محاورے ہیں جن کو ہندوستان کا پر تو مانا جا سکتا ہے ، مثلاً :
'نیشکر با پیل خوردن' ہاتھی کے ساتھ گنے کھانے کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے :

نشاید نیشکر با پیل خوردن
نہ در نگ با صبا تعجیل کردن

(خضر خانی ، صفحہ ۳۰۰)

شعر آیندہ میں 'دندان در شکم بودن' اس کے پٹ میں دانت ہیں یا اس کے پیٹ میں ڈاڑھی ہے کا ترجمہ ہے :

چون بیر بدان راست دلش را زیراک
چون خرپزہ دندانش درون شکم است[۱]

چہ بینی چرخ را رانگونہ خندان
نگہ کن در شکم چند است دندان

'سب کو ایک لاٹھی ہانکنا' اردو کا محاورہ ہے ، امیر بعینہ اس کا لفظی ترجمہ ''یک چوب ہمہ را راندن'' کرتے ہیں :

رباعی

خسرو ز زبان ست گوہر ہمہ را
پیدا ز نہان تست جوہر ہمہ را
شد راندہ سنان و تیغ و تیر از کلکت
زین گونہ بیک چوب مران ہر ہمہ را

(غرۃ الکمال)

شعر آیندہ میں 'ان تلوں میں تیل نہیں' کا ترجمہ ہے :

خالے بہ رخش دیدم و گفتم کہ تل است
گفتا کہ برو نیست درین تل تیلے

غصہ عربی اور فارسی میں اندوہ گلوگیر اور اندوہ کے لیے استعمال

---

۱ - از شعرالعجم ، جلد دوم ، صفحہ ۱۰۹ -

ہوتا ہے ؛ اردو میں یہ لفظ بالعموم خشم اور طیش کے مفہوم میں لایا جاتا ہے ؛ امیر خسرو بھی انھی معنوں میں لائے ہیں :

شـد انـدر غـصـہ شادی خـان والا
مـدد جست از سنـاہ حـق تعالیٰ

(صفحہ ۲۷۶ ، خضر خانی)

ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے مصنفین بھی یہی معنے لیتے ہیں ، مثلاً ضیاء برنی اپنی تاریخ میں :

''و اگر تو غصہ خواہی کرد ۔'' (صفحہ ۲۸۵)

''و دراں ایام غصہ سلطان محمد برخلق بستر بود ۔'' (صفحہ ۵۱۳)

فرہنگ بحرالفضایل میں بھی غصہ بہ معنی غضب دکھایا گیا ہے ۔ مفرح القلوب سے دو مثالیں عرض ہیں :

''در غصہ خود را نسورد'' ۔ (صفحہ ۳۲)

''چوں بکمسار وزیر غصۂ پادشاہ فرونشت'' ۔ (صفحہ ۱۶۷)

ہندوستان میں یہ معنے اس قدر عام رہے ہیں کہ ظہوری بھی نہیں بچ سکا ۔

فرو میخورم غصۂ سنہ در

امیر خسرو کے کلام میں اگر باقاعدہ تلاش کی جائے تو مجھ کو یقین ہے کہ ایسی اور مثالیں دستیاب ہوں گی جن میں ہندی الفاظ اور محاورے استعمال ہوئے ہیں ۔ ان کی مثنوی مفتاح الفتوح سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے جس میں 'مار مار' استعمال ہوا ہے :

ز سرکاں سپر زہر آلود میخورد
ہندی مار مار آغاز میکرد

'مار مار' بہ معنی سعی ہمہم ہم اس سے پیشتر بھی دیکھ چکے ہیں جو 'خزائن الفتوح' میں آیا ہے ۔

ضیاء برنی کے ہاں بھی ہندوستان کا اثر موجود ہے ۔ اردو کا ایک

محاورہ ہے 'چراغ لے کے ڈھونڈنا'، برنی نے اس کو یوں لکھا ہے :

''مغل را چراغ بر کردہ طلب کردے ۔'' (صفحہ ۳۴۳)

''این روز چراغ برکردہ میطلبیدند ۔'' (صفحہ ۱۷۰)

چراغ بر کردن، بہ معنی روشن کردن چراغ ۔

'بیڑہ اٹھانا' ایک اور محاورہ ہے جس کے معنے فارسی میں یوں بیان ہوئے ہیں :

''در زمان سابق در سلاطین هند رسم بود که پیش امرا برائے انصرام رساندن مهم بیڑۂپان می انداختند، کسیکه آنرا برداشتے انصرام آن مهم بذمۂ او واجب شدے'' (غیاث) ۔

ضیاء برنی یہی محاورہ اپنی تاریخ میں لاتا ہے :

''راوتان و پایکان معروف از ملک جهجو بیڑۂ تنبول گرفته بودند و دعوی کردہ ۔'' (صفحہ ۱۸۲)

''و بیڑۂ جانبازی از پیش الیاس بهنگی مگرفتند ۔'' (صفحہ ۵۹۳)

امیر خسرو کے بیان سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ بیڑے کی رسم ان ایام میں قبل از جنگ عمل میں آتی تھی اور بیڑہ تمام لشکر کو ملتا تھا تا کہ جنگ کے وقت وفادار رہے ۔

''بنتخنان رنگین فرایش دادند که راوتان را بیڑۂ تنبول باید داد تا جان سپاری کنند ۔ باشارت رائے همه برگستوانی و پایک تنبول شدند ۔'' (صفحہ ۱۶۰، خزائن الفتوح)

'اندر اندر گھٹنا' اردو روزمرہ ہے ؛ برنی لکھتا ہے :

''و درون درون میکا هیدند'' (صفحہ ۴۰۴)

'خالہ کا گھر' ایک اور محاورہ ہے ؛ برنی کہتا ہے :

''چنان که خوردگان نازنین در خانۂ خالگان مهمان روند ۔'' (صفحہ ۴۱۴)

'اللہ آمین' ایک اور محاورہ ہے ؛ برنی کہتا ہے :

''و آنکہ مثل زنند آمین اللہ امین اللہ کنان در منزل اول رسیدند ۔'' (صفحہ ۵۳۵)

اردو میں چکر آنا بولتے ہیں ؛ برنی نے 'دوران آمدن' لکھا ہے :

'' و فلک را از نظارۂ حنان نثارے دوراں مے آمد ۔'' (صفحہ ۳۵۷)

'انگشت در دھان انداختن' رحم اور امان کی درخواست کرنے کے معنوں میں فارسی محاورہ نہیں ہے ؛ لیکن برنی لکھتا ہے :

''ہر دو انگشت در دھان می انداختند ۔'' (صفحہ ۵۹۳)

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کوئی ہندی محاورہ ہے ؛ فارسی میں اس کے قریب 'انگشت امان' اور 'انگشت زینہار' ہے ۔

''اشتر دردیدن و کور روس راست نیاید ۔'' (صفحہ ۲۵۷)

برنی کے ہاں یہ ضرب المثل بھی ہندی الاصل معلوم ہوتی ہے ۔

شمس سراج عفیف کے ہاں بھی ہندوستانی اثر موجود ہے ؛ مثلاً اردو محاورہ 'اپنی گرہ سے خرچ کرنا' اس نے یوں ادا کیا ہے :

''خرج و اخراجات از گرہ خویش میکردند ۔'' (صفحہ ۵۹)

چپکے چپکے کا ترجمہ ''خواجۂ جہاں پنہاں پنہاں در خاطر خویش'' کیا ہے (صفحہ ۶۷) ۔ ایک لفظ کی تکرار سے فارسی میں کثرت معلوم ہوتی ہے اور اردو میں محاورہ ہے ۔ پان دینے کا ترجمہ اس کے ہاں ''برگ دادے'' (صفحہ ۱۰۱) ہے ۔ بارہ باٹ ہونا مختلف الرائے یا منتشر یا پراگندہ ہونے کے لیے آتا ہے ؛ شمس سراج کسی قدر اختلاف سے لکھتا ہے :

''خلایق دھلی ھفت رہ شدہ'' (صفحہ ۱۸۵ ، ۳۰۶ ، ۳۲۷)

'ناک میں دم آنا' اردو کے ساتھ مخصوص ہے ، مگر شمس سراج لکھتا ہے :

''جان ایشان بہ بینی رسیدہ ۔'' (صفحہ ۲۲۶)

اور امیر خسرو فرماتے ھیں :

تا تو از چشم لطف در بینی — جان مردم رسید در بینی

''بسیار بسیار در حضرت بیاورد'' صفحہ ۲٦۹ میں بسیار کی تکرار ہندوستان کا پرتو ہے ۔ ذرہ بھریا 'ذرہ برابر' اردو میں رات دن بولا جاتا ہے ؛ شمس سراج لکھتا ہے :

''ذرہ میل خم نداد'' صفحہ ۳۱۲ ، ۳۳۸

'کسی کی ھائے لینا' اردو ہے ۔ شمس سراح کے ھاں اس کا ترجمہ بھی موجود ہے : ''آہ دل او کہ بستاند'' (صفحہ ۵۱۳) اسی طرح 'سختی پر سختی کرنا' کا ترجمہ اس کے ھاں 'تفتی بر تفتی کردمے' ہے ۔ (صفحہ ۳۹۷) ۔ 'پگڑی اتارنا' اردو میں کسی کی بے عزتی کرنے کے مرادف ہے ؛ یہی مفہوم شمس سراج کے ھاں بھی موجود ہے :

''چون پگ از سر فرود آوردند چہ حرمت ماند'' (صفحہ ۳۳۴)
مفرح القلوب میں ہندوستانی محاورے اور ضرب الامثال بہ کثرت ھیں ؛ میں بعض یہاں درج کرتا ھوں :

'آن کی خوشی اس میں ہے' اس مطلب کو فارسی میں یوں ادا کیا ہے : ''خوشی ایشان برینست'' (صفحہ ۹)

'خوش ھوئے' کا یوں ترجمہ ھوا ہے ''بیربل از گفتار زن خوش شد ۔'' (صفحہ ۱۸۰)

'کانوں پر ھاتھ دھرنا' : ''گربہ ھر دو دست خویش برگوش نہاد ۔'' (صفحہ ۳۲)

'جان ہے تو جہان ہے' : ''اول جان بعدہ جہان ۔'' (صفحہ ۲۲)
'آدھی کو چھوڑ ساری کے پیچھے دوڑنا' : ''نیم نان گزاشتہ برائے تمام نان برود ۔'' (صفحہ ۱۷)
نجم الامثال میں یہی مثال یوں دی گئی ہے :
''آدھی کو چھوڑ ساری کو دھائے ، آدھی رہے نہ ساری پائے ۔'' (صفحہ ۱٦)

اسی طرح ایک اور ضرب المثل ہے :
'چور کی ماں کوٹھی میں سر دے کر روو ے' (نجم الامثال ۔ صفحہ ۱۵۲)

مفرح القلوب میں اس کو یوں ادا کیا گیا ہے ۔ ''مادر دزد سردر گندو انداختہ گریہ میکند ۔'' (صفحہ ۱۰۵)

'تسموں سے کھال ادھیڑنا' اردو کا روز مرہ ہے لیکن مفرح القلوب ''پوست تسما از دوال خواهم کشید۔'' (صفحہ ۱۲۶)

مگر سب سے عجیب ترجمہ افیون اتر جانے کا کیا گیا ہے یعنی ''چوں افیون فرود آمدے''۔ (صفحہ ۱۲۶)

اسی طرح اور روزمرے ہیں ، مثلاً ''از من چه خواهد گرفت'' (صفحہ ۱۰۳) یعنی میرا کیا پکڑے گا یا مجھ سے کیا لے گا ۔ ''اگر حریف خود میخواہی'' (صفحہ ۱۴۶) 'اگر اپنی حریف چاہتے ہو' کا ترجمہ ہے ۔ ''این اندک لطف که جان مرا گذاشته'' (صفحہ ۱۶۸) یعنی یہ کیا تھوڑی مہربانی ہے کہ میری جان چھوڑ دی (بخش دی) ۔ 'این بخت من کشاده' (صفحہ ۲۱۹) یعنی میرا نصیبہ کھل گیا ۔ اور ''زنار داران گریختند که موازنه دوازده کروه صباح شد ۔'' (صفحہ ۱۸۷) یعنی برہمن ایسے بھاگے کہ بارہ کوس پر جا کر صبح ہوئی ۔

'موت ہونا' اردو ہے لیکن تاج الدین فرماتے ہیں :
''وقت برآمدن آفتاب موت وے خواهد شد ۔'' (صفحہ ۱۷۹) اور چھینٹ چھینٹ کر دینے کے واسطے لکھا ہے :
''مار را چنداں قطرہ قطرہ کرد ۔'' (صفحہ ۱۷۸ ، ۲۰۲ ، ۲۲۳) ۔

ایک اور ہندی ضرب المثل جس کا مفہوم ہے 'ٹوٹی رسی جوڑ لی گرہ تو باقی رہی' مصنف نے اس طرح بیان کی ہے : 'اگر رسن شکستہ شود کسے پیوند کند ، گرہ از میان نرود ۔'' (صفحہ ۱۲۹)

تاج الدین مفتی الملکی کی اس فارسی استعداد پر میں جانتا ہوں

کہ فارسی خواں ناک بھوں چڑھائیں گے، لیکن یہ اغلاط صرفی یا نحوی تو ھیں نہیں بلکہ روزمرہ اور محاورے سے تعلق رکھتی ھیں اور ظاھر ھے کہ ایک شخص جو عمر بھر ھندی بولتا رھا ھے اور اٹھتے بیٹھتے اسی میں سوچتا اور فکر کرتا ھے، فارسی لکھتے وقت اس کی اپنی زبان کے محاوروں اور طرز بیان کا قلم سے مترشح ھونا ایک قدرتی بات ھے۔ فارسی میں اگرچہ اس تالیف کو کوئی رتبہ نہیں دیا جا سکتا؛ اس کے اکثر جملے اور فقرے اھل زبان کے نزدیک مہمل ھیں؛ مثلاً 'افیون فرود آمدن' اور 'ھر دو دست خویش برگوش نہادن' ان کی نگاہ میں بالکل بے معنی ھیں، مگر ادھر ایک اردو خواں ان سب محاوروں کو سمجھتا ھے، کیوں کہ وہ رات دن ان کو بولتا اور سنتا رھتا ھے، اس لیے اردو کی قدامت کے متلاشی کے لیے یہ کتاب نہایت بیش قیمت ھے، کیوں کہ اس کے ذریعے سے ھمیں اس عہد کی اردو زبان کا کسی قدر اندازہ ھو سکتا ھے۔ ھم دیکھتے ھیں کہ اردو ان ایام میں محاوروں، روزمروں اور ضرب الامثال سے مالامال ھے اور یہ خصوصیات ایک زبان میں اسی وقت پیدا ھوں گی جب کہ وہ عہد طفولیت کو خیر باد کہہ کر مدارج شعوری تک ارتقا کر چکی ھو اور ایک حالت پر قائم ھو گئی ھو۔ مفرح القلوب بہ ظاھر حالات بہار میں لکھی گئی ھے، اس سے ظاھر ھے کہ اردو اس عہد میں دور دور تک پھیل چکی تھی۔

شمس سراج عفیف اور ضیاء برنی فارسی میں اعلیٰ قابلیت کے مالک ھیں۔ اس زبان کے ساتھ ان کی مزاولت بہ منزلۂ طبیعت ثانیہ کے ھے اور امیر خسرو کو تو خود اھل زبان تسلیم کر چکے ھیں اساتذہ کی صف اول میں ان کا شمار ھوتا ھے؛ تاھم دیکھا جاتا ھے کہ اردو کا اثر ان بزرگوں کی تالیفات میں نمایاں ھے۔ 'ناک میں دم آنا'، 'چراغ لے کر ڈھونڈنا'، 'خالہ کا گھر'، 'ھاتھیوں کے ساتھ گنے کھانا'، 'سب کو ایک لاٹھی ھانکنا' 'بیڑہ اٹھانا'، اور 'ان تلوں میں تیل نہیں' وغیرہ کے استعمال سے ثابت ھوتا ھے کہ یہ بزرگ اس زبان سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔

امیر خسرو کے بعض اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس زبان سے بہت محبت تھی ؛ 'قران السعدین' میں فرماتے ہیں : ع

طرفہ بود تیری ہندی زبان (صفحہ ۵۰)

اور غرۃ الکمال' کے دیباچے میں : ع

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

الغرض وثوق کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں مسلمان جماعت کی زبان قطعاً بدل چکی تھی اور وہ اپنے گھروں میں ہندی (اردو) بول رہے تھے ۔ اس زبان کا اقتدار اس حد تک قائم ہوچکا تھا کہ عوام‌الناس درکنار امرا و شرفا تک کے نام و عرف ہندی ہونے لگے تھے ۔ ملک چھجوا ، ملک جونا ، ملک ہرن مار ، ملک بھٹا ، ملک فخرالدین کھنڈ ، ملک رکن‌الدین انبہ اس زمانے کے امرا کے نام ہیں، اور لادی ، کرنا ، اور بی‌بی رانی عورتوں کے نام ہیں ۔ ملکی عہدے اور سلاطین کے محل بھی ہندی ناموں سے پکارے جاتے تھے ۔

زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ لے کر ان کی شکل یا معنی میں تصرف کر لیا کرتی ہیں ، چناں چہ اردو نے بھی ایسا ہی کیا ہے ۔ الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں :

غصہ (بہ معنی خشم و غضب) ، مال (نفیس کھانا) ، حرکت (فریب ، دم ، جھانسہ) ، متحرک (چالباز ، دم‌باز) ،خوشی (مرضی اور

---

۱ ۔ ہندوستان میں دستور ہے کہ جب کسی خاندان میں اولاد نرینہ نہیں رہتی اور پے در پے بچے ضائع ہو جاتے ہیں تو والدین اپنے نوزائیدہ بچے کو چھاج یا ٹوکری میں رکھوا کر مسجد میں بھجوا دیتے ہیں جہاں اسے صحن مسجد میں گھسیٹا جاتا ہے ۔ ایسے مولود کا نام گھسیٹا ، گھسا ، مسیتا وغیرہ رکھ دیا جاتا ہے ۔ چھجو بھی اسی قسم کا نام ہے ۔ اس سے مراد ایسا مولود ہے جسے چھاج میں ڈال کر گھسیٹا گیا ہو ۔

منشا) ، عورت (بیوی) ، کاھل (بزدل و ترساں) ، خوش (شاد و خرم) ، مرانبہ (مرتبہ) ، دائرہ (حیمہ) ، ڈیرہ (خیمہ) ۔

دھنگانہ	بجائے	دانگانہ	،	دشمنایگی	بجائے	دشمنی
دانایگی	,,	دانائی	،	روزینہ	,,	روزانہ
سالینہ	,,	سالانہ	،	شبینہ	,,	شبانہ
غروری	,,	غرور	،	نموداری	,,	نمود
ڈفالی یا فدالی	,,	دفالی	،	پلیتہ	,,	فلیتہ
صفیل	,,	فصیل	،	نغارا یا نگارا	,,	نقارہ
چنندہ	,,	چیدہ یا چنیدہ	،	ذرا	,,	ذرہ
اور عیبانہ	,,	غائبانہ				

یہ الفاظ اب سے پانسو چھ سو سال پیشتر اسی غلط انداز میں بولے جا رہے تھے جیسے آج بولے جاتے ھیں ۔ یہ واقعہ ان ایام میں اردو کی ایک حالت پر قائم ھو جانے کا بین ثبوت ھے ۔

یہاں ناظرین کی توجہ ان بعض الفاظ کی طرف بھی منعطف کرائی جاتی ھے جو امیر خسرو اور صبا بری کے ھاں پنجابی لہجے میں لکھے ھوئے ملتے ھیں ۔ مسلمانوں کو ھندوستان میں سب سے پیشتر دس زبانوں سے سابقہ پڑا ھے : سندھ میں سندھی سے ، پنجاب میں پنجابی سے اور دھلی میں دھلی کے علاقے کی زبان سے ۔ اردو پر سندھی کا اثر مطلق[1] نہیں ۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ زبان اس وقت تک وجود ھی میں نہ آئی تھی ۔ غزنوی دور میں مسلمان پنجاب کے مختلف

۱۔ فاضل مصنف کی رائے محل تامل ھے ۔ اردو پر سندھی کا لسانی اثر، خواہ کتنا ھی خفیف کیوں نہ ھو ، موجود ضرور ھے ۔ اردو میں بعض ایسے الفاظ مستعمل ھیں جن کے بنیادی لفظ سندھی کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتے ۔ مثال کے طور پر گنتی میں بارہ ، بیس ، بائیس ، بتیس ، بیالیس ، باون ، باسٹھ ، بہتر ، بیاسی ، بانوے میں سابقہ 'با' یا 'ب' اردو کے 'دو' سے ، جو فارسی سے مستعار ھے ، کوئی تعلق نہیں رکھتا ، لیکن سندھی میں 'دو' کے لیے (باقی حاشیہ صفحہ ۹۸ پر)

شہروں میں آباد ہو جاتے ہیں اور تقریباً دو سو برس تک یہاں مقیم رہے ہیں ۔ اس کے بعد معزالدین محمد بن سام (۶۰۲ھ) اور قطب الدین ایبک (۶۰۷ھ) اپنی متواتر فتوحات سے ہندوستان خاص فتح کر لیے ہیں اور شہر دہلی جدید مفتوحہ ملک کا دارالسلطنت بن جاتا ہے ۔ اس واقعے سے ایک صدی بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی کے یہ آبادکار جو شمال سے آٹھ کر آئے تھے، اپنی گفتگو میں بہت سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جو خاص پنجاب کے لہجے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں ان الفاظ کی فہرست حوالۂ قلم کروں، مجھ کو ایک قاعدۂ کلیہ بیان کر دینا چاہیے جو پنجابی اور ہندوستانی الفاظ کی شناخت کی تعیین کرتا ہے ۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ پنجاب میں ایسے الفاظ جن میں ہندوستان کی زبان میں ثانی حرف علت واقع ہو، ان کے حرف علت کو اس کے مناسب اعراب سے بدل کر حرف مابعد کو مشدد کر دیتے ہیں، مثلاً ماکھن، بھول اور کھچڑی پنجابی لہجے میں مکھن، بھُل اور کھچڑی بن جاتے ہیں ۔ اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب ہم امیر خسرو اور ضیاء برنی کی فہرست الفاظ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو متعدد پنجابی الفاظ ہماری نگاہ سے گزرتے ہیں، مثلاً بگ، لک، بھگ، گھٹی، کھنڈ، بھنڈ، انبہ، بھنڈائی، جموں، مٹھ، بلسٹ، منگا، لدھا، مگ؛ کھپ، دل، ٹٹ ۔ ان پر دو اور پنجابی لفظوں کا اضافہ کیا جاتا ہے یعنی تلونڈی اور دھنڈ ۔ آٹھویں صدی کے اختتام تک یہ الفاظ دہلی اور اس کے علاقے میں پنجابی لہجے میں بولے جاتے رہے، بعد میں اس

(صفحہ ۹۷ کا باقی حاشیہ) لفظ 'یہ' آج بھی مستعمل ہے ۔ کم از کم ملتانی، پنجابی اور اردو کی حد تک اسے سندھی اثر کہا جا سکتا ہے ۔ اردو کا ایک لفظ 'پڑوسی' یعنی محلے دار ہے، اس کا بنیادی لفظ 'پاڑا' بہ معنی 'محلہ' سندھی میں موجود ہے ۔ اردو میں 'پاڑا' ترکیبی حالت میں محلوں کے ناموں کے لیے بھی کام آتا رہا ہے، مثلاً 'گھوسی پاڑا' یعنی گوجروں کا محلہ وغیرہ ۔ (مرتب) ۔

علاقے کی زبان کے اثرات میں مقامی لہجہ غالب آ گیا ؛ چناں چہ اب پاگ ، لاکھ ، بھنگ ، گھاٹی ، کھانڈ ، بھانڈ ، آم ، بھنڈیتی ، جامون ، ماٹ ، بالشت ، مانگا (مانگیا) ، لادھا (لادھیا) ، مونگ ، کھاٹ ، ٹال اور ٹاٹ بولے ھیں ۔ 'ملونڈی' اور 'دھنڈ' اردو کے دائرے سے بالکل خارج ھو چکے ھیں ، اگرچہ پنجاب میں آج بھی بولے جاتے ھیں ۔ اس سے خیال ھوتا ھے کہ مسلمان دھلی میں آباد ھونے وقت کوئی نہ کوئی زبان پنجاب سے اپنے ساتھ لے کر گیے ھیں ، جو دھلی کی زبان کے ساتھ مل کر اردو کی شکل میں ظہور پزیر ھوئی ۔ یہ احتمال کہ دھلی میں دونوں قسم کے لہجوں کا رواج تھا ، یعنی لوگ بھانڈ بولتے تھے اور بھنڈ بھی ، کھانڈ بولتے تھے اور کھنڈ بھی ، آنب بولتے تھے اور انب بھی ، واقعات معاومہ کی روشنی میں بے بنیاد ٹھہرتا ھے - امیر خسرو ، ضیأ برنی اور سید محمد کرمانی ایک ھی قسم کا لہجہ اختیار کیے ھوئے ھیں ۔ مثالاً ان کے ھاں الفاظ لک ، پگ اور کھٹ بار بار ملتے ھیں اور ھر بار اسی شکل سے لکھے جاتے ھیں ۔ لاکھ ، پاگ اور کھاٹ بھول کر بھی ان کے قلم سے نہیں نکلتے ۔

غزنوی دور میں قیام پنجاب کے وقت مسلمانوں کا پنجابی زبان سے تعلق میں آنا ایک لازمی امر ھے ۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کو ھندی کا پہلا صاحب دیوان مانا جاتا ھے ۔ یہ امر ظاھر ھے کہ اس ھندی سے مراد پنجابی زبان ھے ، لیکن خواجہ مسعود سے ایک عرصہ قبل خود سلطان محمود غزنوی کے عہد میں پنجابی سے مسلمانوں کا رابطہ قائم ھو جاتا ھے ۔ البیرونی کی 'کتاب الہند' میں جہاں سنسکرت اور سندھی کے الفاظ ملتے ھیں وھاں پنجابی الفاظ کا ذخیرہ بھی نظر آتا ھے ۔ بیرونی کا سب سے زیادہ قیام ملتان میں رھا ھے ۔ کتاب الہند ۴۲۳ھ کی تالیف ھے ۔ میں یہاں اس کتاب سے صرف چند الفاظ پر قناعت کرتا ھوں ۔ میرے زیر نظر پروفیسر سخاؤ کا مرتبہ اڈیشن ھے ۔

صفحہ ۹۹ : ڈانگ ، یعنے پہاڑی علاقے کا جنگل

گندہ = گنڈا

مہکال = مہا کال

صفحہ ۱۰۰ : 'براموِلا' - بارہ مولا ، کسمیر کے راسے میں ایک قصبے کا نام

صفحہ ۱۰۳ مگر — آبی جانور

برشکال == برسات

صفحہ ۱۰۴ : ہفتے کے نام :

آدب بار ، سوم دار ، مںگل بار ، بدبار ، برھسپب بار ، شکر بار ، شنیسُچر بار -

صفحہ ۱۰ : مںلچ ، ملمجھ

صفحہ ۴۴ : بھوب ، پریب ، ناگ

صفحہ ۴۶ : (ڈ) ھاڈی ، ڈوم ، چنڈال

صفحہ ۶۷ : پربب

صفحہ ۸۶ : سورن ، تولہ . ماسہ ، اندی ، جو ، کل

صفحہ ۷۸ : دلہ (ترازو)

صفحہ ۷۹ : آنگل ، ھب (ھادھ)

صفحہ ۸۱ : ناڑی ، بھوج ، پوتی (پوتھی)

صفحہ ۸۹ : کسارہ (کٹار) ، جنجوا (جنیؤ)

صفحہ ۹۳ : تالک وساین

صفحہ ۹۴ : نھوھر

صفحہ ۹۸ : بنارسی (بنارس) ، منگیری (مںگیر)

صفحہ ۱۱۷ : لون ، پانی

صفحہ ۱۳۰ : پنج ند ، سند ساگر

صفحہ ۱۵۷ : کوب (کوٹ = قلعہ)

صفحہ ۱۵۹ : لونگ

صفحہ ۱۷۱ : گھڑی

صفحہ ۲۸۷ : زاتر (جاترا)

صفحہ ۲۸۸ بسنت ، ہریالی

صفحہ ۲۸۹ دیبالی (ذوالی)

ان صورت حالات میں یہ قیاس کہ مسلمان پنجاب سے ہندوستان جاتے وقت کوئی زبان اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ، بہت کچھ قابل قبول معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم ایک صدی کے گزر جانے کے بعد بھی اس زبان کے آثار امیر خسرو اور ضیاً برنی کے ہاں موجود پاتے ہیں ۔

فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر

یہ مقالہ مؤلف نے ۱۹۲۸ء کی آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ لاہور کے شعبۂ اردو میں زیر صدارت نواب صدر یار جنگ پڑھا تھا؛ بعد ازاں دو قسطوں میں رسالہ 'معارف' بابت مارچ و اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا (مرتب)

ہندوستان میں فرہنگ نویسی کا سلسلہ علاؤ الدین خلجی (۶۹۵ھ و ۷۱۵ھ) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مشہور شاعر مولانا فخرالدین قواس غزنوی اس فن کی بنیاد ڈالتے ہیں اور ان کا فرہنگ نامہ اس ملک کا پہلا نمبر نورس شمار ہوتا ہے۔ یہ تالیف اگرچہ حجم میں نہایت مختصر ہے اور ایک رسالے سے زیادہ بڑی نہیں لیکن اس کے معتبر اور مستند ہونے میں کوئی شک نہیں، کیوں کہ عہد اکبری سے قبل تک اکثر و بیشتر فرہنگوں کا ماخذ رہی ہے، خصوصاً 'شاہ نامہ' کے لغات کے لیے۔ فرہنگ نامے کے بعد دوسرا نمبر 'دستور الافاضل' مؤلفہ رفیع حاجب حیرات کا آتا ہے جو ۷۴۳ھ میں بہ عہد فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ) تالیف ہوئی۔ اس کے بعد قاضی بدر الدین دہلوی المعروف بدھاروال کی فرہنگ 'اداب الفضلا' تصنیف ۸۲۲ھ قابل ذکر ہے۔ چوتھا نمبر کتاب 'بحرالفضائل' کا ہے جس کا ایک مختصر تبصرہ ہمارے مضمون کا موضوع ہے۔

یہ لغت نگار اور ان کے اکثر متبعین اپنی فرہنگوں میں فارسی الفاظ کی شرح کے وقت بعض اوقات ان کے ہندی مرادفات بھی بیان کر دیا کرتے ہیں - ایسے الفاظ کا ذخیرہ کم و بیش ہر فرہنگ میں موجود ہے - اگرچہ یہ مصنف ہندوستان کے مختلف صوبوں سے علاقہ رکھتے ہیں جہاں مختلف بولیاں اور بھاکائیں مروج ہیں ؛ کوئی بنگالے کا باشندہ ہے ، کوئی مالوے کا ، کوئی دہلی کا ہے تو کوئی کڑے کا ، اور ان میں سے ہر ایک مصنف کا اپنے اپنے وطن کی زبان سے واقف ہونا بھی لازمی ہے - مگر دیکھا جاتا ہے کہ ہندی الفاظ لکھتے وقت وہ مقامی زبانوں سے قطع نظر کر کے صرف اس خاص زبان کے الفاظ درج کرتے ہیں جو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی - یہی وجہ ہے کہ یہ ذخیرۂ الفاظ ان کتابوں میں عام ہے -

یہ نہ تصور کرنا چاہیے کہ چوں کہ فرہنگ نویس ایک دوسرے سے نقل کرنے کے عادی ہوا کرتے ہیں اس لیے یہ الفاظ ان کی تصنیفات میں عام ہو گئے - اس عقیدے کی تردید بہت آسانی سے ہو سکتی ہے -

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ فارسی فرہنگوں میں ہندی الفاظ کی ترویج کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ ایسے مشکل اور مبہم الفاظ کی تفہیم جن کے لیے بہ حالت دیگر ایک لمبے اور دقت طلب بیان کی ضرورت محسوس ہوتی ، مختصر اور آسان طریقے پر کردی جائے - اس کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو مسلمانوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہو -

دوسرے اگر یہ ذخیرۂ الفاظ ہندوستان کے تمام صوبوں اور علاقوں میں بولا اور سمجھا نہ جاتا تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بنگالے کا فرہنگ نویس مالوے کے فرہنگ نویس سے اپنی تصنیف میں نقل کرتا اور بعد میں اس سے ایک اور مصنف جو دہلی یا پنجاب کا متوطن ہے ، انہیں بہ جنسہ اپنی فرہنگ میں نقل کرتا

جس سے نہ خود وہ اور نہ اس کے فارسی واقف تھے ۔ علاوہ بریں یہ تمام الفاظ ان فرہنگوں میں مشترک نہیں ہیں جیسا کہ ایک دوسرے سے نقل لینے کی صورت میں ان کو ہونا چاہیے تھا ۔ بلکہ ان میں لہجے کا اختلاف بھی موجود ہے جو بہ ظاہر زیادہ تر مقامی اور عصری اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ۔

مثلاً فارسی لفظ 'آفتاب پرست' کا ہندی مرادف 'اداب الفضلا' اور بحرالفضائل میں 'گھرگھٹ' بیان کیا گیا ہے ، مگر 'شرفنامۂ ابراہیم فاروقی ، میں 'گھراگھٹ' مرقوم ہے ۔

حقندر کے لیے ہندی لفظ ایک فرہنگ میں 'کنگلو' ہے ، دوسری میں 'کانگلو' اور تیسری میں 'کونگلو' ۔

خوربویا کا مرادف 'زفان گویا' میں 'جاہپل' ، 'ریاض الادویہ' میں 'جعفل' اور 'بحرالفضائل' میں 'جائے پھل' مرقوم ہے ۔

فرہنگ نامۂ قواس میں اطفارالطیب کے واسطے ہندی الفاظ 'نکہ' 'و مکھ' اور 'نکہ' ملتے ہیں ۔ 'زفان گویا' میں 'جھٹپہ کھر' ۔ مگر بحرالفضائل میں صرف 'نکہ' پر قناعت کی ہے ۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کا اختلاف محض نقالی کی بنا پر پیدا نہیں ہو سکتا ۔ مزید براں اس ذخیرے کا اکثر حصہ بہ جنسہ یا کسی قدر تغیر کے ساتھ آج بھی اردو زبان میں مستعمل ہے ۔

ان دلائل سے ایک ہی صحیح نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اس عام مشترکہ زبان سے تعلق رکھتے ہیں جس کو ہی زمانتا اردو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ الفاظ جو آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فرہنگوں میں ملتے ہیں ، اردو زبان کا سب سے قدیم سرمایہ ہیں ۔

اس موقع پر کتاب 'بحرالفضائل' کے عہد تالیف اور اس کے مصنف کے متعلق چند الفاظ بیان کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں ۔

ان کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۂ البلخي

المعروف به کریی ہے ۔ ان کی ایک اور تصنیف کتاب جواهرالمعادن ہے جو فنون بدیع و بیان و عروض پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ معلومہ کتب خانوں میں موجود نہیں ہے ۔ لیکن جس تالیف نے ان کی شہرت کو ہمارے عہد تک زندہ رکھا ہے ، وہ ان کی 'شرح مخزن اسرار نظامی' ہے ۔ فی‌الحقیقت یہ ایک عالمانہ کتاب ہے جس میں دو ہزار سے زاید ابیات کی تشریح نہایت کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے ۔ یہ شرح آیات کلام پاک ، احادیث نبوی اورکلام شعرا سے قدم قدم پر مزین ہے اور اب تک بالعموم مخزن کی سب سے بہتر شرح مانی گئی ہے اور برابر استعمال میں آ رہی ہے ۔ اسی لیےاس کے قلمی نسخے بھی کثرت سے دست یاب ہوتے ہیں ۔ یہ کتاب اگرچہ ہر زمانے میں مقبول رہی ہے تاہم دیکھا جاتا ہے کہ یورپ اور ہندوستان میں اس کے عہد تصنیف اور اس کے مصنف کے متعلق غلط فہمیاں موجود ہیں جن پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے ۔

شرح مخزن اسرار

یورپ میں شرح مخزن اسرار کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری مانا گیا ہے ۔ اسپرنگر فہرست کتاب خانۂ اودھ میں (صفحہ ۵۲۱) اس کے ذکر میں لکھتے ہیں :

''اس کتاب کے خاتمے پر اس کا سال تاریخ جب یہ کتاب تصنیف ہوئی تھی ، بہ حساب جمل درج ہے ، یعنی ۱۰۹۱ھ :

بفکر اندر شدم از بهر تاریخ
دلم گفتا ''زہے شرح گلستاں''

ادھر ریو برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات فارسی میں (صفحہ ۵۷۳) اسی شرح کے ایک اور نسخے کے ذکر میں لکھتا ہے :

''جیسا کہ فہرست کتب خانۂ اودھ میں (صفحہ ۵۲۱ پر) مذکور ہے ، زمانۂ تصنیف ایک منظوم تاریخ سے جس میں مادۂ تاریخ ''زہے شرح گلستاں'' مطابق ۱۰۹۱ھ ہے ، برآمد ہوتا ہے :

نسخۂ هذا ایک پرانی اشاعت کا حامل ہے کیوں کہ پہلے صفحے پر
اس کی تاریخ خرید ۱۰۸۹ھ مندرج ہے۔"

ڈاکٹر ایتھے انڈیا آفس کے مخطوطات فارسی کی فہرست میں
اسی شرح کے ایک اور نسخے نمبر ۹۹۸ کے ذیل میں لکھتے ہیں :

"لیکن ریو کے نسخے سے جس میں ۱۰۸۹ھ مطابق ۱۶۷۸ء تاریخ خرید
مذکور ہے ، ثابت ہوتا ہے کہ اس شرح کی ایسی اشاعت جو کسی
قدر اقدم بھی ہے ، موجود ہے۔"

اسی فہرست کے نمبر ۲۵۱۲ کے تحت ڈاکٹر موصوف بہ سلسلہ
کتاب بحرالفضائل گویا ہیں :

"اس کا مصنف محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۂ
البلخی المعروف بہ کرخی شرح مخزن اسرار کا مصنف ہے جو ۱۰۹۱ھ
میں یا اس سے کچھ سال قبل تصنیف ہوئی ہے۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مادۂ تاریخ جو مغربی فضلا نے
بلخی کی شرح مخزن اسرار کی طرف منسوب کیا ہے ، در حقیقت کسی
نامعلوم شرح گلستان سعدی کے لیے نکالا گیا ہے۔ میں اپنے سامعین کی
توجہ اس مصرے 'زہے شرح گلستاں' اور اس کے معنوں کی طرف مبذول
کرنے کا مستدعی ہوں ، کیوں کہ فارسی زبان میں اس کی ترجمانی
صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ گلستان کی کیا ہی
عمدہ شرح ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معنی نکلنے بھی نہیں ؛ اس لیے
ناممکن ہے کہ کوئی سمجھ دار انسان ایسا مصرہ نظامی کی شرح مخزن اسرار
کے سال تاریخ کے لیے لکھے۔ یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کے مغربی
اہل قلم آسانی سے شکار ہو سکتے ہیں۔

ادھر ہندوستان میں اسی شرح کے سلسلے میں ایک نہایت ہی
عجیب مذاق کیا گیا ہے۔ میرے پیش نظر "ظہور الاسرار در شرح مخزن
اسرار" اشاعت دوم طبع نولکشور ۱۸۸۸ء ہے۔ حالاں کہ یہ
شرح فی الحقیقت بلخی کی ملک ہے لیکن نولکشور نے کسی شخص
ظہورالحسن بن محمد کلیم اللہ بن عظمت اللہ بٹھوری کو جو سید ابوالحسن

عریضی حسنی و حسینی کی اولاد سے ہیں ، اس کا مصنف ظاہر کیا ہے ۔ یہ کون بزرگ ہیں ، میں نہیں جانتا ، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ادبی رہزنی کی تاریخ میں یہ ایک دلیرانہ مثال ہے ۔

کارکنان مطبع نے خاتمے میں کسی قدر عقدہ کشائی کی کوشش کی ہے ۔ ان کا بیان ہے کہ :

''اس کتاب کا قلمی نسخہ جو ہمیں نورالحسن صاحب رئیس ذرب پور نے بہ غرض طباعت ارسال کیا تھا ، صریحاً پرانا معلوم ہوتا تھا ، لیکن کتاب کی وہ عبارت جس میں مصنف کا نام درج تھا ، مٹائی جا کر اس کی بجائے طہورالحسن کا نام لکھ دیا گیا تھا ۔ ہم نے اصل مصنف کے نام کی تحقیق کے خیال سے اس کے اور نسخوں کی تلاش کی لیکن بد قسمتی سے ہماری کوشش بار آور نہیں ہوئی ۔ اس لیے مجبوراً ہم نے اس کو طہورالحسن ہی کے نام پر شائع کر دیا ۔''

جب اس شرح کے صفحات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس زمانے سے جو اسپرنگر اور اس کے مقلدین نے اس کی طرف منسوب کیا ہے ، بہت اقدم ہے ۔ شرح میں اکثر ایسے شعرا کے اشعار نقل ہوئے ہیں جو آٹھویں صدی ہجری کے اختتام سے قبل ہو گزرے ہیں ۔ حتی کہ مصنف خواجہ حافظ کی شہرت سے بھی قطعاً ناواقف معلوم ہوتا ہے ۔ چناں چہ خواجہ کا نام اس کی شرح میں کہیں نظر نہیں آتا ۔ اس کے ہاں حکیم سنائی ، خاقانی شروانی ، حکیم انوری ، سوزنی ، عبدالواسع جبلی ، رشید وطواط ، ظہیر فاریابی اور شیخ سعدی کے نام ملتے ہیں اور سعدی کو مشرف الدین کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو حقیقت میں ان کا صحیح نام ہے ۔ بعد میں آنے والی صدیوں میں شیخ کا اصلی نام فراموش ہو جاتا ہے اور ان کے والد کے نام پر بالعموم مصلح الدین مشہور ہو جاتے ہیں ۔ چوں کہ مصنف شیخ کے اصلی نام سے واقف ہے ، اس سے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق ایسے قریب زمانے سے ہے جب کہ ہندوستان میں بھی لوگ شیخ کے صحیح نام سے اطلاع رکھتے تھے ۔ یہ امر گیارھویں صدی ہجری میں ناممکن ہے

جب کہ سعدی ہندوستان میں بلا استثنا مصلح الدین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

شرح میں ذیل کے ہندوستانی شعرا کے ابیات منقول ہیں :

۱ - مسعود سعد سلمان ۲ - تاج الدین دبیر ریزہ یا سنگریزہ
۳ - عمید تولکی ۔ ۴ - امیر خسرو ترک اللہ
۵ - امیر حسن سجزی ۶ - قیصر سجزی
۷ - مولانا تہا کاری ۸ - مولانا جمال الدین آساجی
۹ - مولانا حمید قلندر ۱۰ - مولانا فخر الدین
۱۱ - ابوبکر سعی ۱۲ - امیر نجم الدین حسن سحری
۱۳ - مولانا مغیث الدین ہانسوی ۱۴ - عبید سحم

اب یہ ہندوستانی شعراء جن میں سے بعض کے نام ہم پہلی مرتبہ سنتے ہیں ، ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ نویں صدی ہجری سے بہت قبل گزرے ہیں ۔ اگر مصنف کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری ہوتا تو ضروری تھا کہ وہ نویں اور دسویں قرن ہجری کے شعراء کو بھی اپنی شرح میں داخل کرتا ۔

لیکن اس شرح کا سال تصنیف معلوم کرنے کے لیے نظامی کے شعر ذیل کی شرح میں :

کیست درین دائرہ دیر پائے
کوس لمن‌الملک زند جز خدائے

یہ عبارت ملتی ہے :

''آفرینش آسمان و زمین بر قول حکماء اصحاب ذکاوت و کفایت یک لک ہشتاد ہزار دو صد و نود و شش سال است و این در سال خمسہ و تسعین و سبع‌مائۃ من الہجرہ بود ۔''

اسی شرح میں حضرت شارح یہ عبارت لکھتے ہیں :

''بدانکہ درین وقت کہ از ہجرت پیغامبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

هفت صد و نود و پنج سال است ، از گاہ خلقت آدم تا امروز شش ہزار و ہفت صد و نود و چہار سال گزشتہ ۔''

ان عبارتوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بلخی اس شرح پر ۷۹۵ ہجری میں مصروف تھا ۔ کتاب بحرالفضائل سے ہمارے عقیدے کی اور بھی تقویت ہو جاتی ہے ۔ وہاں اس تصنیف کے چوتھے باب میں مختلف قوموں کے مروجہ سنین و تاریخ کے ذکر میں یہ عبارت مرقوم ہے :

''آغاز تاریخ ہجرت از غرۂ ماہ محرم گرفتند و دریں وقت از تاریخ ہجرت پیغامبر ہیصد سی ہفت سال است ۔''

(ہیصد ۔ ہشت صد)

جس سے واضح ہوتا ہے کہ بحر الفضائل ۸۳۷ ہجری میں تصنیف ہو رہی تھی ۔ اسی طرح بکرماجیت کے سمت کے بیان میں مذکور ہے :
''تاریخ ایشان از جلوس رائے بکرماجیت است در احس و دریں وقت از تاریخ او یک ہزار چار صد نود سال است ۔''

دونوں کتابوں کے درمیان بیالیس سال کا فرق ہے ، جس سے ہمیں یہ قیاس کرنا چاہیے کہ شرح مخزن بلخی نے اپنی عمر کے ابتدائی زمانے میں اور بحر الفضائل آخری زمانے میں لکھی ہے ۔

چند الفاظ مصنف کی وطنیت کے متعلق بھی کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں ۔ اگرچہ عام طور پر بلخی مشہور ہیں ، لیکن وہ قطعاً ہندوستانی اور ہندوستان زا ہیں ۔ ان کی دوسری نسبت میں بہت کچھ اختلاف ہے اور مختلف نسخوں میں مختلف شکل میں مرقوم ہے ۔ ریو نے ایک نسخے میں 'کرخی' لکھا ہے ، ڈاکٹر ایتھے نے نمبر ۲۵۱۲ میں 'کرخی' ، نمبر ۲۹۶۷ میں 'نکوئی' اور نمبر ۹۹۸ میں 'بکرئی' اور اسپرنگر نے (صفحہ ۵۲۱ پر) 'بکرئی' لکھا ہے ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ایک نسخے میں بھی 'بکرئی' ہے ؛ اور چوں کہ اکثر نسخوں میں 'بکرئی' ملتا ہے ، اس لیے ہمیں 'کرخی' اور 'نکوئی' سے جو بعض نسخوں میں ملتے ہیں ، اعراض کر کے بیان لینا چاہیے

که صحیح لفظ 'بکرئی' ہے اور 'کرخی' اور 'نکوئی' بھی اسی کی مسخ شدہ شکلیں ہیں - میرے نسخے میں جہاں یہ لفظ واقع ہوتا ہے عبارت یوں ہے :

"خزانه البلخی المعروف بکریی "

اور چوں کہ پورا جملہ عربی میں ہے ، اس لیے ہمیں یہ تصور نہ کرنا چاہیے کہ لفظ 'بکریی' کی 'بے' نفس کلمہ کی بے ہے ، جیسا کہ ریو اور ایتھے کا خیال ہے ، بلکہ حسب قواعد عربی بائے صلہ ماننی چاہیے - اس لیے مصنف کی نسبت 'کریئی' ہے نہ 'بکریئی' اور اس کے وطن کا نام 'کرا' بلکہ 'کڑہ' ہے -

کڑہ دریائے گنگا پر الہٰ آباد سے ۴۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے - آج کل ایک موضع سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ، اور تحصیل سرادھو میں واقع ہے ، لیکن قدیم زمانے میں وہ ایک آباد اور حاکم نشین شہر تھا اور کئی اہم تاریخی واقعات کا مرکز - کیقباد اور اس کے باپ نصیر الدین بغرا خاں کے درمیان یہیں ملاقات ہوتی ہے - اس کا ذکر امیر خسرو نے اپنی مثنوی 'قران السعدین' میں کیا ہے - جلال الدین فیروز شاہ خلجی علاؤالدین کی سازش کا شکار اسی کڑہ کے سامنے ہوتا ہے - کڑہ کے علما و فضلا کے نام بہت کم سننے میں آئے ہیں - ظن غالب ہے کہ ہمارا مصنف اسی شہر کا متوطن ہو اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ کسی ایسے مقام کا باشندہ ہے جو سلطنت دھلی کے تابع ہے کیوں کہ بحرالفضائل میں جو باب هندی اوزان و دینار و درهم پر ملتا ہے اور جس میں مکہ معظمہ کے اوزان کا دھلی کے اوزان سے مقابلہ کیا گیا ہے ، وہاں مصنف دھلی کو آنند یار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے[1] -

---

۱ - اس کے علاوہ کری احمد آباد کے قریب ایک قصبے کا نام بھی ہے جو سلاطین گجرات کے عہد میں بہت مشہور تھا - 'مرأت سکندری' 'آئین اکبری' 'فرشتہ' اور 'طبقات اکبری' میں اس کا ذکر آتا ہے۔ تاریخ فیروز شاھی میں (صفحہ ۵۱۸) (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۱)

بلخی کے سوانح حیات کے متعلق ہم کو کوئی علم نہیں ، صرف اسی قدر اطلاع ہے کہ وہ شاعر بھی تھا اور عالم بھی - شرح مخزن اسرار کے ایک قلمی نسخے میں جو ۱۰۱۱ء کا نوشتہ ہے ، ان کو ملک السعرا فضل الدین محمد بلخی کے نام سے یاد کیا گیا ہے ؛ جس سے ظاہر ہے کہ اکبری عہد میں دنیا ان کے متعلق زیادہ معلومات رکھتی تھی - اسپرنگر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل الدین محمد نے سکندر نامے کے دونوں حصوں پر حواشی بھی لکھے ہیں - مختصر یہ کہ انھوں نے شادی آبادی شارح خاقانی و انوری کی طرح ایک استاد ، شارح اور فرہنگ نگار کی زندگی بسر کی ہے -

بعض موقعوں پر مولانا فضل الدین کی تصنیفات میں ہم کو جدید اطلاع بھی مل جاتی ہے ، مثلاً دھلی کے سب سے پہلے شاعر تاج الدین دبیر یا ریزہ کے متعلق جو شمس الدین التمش ، رکن الدین فیروز اور سلطانہ رضیہ کے عہد کا شاعر ہے ، معلومہ ذرائع (ہفت اقالم) سے صرف اسی قدر علم ہے کہ وہ نہایت پست قامت تھا ، اس لیے اس کو ریزہ کہتے تھے - (مولانا جمالی 'سیرالعارفین' میں اس کو سنگریزہ لکھتے ہیں) اس شاعر کے بعض قصیدے اتفاق سے قصائد انوری مطبوعہ نولکشور میں کسی غلطی کی بنا پر داخل ہو گئے ہیں - بلخی ایک موقع پر اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ :

''تاج ریزہ را بپائے فیل اندا ختند -''

گویا یہ عبرتناک انجام ہوتا ہے دھلی کے اس شاعر کا جو اپنی

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۰) اس کو ایک جگہ کڑہ لکھا ہے اور دوسرے مقام پر کڑہ تی ، لیکن صحیح نام کری ہے - اب کری سے 'کریی' نسبت آسانی کے ساتھ بن جاتی ہے اور ظن غالب ہے کہ مصنف اسی کڑی کی طرف منسوب ہے - کڑی قصبہ ہونے کے علاوہ پرگنہ بھی تھا - (صفحہ ۳۲۸ ، ۳۳۴ ، ۳۵۰ ، مرأت سکندری) -

ھندی نژادی پر شعر ذیل میں فخر کرتا ھے :

مولــد و منشا مــمن در خــاکــ ھندوستــان مرا
نــظم و ســحرم بیں کــه با آب خــراسان آمــد است

اسی طرح عبید منجم کے واسطے جو غیاث الدین تغلق (۷۲۴ھ و ۷۲۸ھ) کے عہد کا شاعر ھے ، لکھا ھے کہ اس کو مولی ملی تھی ۔ چناں چه تاریخ فیروز شاھی ضیأ برنی بھی اس کی مؤید ھے ۔

بلخی کے ھاں ایک اور جدید اطلاع یہ ھے کہ فارسی لفظ خرگاہ به معنی خیمۂ بزرگ سلطان محمد بن تغلق (۷۲۸ھ و ۷۵۳ھ) کو اس کی ترکیب کی بنا پر جس سے ذم کا پہلو بھی مترشح تھا ، ناپسند تھا ؛ اس لیے اس نے 'خر گاہ' کو 'حرم گاہ' کی شکل میں بدل دیا ۔ چناں چه دھلی اور اس کے اطراف میں حرم گاہ بولتے ھیں ؛ تائید میں یہ فقرہ ملاحظه ھو :

''برایں نوع آگاھی داد تا خواجۂ جہاں را دریں حوڈول سوار کنند و بحرم گاہ۱ برند ۔''

(صفحه ۱۷ ، تاریخ فیروز شاھی، شمس سراج عفیف)

---

۱ ۔ لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ھے کہ امیر حسن سجزی دھلوی کے نسخۂ 'فوائدالفواد' میں جو یقیناً ۷۲۴ھ سے قبل کی تصنیف ھے ، لفظ 'حرم گاہ' موجود ھے ، مثلاً ''آنزماں سلطان در حرم گاہ نشسته بود ۔ سید نورالدین مبارک علیه الرحمه نزدیک تیر یک جانب خورمگاھی نشسته بود ۔'' (صفحه ۲۳۸)

''و ھردو بیرون خورم گاہ بودند'' . . . .
''و دروں حورمگاہ برد'' (صفحه ۲۳۹)

('فوائدالفواد' ، فخرالمطابع ۱۲۷۲ھ)

اس سے ظاھر ھے کہ یہ اصطلاح محمد بن تغلق کے عہد سے قدیم ھے ؛ اگرچه اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ ھندوستان میں وضع ھوا ھے ۔ (مندرجه بالا نوٹ شائع شدہ مضمون کے حاشیے پر حافظ صاحب مرحوم کے قلم سے لکھا ھوا ھے ۔ (مرتب)

اس کے علاوہ مولانا کی تصنیف میں ایسے ہندی شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جو اور ذرائع سے ہم تک نہیں پہنچے، مثلاً امیر قیصر سجزی، جمال الدین اساجی اور ابوبکر نسعی وغیرہ۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحرالفضائل پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

بحر الفضائل

یہ کتاب جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، ۸۳۷ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور عربی و فارسی لغات کی ایک فرہنگ ہے جو دو قسموں پر منقسم ہے؛ پہلی قسم لغات پر مشتمل ہے جو بترتیب وار درج ہیں، دوسری قسم میں مختلف اور غیر متعلق مگر مفید مضامین ہیں جو عام معلومات پر مبنی ہیں۔ مآخذ کے لیے کتب ذیل شمار ہونی چاہئیں:

لغت فرس اسدی، زفان گویا، لسان الشعرا، النفیس، فرہنگ نامۂ شیخ زادہ عاشق (تاجی، صحاح، مغرب)، مقدمۂ جاراللہ زمخشری، اسامی، تہذیب المصادر، مستخلص قرآن؛ نیز رودکی، عنصری، عمعق بخاری، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی اور امیر خسرو دھلوی کے دواوین و کلیات سے بھی امداد لی ہے۔ فہرست مضامین حسب ذیل ہے جو خود مصنف کے الفاظ میں درج ہے:

قسم اول: در لغات اهل فضل و اصطلاحات ایشان به ترتیب حروف تہجی، و دریں قسم بیست هشت باب است۔

قسم دوم: در ابواب متفرقه و دریں قسم چہارده باب و سی هفت فصل است۔

باب اول: در آسامی بعضے از اهل و اولاد و عمال و غزوات و اسباق و اسباب پیغامبر صلی الله علیه وسلم۔

باب دوم: در الفاظ ادوات و غیرآن و دریں باب دو فصل است:

فصلِ اول در اعداد، فصل دوم در تنوین۔

باب سوم : در کنیت ها و دریں باب چهار فصل است :

فصل اول در 'اب' ، فصل دوم در 'ام' ، فصل سوم در 'ابن' ، فصل چهارم در 'بنت' ۔

باب چهارم : در آسامی ماهها و ایام هر ملت و دریں باب هفت فصل است :

فصل اول در ماهہاء عرب ، فصل دوم در ماهہاء روم ، فصل سوم در ماهہاء فارس ، فصل چہارم در ماهہاء یہود ، فصل پنجم در ماهہاء حمریه ، فصل ششم در ماهہاء هند ، فصل هفتم در آسامی روزها که هفت روز است ۔

باب پنجم : در آسامی کواکب سیاره و ثابته و دریں باب سه تا فصل است ۔

فصل اول در بروج و منازل قمر است ، فصل دوم در کواکب سیاره و عقدتین و کید ، فصل سوم در کواکب ثابته ۔

باب ششم : در اقلیم ها و آسامی بعضے شهرها مشهوره ۔

باب هفتم : در جمله آدمیان ۔

باب هشتم : در وزن درم و دینار و قیراط و صاع و رطل و من و جز آن ۔

باب نهم : در الفاظ دو معنی که فضلا را بکار آید و صنعتها ۔ دریں باب شش فصل است :

فصل اول در الفاظ دومعنی ، فصل دوم در مثلث ، فصل سوم در مثنی ، فصل چهارم در اضداد ، فصل پنجم در تجنیس و تصحیف ، فصل ششم در مقلوب و معکوس ۔

باب دهم : در الفاظ متناسب از هر نوع و دریں باب نه فصل است بدیں تفصیل :

فصل اول در آسامی بهشت و حور و قصور و حیاض و غیرآن

فصل دوم در آسامی قیامت و 'دوزخ و مناسب آن' فصل سوم در آسامی حکما و الفاظ یونانی و سریانی ، فصل چهارم در آسامی باد ها هر اجناس ، فصل پنجم در آسامی بیابان ها ، فصل ششم در آسامی بادشاهان هر بلاد ، فصل هفتم در نام طعوم یعنی مزه‌ها و مزاح آن ، فصل هشتم در نام گلها ریاحین عربی و فارسی و هندی ، فصل نهم در متفرقات۔

باب یازدهم : در آسامی مے و حار و اوانی و اسباب ۔

باب دوازدهم : در آسامی پردها و اوقات نواختن سرود و راگ ها و در آسامی مرامیر و آنچ نوازنـد و در این باب سه فصل است :

فصل اول در پردها و شعبها و وقت نواختن ، فصل دوم در راگها هندوی ، فصل سوم در مزامیر و آنچ نوازند ۔

باب سیزدهم : در آسامی هفتاد و دو ملت اهل بدعت و بعض اسباب و مقدم ایشان ، دریں باب سه فصل است :

فصل اول در آسامی هفتاد و دو ملت اهل بدعت و احوال ایشان ، فصل دوم دربیان احوال بعضے اهل ضلالت از هفتاد و دو نول ، فصل سوم در بعض اسباب و مقام و دین ها اهل بدعت ۔

باب چهاردهم : در الفاظ هندوی که در نظم بکار آید ۔

یه کتاب جیسا که اس کی فہرست مضامین سے عیاں ھے ، لغات کے سلسلے میں ایک مفید اور ضروری اضافه ھے مگر بدقسمتی سے قدیم لغت نگار بھی اس سے واقف نظر نہیں آتے اور نہ اس کے نسخے ھی زیادہ تعداد میں ملتے ھیں ۔ صرف تین نسخے معلوم ھیں : ایک کتب خانۂ آصفیه میں اور دو نسخے جن میں ایک نصف کے قریب ناقص ھے ، انڈیا آفس کے کتاب خانے میں موجود ھیں ۔ بحرالفضائل کا جو نسخه میرے پیش نظر ھے وہ نویں صدی هجری کا نوشته معلوم ھوتا ھے ، اور کوئی تعجب نہیں اگر خود مصنف کے عهد میں نقل ھوا ھو ۔ اس میں املا کی وہ تمام خصوصیات جو نویں صدی کے

منتصف اول میں رائج تھیں ، موجود ھیں ۔ اس کا فارسی خط ھندوستانی تعلیق میں مرقوم ھے اور عربی خط نسخ کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ھے جس کو بعض اوقات خط لاھوری کے نام سے یاد کیا جاتا ھے ۔ اس کا کاتب ظریف محمد بن عبداللطیف قریشی الاسدی متوطن نریاد ھے جو احمد آباد گجرات سے ۱۹ کوس کے فاصلے پر واقع ھے ۔ میاں الولک گجرات کے مشہور ولی اسی شہر میں مدفون ھیں ۔ لیکن یہ کتاب موضع ماندورا میں نقل ہوئی ھے ۔

ایک دل حسپ خصوصیت اس نسخے کی یہ ھے کہ کاتب نے بعض اوقات ھندی الفاظ میں 'گاف' اور 'ڈال' اور 'نون' ھندی کی تمیز کے لیے ان کے نیچے دو دو نقطے دیے ھیں اور 'ڑے' کی شناخت کے واسطے اس پر ایک چھوٹی 'طوئے' جیسا کہ آج کل دستور ھے ، لکھی ھے ۔ 'ہائے' ھندی کے لیے کوئی علامت نہیں ۔ بعض اور خصائص بھی ھیں ، مثلاً دوزخ کی 'رے' پر ھمیشہ دو نقطے لگائے ھیں ۔ اسی طرح سال و سین لکھتے وقت فارسی میں آحاد و عشرات و احاد کے درمیان واؤ عاطفہ لائے جانے کا دستور ھے ۔ لیکن کاتب یا مصنف اس واؤ کو حذف کر جاتا ھے اور بالکل اردو زبان کے طریقے پر لکھتا ھے ۔

سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ) کے عہد میں مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع ہوئی ھے جس کے اثرات میں ان کو ھنود کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق ھو جاتا ھے ۔ خود سلطان کے حکم سے سنسکرت کی بعض کتابیں فارسی میں ترجمہ ھوئیں ۔ ان میں 'دلائل فیروز شاھی' کا نام بہت مشہور ھے وراھمیر خلف ادتیا داس کی کتاب 'باراھی سنگھتا' کا جو فارسی میں 'باراھی' کے نام سے مشہور ھے اور تنجیم و تفاؤل سے متعلق ھے ، عبدالعزیز شمس سراج عفیف 'تاریخ فیروز شاھی' کے مصنف فارسی میں ترجمہ کرتے ھیں ۔ انھیں اثرات میں تلحی نے 'بحرالفضائل' کی قسم دوم میں وہ ابواب باندھے ھیں جو ھندو سمت، ماہ و ایام، موسیقی اور ھیئت سے متعلق ھیں ۔ لیکن یہ ابواب بہت مختصر ھیں ۔ ایک باب میں

مصنف نے جنبھو دیپ یا ھندوستان کے قدیم جغرافیے کا ذکر کیا ھے ، جو غالباً پرانوں کے بیانات پر مبنی ھے - ایک باب ایسے ھندی الفاظ کا باندھا ھے جو نظم ھندی میں کارآمد ھیں - بدقسمتی سے یہ باب نہ میرے نسخے میں ملتا ھے اور نہ انڈیا آفس کے نسخے میں -

ایک موقع پر بلخی نے ذیل کا ھندی شعر لکھا ھے :

دیکھ پیکھ پیو ہر گھر جاوے
دس نس نینو نیند نہ آوے

ایک فصل میں ھندوستان کے پھولوں کے نام ملتے ھیں جن کا ذکر یہاں خالی از دل حسپی نہیں :

(۱) انار (۲) دالا (۳) بانسہ
(۴) سری (۵) پپل - (۶) بیل -
(۷) بولسری (۸) تلسی (۹) کموڑہ
(۱۰) حنمہ (۱۱) جوھی (۱۲) دونہ
(۱۳) ویلہ (۱۴) راحنبہ (۱۵) راؤ بیل
(۱۶) بسنت (۱۷) سر کھند (۱۸) سرابھل
(۱۹) کسو (۲۰) سندوریہ (۲۱) سیوتی
(۲۲) کرنی (۲۳) کوندل (۲۴) کنیر
(۲۵) کھتن دالو (۲۶) لمو (۲۷) مالحی
(۲۸) مجلوند (۲۹) مروہ (۳۰) نرگس
(۳۱) جاسن (جاسون) (۳۲) سنگار ھار (۳۳) ناگیسر
(۳۴) گل نمروز (دوپہریہ) (۳۵) تاج خروس

ان میں سے دوتہائی ایسے ھیں جو آج بھی اردو میں مستعمل ھیں -

ھندی آلات موسیقی کے یہ نام دیے :

(۱) الاین (۲) بھیر (۳) بین
(۴) جتر (۵) دھاک (ڈھولک) (۶) دمل ، مندل (طبل)

(۷) دوبارہ کہ نٹھان بوارند (۸) دھد (۹) گھوڑی
(۱۰) سنکھ (۱۱) کمکسرہ (۱۲) کندلی
(۱۳) کنجھال

اسی سلسلے میں مبارک و نا مبارک سرود کی شناخت کے واسطے اشعار ذیل لکھے ہیں جو خود مصنف کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں :

مکس را ھرسہ گرہ باشد یمن دان
یکی اول دو گر یک لگھی دان

رگن را اول آخر گرہ بود بس
میان ھر دو سان یک لگھی بود بس

سگس را یک گرو دو لگہ بود نیز
بحر ایس ھرسہ نبود درمیان حمر

نگس را لگہ بود اول و زان پس
دو گرہ باشد بباشد غیر آن کس

جگس را لگہ بود پس و پس او
میان ھر دو لگہ یک گرسہ بو

بھگس را ھر دو لگہ بس یک گرہ نیز
نگس را ھر سہ لگہ بود دگر چیز

بلخی نے ڈھائی سو سے زیادہ ھندی الفاظ فارسی و عربی الفاظ کی شرح کی غرض سے اپنی تالیف میں داخل کیے ھیں ۔ ان میں نصف سے زائد ایسے ھیں جو آج بھی اردو میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے بعینہ رائج ھیں ، جس سے صاف واضح ھو جاتا ھے کہ اردو زبان ھمارے مزعومہ نظریے کے برخلاف مغلیہ عہد سے بہت قدیم ھے ۔

بعض ایسے الفاظ بھی ھیں جو آج اردو میں رائج ھیں مگر کسی قدر تغیر کے ساتھ ؛ کچھ مثالیں عرض ھیں :

بلخی ٹیسو کو کیسو ، بھرنہ کو برھتہ ، چھڑیلہ کو چھلیڑہ ،

اجوائن کو جوانی ، باندر = بندر کو ماندر میم کے ساتھ ، مین پھل کو میند پھل ، کپاس کو کپاسیہ ، دھویں کو دھوں ، پھپھوڑہ کو پھپھسہ ، تھنبے کو نھانپھہ ، گاڑھی جھاجھ کو جاڈی جھاچھ ، گجر کو گجرہ ، کنکھجورا کو کان کھجورا ، کچھوے کو کاچھہ ، کنگھی کو کنگسی ، ٹکسال کو ننگسال ، بڑباگل کو باگل ، مولسری کو بولسری ، سل ٹھ کو سلانٹھ وغیرہ لکھتا ہے ۔

ایک تعداد ایسے الفاظ کی بھی ہے جن کی شناخت و صحت آج بہت دقت طلب ہے ۔ میں نے ایسے موقعوں پر محض صورت نویسی سے کام لیا ہے ۔ کہیں کہیں ہندی لفظوں کو فارسی تصور کر لیا ہے ۔ مثالاً دو لفظ عرض ہیں ۔ 'میں' بہ معنی ماهی ہندی لفظ ہے ، مصنف نے فارسی سمجھ لیا ہے ۔ اسی طرح 'سلابہ' کی شرح میں لکھا ہے 'سنگ کہ بداں دارو و جز آں شکنند ، ہندوی بتہ گویند ۔'' میرا خیال ہے کہ سلابہ کوئی فارسی لفظ نہیں ہے ، بلکہ در حقیقت ہندی لفظ سل ٹھ ہے جسے سلاٹھ بھی بعض مقامات میں کہا جاتا ہے ۔

اردو زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے غیر زبانوں کے بعض الفاظ اپنے استعمال میں لے کر ان کو خاص معنے دے دیے ہیں ، مثلاً کاهل بہ معنی سست کو قدمائے اردو بزدل کے معنے میں استعمال کرتے تھے ۔ اسی طرح لفظ غصہ بہ معنی اندوہ ہے جو آج بھی اردو میں بہ معنی خشم و غضب مستعمل ہے ۔ بلخی نے اس لفظ کو دو جگہ لکھا ہے ؛ ایک جگہ حیثیت لغت کے اور اس کے معنے غضب بیان کیے ہیں ، دوسرے مقام پر توفیر کی تشریح میں کہتا ہے:
''خط و نامہ و فرمان بادشاهان با غصہ ۔''

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اردو نے دوسری زبانوں کے الفاظ کی شکل یا حرکات میں تصرف کر لیا ہے ، مثلاً عماری کا انباڑی ، بید کا بیت ، پلید کا پلیت ، مدد کا مدت ، اور شرم کا شرم بنا لیا ۔ اس خصوصیت کے ذیل میں بلخی کے ہاں بعض الفاظ ملتے ہیں ، مثلاً فتیلے کا ہندی مرادف اس نے پلیتہ لکھا ہے ؛ چناں چہ پلیتہ آج بھی اردو

میں مستعمل ہے ۔ علیٰ ھذا فصیل کے ذکر میں گویا ہے :

''فصیل دیوارے کہ پیش دروازہ می‌باشد و غلط عام در حلق صفیل ۔''

اب جو غلطی کہ اب سے ساں سو برس بیشتر کی جا رہی تھی ، ہم آج بھی دھرا رہے ہیں اور وہی صفیل بولتے ہیں ۔ کم جواب کا ترجمہ کم واب دیا ہے ۔ آج کل اردو میں دفالی = دف نواز کو ڈفالی کہتے ہیں ؛ جہلا ڈفالی یا پھدالی بھی کہہ دیتے ہیں ۔ لیکن یہ تصرف آج کا نہیں ہے بلکہ قدیم سے ہے ، چناں چہ صاحب بحرالفضائل لفظ تمک کی تشریح میں لکھتے ہیں :

''ساز است کہ ڈفالی می نوازند ۔''

دشمنی کی بجائے دشمنائگی لایا ہے جو آج بھی عوام بولتے ہیں ۔ غلیل کو غلول کہاں لکھا ہے ؛ عوام آج کل بھی اس کو غلول کہہ جاتے ہیں جو دراصل گلولہ ہے ۔

ان چند امثال سے کم از کم ہم کو اتنا پتا تو چل جاتا ہے کہ اردو زبان نے خلجی کے عہد سے پیشتر ہی اپنے لیے ایک شاہراہ اور زبانوں سے الگ نکال لی ہے اور اپنی شخصیت کو دوسری زبانوں سے بالکل ممیز کر لیا ہے ۔

یہاں ان الفاظ کی فہرست درج کی جاتی ہے ؛ اس میں میں نے دانستہ مصنف کے بیانات پر اکتفا کی ہے ؛ البتہ اس قدر کیا ہے کہ بعض موقعوں پر شرح غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دی اور صرف ہندی مرادف پر قناعت کی ہے تاکہ مضمون زیادہ دراز نہ ہو جائے :

آبنوس : درختے است سیاہ چوب دارد ؛ ھندوی تیمرو گویند ۔

اجمود : دارا یعنی جوائی [۱] ۔

آفرین : خورد علم بر سر دوکان ها می بندند بوقت آمدن پادشاہ ؛ هندوی ڈھج گویند ۔

---

۱ ۔ مراد اجوائن (مرتب)

ارزن : یعنی چینه ۔
آسا : فاژه که عرب ثوبا گویند ؛ هندوی جنبهائی[۱] ۔ گویند ۔
اعرج : لنگ ؛ اهل هند پانگه گویند ۔
اسفاناخ : سبزی که پالک گویند ۔
اسم : نام اله ، خدا کا نام ۔
اشر خار و اشر غار : گیا ہے اسب حار دار مالوف شتر یعنی جواسه ۔
آشنه : داروے خوشبو است ، چھلیڑه گویند ۔
اصابع الرصوص : تخم اٹنگن که جنکبه می فروشند ۔
اطریفل[۲] : ترپهله ۔
اظفارالطیب : هندوی نکه گویند ۔
استرنگ : مردم گیا ؛ هندوی هتها جوری گویند ۔
آمساب درسب : حرپا ، اهل هند گهرگهب[۳] گویند ۔
اکلیل الملک : هندوی کلو گویند ۔
الوا : گیا ہے اسب تلخ که آں را کنوار گویند ۔
ام عیلاں : ککر گویند و بعضے کنار و بعضے حلوانه را گویند ۔
املبس : سنکهدر اول و آں را آمد بیدو جوک گویند ۔
انجوخ : یعنی شکنج که در روے مردم می افتد ۔ هندوی جهرری گویند ۔
انسمه : گیا ہے اسب که آں را عربی سعد خوانند و هندوی موبهه[۴] گویند ۔
انکران : جابری ۔

---

۱ - یعنی جاهی (مرتب)
۲ - اطریفل جیسے عام طور پر عربی لفظ سمجھا جاتا ہے دراصل هندی 'تری پهل' کا معرب ہے ؛ اردو میں 'ترپهله' اور پنجابی میں 'ترپهڑا' هو گیا ہے ۔ (مرتب)
۳ - یعنی 'گرگٹ' (مرتب)
۴ - آج کل اردو میں 'ناگر موتها' کہلاتا ہے ۔ (مرتب)

آهک : چونه ۔
آهون : بر وزن حامون ، نقاب ۔
اینک : هندوی اے دے کھی ۔
بادرنگ بویه : نوعے از ریحان اسب یعنے دونه ۔
باد بیزن : یعنی پکھه ۔
بادنجان دشتی : برهـه ۔
بار : پھل را گویند ۔
باز : جانورے اسب معروف ار سوا لکھه آید ۔
پاردم : هندوی دمچیں ۔
پایکوب : پابر ، بائے داب ، جلاهه یعنی بتمگر ۔
بحج : هرچه به زور باوگران بهن شود چون
میوۂ پخته که پا ئے برو نهند گویند بحج شد و هندوی حکنا حور گویند ۔
بدرالسنج : تخم تنگ و تخم دهابوره ۔
برحیں : جار که گرد کسب دارند ؛ هندوی باری گویند ۔
برص : کودھ ۔
برعه : آلب درودگران که بدان سوراخ ها کنند، هندوی سیاری ۔
بزاوند : چوبے که پس در در زه کنند براے محکمی یعنی بهوگل ۔
برخو : اهل هند آنرا پوزنه گوید ۔
برع : اهل هند آنرا دادر گویند ۔
بسباس : جابتری ۔
بسنه : یعنی مکو ۔
بشنگ : که نهانی گویند ۔
بغض : دشمنائیگی ۔
بغه : گاؤ فحل ، هندوی سانڈھ ۔
بقله الحمقا : تخم لونگ و بڑی لونگ ۔
بقله الیانیه : هری چولائی ۔
بلادر : بهلاوه ، بهداوه ۔
پنجۂ مریم : هتها جوڑی ۔

بنفشاه : هندوی پنسیس گویند ـ
پوزه : ننۀ درخت ؛ هندوی پید ـ
بیر : بهندوی و عربی چاه ـ
باجی : سهرۀ زر که‌درکار خیر برسر مرد یا عورت می بندند ـ
برقوه : چنبر ، گردن یعنی بوجی ـ
ترن : گل نسرین و رنجس است ـ
تریم : سرائیدن یعنی بکهان کرنیں ـ
تسو : یک نیم حبه است در پیمودن ـ
تله : مخ دام که هندوی کورکی گویند ـ
تمام : بهتا ـ
تگار : سهاگه ـ
تنگ : بار شتر، هندوی هوت و موت و دهوکری که در کستی فرود آید ـ
تورنه : پوست درختے است؛ هندوی بهوج پتر ـ
توقیع : خط و نامه و فرمان پادشاهان با غصه ـ
ثمامه : گیاہے است ، هندوی تهمساتهه ـ
ثوبا و فاژه : هندوی جنبهائی ـ
ثور : گاو فلک ، هندوی برکه گویند ـ
ثولول : هندوی مسه گویند ـ
جاهبوز : خارکز که بدان دلواز چاه کشند ـ اهل هند آن را بلائی خوانند ـ
جفن : آهک یعنی گچ از چونه کنند ـ
جغره : چوب پاره که کو دکان با رشته گردانند و او را لتوگویند ـ
جنجرو : که زن به جهت پا کوبی می بندد ـ
جوار : چرخ روغن گران ، هندوی گهانی ـ
جوز : اکهروت ـ
جوزیوا : جائے پهل ـ
جوز پارسي : اکهروت ـ

حوز مائل : نار دهادوره ـ
جوز فے : میند پھل ، حوزا لمطن یعنی کپاسہہ ـ
حوز هندوی : ناریل و ماحل هم گویند ـ
حبه : یک جیتل و دانهٔ سرخ است که بدان ورن کنند و هرچه دو جو باشد ـ
حسک : خار گوکھرو ـ
حضا ح : یعنی کمتار یعنی نرکسنه ـ
حصحر : کمدار یعنی نرکسه ـ
حکاک : حارس اندام یعنی کھسں ـ
حکم : طب و محم ـ
حار نار : هندوی حجره و اوکه و انکھاره گویند ـ
حرحکوک : گیا ہے است ، هندوی سہل گوںند ـ
حررهره : درحت لسر ـ
حرفه : نرہاست ، بہندوی لونک گویند ـ
حروهه : لکره ـ
حس الحار : سحار نعی سحی ـ
حشب روس : یعنی کوپھن ـ
حفرح : نه هندوی لونک گویند ـ
حنزیر : حوک یعنی سوور ـ
دایم : جاوید و همیسه و سدا ـ
دحں : یعنی اررں که آں را چینه گوںند ـ
دژمسیں : حصار مسں ، هندوی نانه گویند ـ
دعدعه : دست زیر بغل و کس کردن تا کسے نه خندد ؛ هندوی گدگدی ـ
دولاب : چرح اراں چاه که هندوی رمنه گویند ـ
دود : دهواں ـ
دوک : آلتآ هی نه برو ماشوں کسد یعنی اهل هند کوکری گویند ـ
دیو سنبه : آں دیو که مردم را درحواب فرو گیرد ؛ اهل هند

آن را ابهاره گویند ـ
دیوحه : جوک ـ
ذروه : یعنی سیدھی ـ
ذقن : هندوی نهوڈوھی ـ
راسن : پیاز دشتی که هندوی پا جرکانده گویند ـ
راں : جا بتری ـ
رال : دارو ایست مثل صمغ که کو دکاں در شب براه برای بازی می سوزند ـ
راویز : جواسه ـ
رباط : یعنی بهانه و سکوت ، جاے غزا ـ
رخبن : دوغ شیر : هندوی حاڈی چهاچھ ـ
رعونه : ماشوره که اهل هند آنرا کوکری گویند ـ
راف : یعنی جانمری ـ
رل : پوست درخت ارلو ـ
رمان : انار ، هندوی ڈازم گویند ـ
ریه : شش یعنی پهیپهسه ـ
زادالکوکب : دارویست که هندوی کیس گویند ـ
زانگرو : جنجرو یعنی جرس و جلاجل و زنگله ـ
زاک : یعنی پهٹکری ـ
زاک برکی : هیرا کسس ـ
زبده : مسکه ـ
زراوند : کجور ـ
زرنب : گیا ہے خوشبوست بر بینی گویند ـ
زرنباد : کجور ـ
زعفران : کنلو ـ
زعفران سوده : چاپتی ـ
زقوم و رقونیا : درخت تهوهر ـ
زلابی : جلابی ـ

زمام : هندوی ناتھ ستور و شتر -
زاک : پھٹکری -
زنبر : دنبل و آن آلتے که دو کس گل از جائے بیرون اندازند
هندوی مدل -
زنجبیل : سندھی[1] -
ساریه : بھانپھه -
سارو : حور -
سال : چوبے محکم و راست اندام است درهند -
سپرز : دلی -
سبز دار : جامنری -
سپند هندی : تخم حلبح -
سپید مهره : خرمهره که هندوی سنکه گویند -
سوقه : ستو -
سجنجل : آئینه و مرص روئیں برائے زدن ساعت شب و روز ؛
هندوی گھره گویند و گھریاله هم گویند -
سد پایه : هزار پایه، یعنی کان کھجورا -
سراب : زمین شورستان که هم چو آب نماید ؛ هندوی جھاچھوه -
سرخاب : چکوا چکوی -
سرشک : درختے است ؛ هندوی سرس گویند -
سرند : گیا ہے است که در آب روید و در پائے آویزد -
سلابته : سنگ که بدان دارو و جز آن شکنند ، هندوی
بته گویند -
سلق : چقندر یعنی گوبگلو -
سلته : تلسی -
ساخجه : سینه بند زنان که آن را دوالی گویند -
سان : برگ تمال پتر -
سمط : هار -

---

۱ - سونٹھ مراد ہے - (مرتب)

سنبل : چهر ۱ -
سنج : دو قطعهٔ مس که بهم زنند ؛ هندوی کنجهال -
سنگ پشت : کاچهه -
سویق : پست یعنی ساتو -
سیسانه : بعضے ہم و بعضے بکاین را گویند -
سیۀ : گیاه یعنی گهاس -
شا افروس : رلیمیان یعنی جلابی -
شانه : که در سر کنند ؛ هندوی کنگسی گویند -
شاه بره : هندوی دونه -
شاه دانه : تخم بهنگ -
شبیخون : هندوی ریسوا -
شبه : ماند (کذا) -
سب یمانی : پهٹکڑی -
شتر خوار : گیا ہے خار دار ، جوانه (کذا) گوید -
شس : پهپهیسه -
شقاقل : موبهه -
شلکک : موری -
شنبلید : میتهی -
شوره : کهار را نیز گویند که برائےآتش بازی بکار آید -
شوشک : کیک یعنی پیهو (پسو) -
صعوه : سریچه که اهل هند آن را ممولا گویند -
صمغ : شیرۀ درخت یعنی گوند -
صندل : چندن و چدن صندل -
ضرب : سرائے درم ، تنکسال -
طاس : جام یعنی پیاله و کٹوره -
طبرزد : شکریست سپید بوره مثل نباب -
طلق : بالک هدوی ابهرک -

---

۱ - یعنی بالچهڑ (مرتب) -

طوطلی : گیاهیست ، طوطلی سند سکهاولی (محیط اعظم)
سنکها هولی و طوطلی اندهاولی اندها هولی -
طفرا لطف : نکه -
عدس : غله است که آن را دال می‌سازند ؛ اهل هند مسورگویند -
عزب الکلاو : گیاهے است ، منڈی گویند -
عطر : خوشبوئی -
عقیقه : گوسفندے که بعد تولد پسر قربانی می دهند - اهل هند
آن را مونڈن می‌گویند -
عناب : سنجاو هندان -
عنب الثعلب : هندوی کساهی -
عنصر : بهار دشتی ؛ هندوی کانده -
عودالثعلب : عود سیاه وام مثل بلبا -
عرب : بهری -
عار : اهل هند آن را لرو لورو کوبر میخوانند -
عصه : عصب -
علغلیچ : گدگدی کردن -
غلیوار : حمل -
غارک : خوبست که بالائے سبب می بندند تا معلوم شود
که ماهی‌طعمه خورد ؛ اهل هند آن را ترند گویند -
قاره : حبهائی -
قاعیه : گل چسه -
فسله : دلته -
فرحج : سرین ، جونڑ -
فرفره : پهرکی که آواز او سون سون می‌آید - بیشترے
کودکان آن را سبسوه می خوانند -
فرفر : پهرکی چوبین بیشتر آواز او سرو سرو می آید و فرفر
لٹو را هم گویند -
فصیل : صفیل -

فگار : ریش که از جراحت بر اندام مردم می افتد ، هندوی جانڈی -
قبره : ماتورک -
قرو : کپی یعنی بوزنه ، هندوی هنونت -
قزغان : کراهی -
قسط : داروست که کونه گویند -
قلته : کلته -
قوب الصباغین : اورویان که منجیٹه گویند -
کازی : گل کیوڑه -
کاز و کاژ : سنداسی -
کاورس : غلهٔ باریک چون کانک و چینه -
کپان : ترازوے یک پله که قبان هم گویند ؛ هندوی کتپّان -
کپی : بوزنه یعنی ماندر -
کب : تخب هندوی میانه بافته -
کثیرا : صمغ است کثیرا گویند -
کج : بد آنج کودکان را برسانند ؛ هندوی گهوکهر مهته گویند -
کرس البحر : نوعے از صدف ، گونگه (گهونگا ؟) -
کرک : یعنی گینڈه -
کرگس : اهل هند کرچهن گویند -
کرنائے : بوق یعنی بهیر -
گردنائے : لتو -
گل : پهول -
کلات : یعنی کوکری ریسمان -
کلفه : داغ سیاه که در روے افتد ، هندونه چهانه -
کمان کروه : یعنی غلول کمان -
کمین : اهل هند دریبه خوانند -
کمخاب : اهل هند کمقاب گویند -
کنداوله : کوٹهی -
کور موش : چهچهوندری -

کوکب الارض : یعنی ابرکه ۔
گوگرد سرخ : وآن نایاب اسں و گوگل هم گویند ۔
کهبد : درم گزین پادشاه یعنی تنکسالی ۔
کهگلوون : لیپان ۔
کناه سیر : داروئیسں ستارو گویند ۔
کیک : پپهو ۔
لسان الںور : لکرونده (ککرونده) ۔
لسان العصافیر : اندر جو ۔
لک لک : که آن را ڈهیک گوید ۔
لوبیاج : یعنی جوله ۔
لوح : سنداسی نعلبندان ۔
ماشوره : کوکری ۔
مار : سرپ که هندوی ناگ بهاگ گویند ۔
مار قشیشا : داروئیسں ؛ هندوی سودرمکهی ۔
مام : بلفظ پهلوی مانا را گویند ۔
ماویٰ : سرگ یعنی، بهشں ۔
منح : منگ ۔
مجنک : یعنی چنبتی ۔
محور : یعنی بیلن ۔
محافه : مانند سجوائی است که بر گردون راست می کنند ۔
مرغ عیسیٰ : هندوی باگل ۔
مست : یعنی موته ۔
مشکک : موبه ۔
مکیدن : یعنی جوسیدن ۔
ملخ : که او را تیڑ گویند ۔
موری : ناودان ۔

موز : میوه اسں شیریں که عجم ندارد ؛ انگور شاهی هم گویند ، اهل هند آن را کیله خوانند ۔

مولو : سنکه ـ
مہار : رسنے که در بینی ستور و شتر می‌اندازند ؛ هندوی ناتھ ـ
میو : قومے اند در ملک هند قریب دهلی ـ
مین : ماهی و نام برجے است ـ
نار مشک : سنبل و ناگیسر ـ
ناژ : صنوبر؛ هندوی جیره ـ
نداف : یعنی پنجاره ـ
نعنع : پودنه ـ
نوره : چونه ـ
نوشادر : یعنی سہاگه ـ
لیلوفر : کنول ـ
وحل : دلدل ـ
ودع : کوڈه ـ
هل لتبک : یعنی بر رسن نشسته جھو جھولی بـل پینکھولی می نوازند ـ
هن : مہر زری در هند باشد ـ

اردو کے فقرے اور دوھرے آٹھویں اور نویں صدی ھجری کی فارسی تصنیفات سے

(از 'اورینٹل کالج میگزین' بابت ماہ اگست ۱۹۳۰ء)

اردو زبان کی قدامت کے سلسلے میں ایک گزشتہ مضمون میں ہم نے اس عہد کی فارسی تصنیفات میں اردو زبان کے الفاظ کے اس ذخیرے پر نظر ڈالی تھی جو فارسی مصنفین نے ضرورتاً ہندوستان میں استعمال کیا ہے۔ ساتھ ہی ہندی زبان کے ان محاورات پر روشنی ڈالی تھی جو بنا بر کثرت استعمال ترجمہ ہو کر فارسی میں جگہ پا چکے ہیں۔ ان الفاظ اور محاورات کا وجود ہمارے خیال میں اردو زبان کی قدامت کا کافی ثبوت ہے، اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ زبان ان ایام میں عام طور پر مسلمانوں میں بولی جاتی تھی۔ آج ہم اس سلسلے میں خود اردو کے اصل فقرے اور دوھرے پیش کرتے ہیں جو ہمیں فارسی مآخذ سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اردو کی قدیم تحریری دستاویزوں کی عدم موجودگی میں ان فقروں اور اشعار سے ہم اس عہد کی زبان کا اور مسلمانوں میں اس کی وسعت اور شاعری کا کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اقوام نے ہندوستان میں اپنے لیے ایک زبان مخصوص کرلی ہے اور جوں جوں ان کے مقبوضات فتوحات کے ذریعے سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں، یہ زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلتی جاتی ہے۔

ان فقرات اور دوھروں کے مطالعے کے لیے ھمارے پاس دو بڑے ذرائع ھیں۔ اولاً ھندوستان کی تاریخیں جن میں بعض اوقات اس قسم کے فقرے ھماری نظر سے گزرتے ھیں۔ ثانیاً مشائخ کے تذکرے اور ان کے ملفوظات۔ ھندوستان میں فن تصوف کی یہ شاخ بہ لحاظ کمیت و مقدار نہایت مالا مال ھے۔ قدما میں تصوف کی اشاعت اور مقبولیت بدرجۂ اتم تھی۔ ھر مشہور اور بڑے شیخ کی ملفوظات اس کے مریدوں نے تیار کی ھیں۔ ان ملفوظات میں خود اس شیخ کے اقوال و کردار اور مواعظ کا ذکر کیا گیا ھے۔ بعض نہایت مشہور مشائخ کی کئی کئی ملفوظات موجود ھیں۔ ملفوظاتی ادب کی کثرت و وسعت سے یہاں بحث کرنا ھمارا مقصد نہیں ھے، صرف اس قدر اشارہ کافی ھے کہ ھندوستان میں تصوف کی یہ فرع بے حساب ذخیرے کی حامل ھے۔ تمثیلاً کہا جاتا ھے کہ شیخ نظام‌الدین اولیا (متوفی ۷۲۴ھ) کے متعلق متعدد ملفوظات تیار کی گئی ھیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض کے نام دیے جاتے ھیں:

۱۔ "فوائد الفواد" مرتبہ حسن دھلوی شاعر مشہور۔ یہ ملفوظات ۷۰۷ھ سے لے کر ۷۲۲ھ تک کے واقعات پر حاوی ھے۔

۲۔ "افضل الفوائد" جس کو امیر خسرو دھلوی نے ترتیب دیا ھے۔

۳۔ "انوارالمجالس" از خواجہ محمد بن بدرالدین اسحاق۔

۴۔ تحفۃالابرار" از خواجہ عزیزالدین صوفی۔

۵۔ "سیرالاولیا" از سید محمد بن سید مبارک کرمانی۔

اس تالیف میں شیخ نظام‌الدین کے اعمال و اقوال کے علاوہ ان کے مریدوں اور ان کے سلسلے کے اسلاف کا تفصیلی ذکر ھے۔

یہ فہرست ابھی ناتمام ھے، مزید تفحص و تلاش سے شیخ نظام‌الدین پر اور تالیفات دریافت ھو سکتی ھیں۔ اس سلسلے کی کتابوں میں بعض اوقات اردو کے فقرات ھماری نظر سے گزرتے ھیں جن کا وجود ان

تصنیفات میں بظاہر موجب حیرت ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ملفوظات کی ترتیب و تحفظ میں ارادت و عقیدت کا زبردست ہاتھ کام کر رہا تھا ۔ ملفوظات کے مؤلفین اپنے مرشد کے اقوال و گفتار کو جس طرح اس کی زبان سے انھوں نے سنے، محفوظ رکھنے کے لیے خواہش مند تھے ۔ یہی عقیدت مندی ان اشعار و فقرات کے تحفظ کا ، جو گاہے گاہے ان مشائخ کی زبان سے ادا ہوتے ' موجب بنی ہے ۔ ہندوستان کے صوفی ہر زمانے میں ملکی زبان سے قریبی تعلق رکھتے تھے ۔ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت عام طبقات الناس کے مرجع و مآب تھے اس لیے ملکی زبان سے واقفیت رکھنا ان کے لیے نہایت ضروری تھا ۔ طبقۂ صوفیہ کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ان بزرگوں نے ارباب سیف و قلم کے مقابلے میں ابتدا ہی سے اردو یا ملکی زبان کی طرف بہت توجہ کی ہے اور اس زبان میں ادب کو روشناس کرانے والی درحقیقت یہی جماعت ہے ۔

ان فقرات کے سلسلے میں جو بعض حکایات درج ہوں گی ، خرق و کرامت کے عنصر کی بنا پر ان کا انداز بوالعجبانہ بن گیا ہے ۔ تصوف کی یہ ایک خصوصی شان ہے اور دنیا کے ہر حصے میں جہاں تصوف نے نشو و نما پائی ہے ، یہ خصوصیت ہمیشہ اس کے ساتھ قائم رہی ہے ، مگر ان صفحات سے ہم نے حتی الامکان اس عنصر کو خارج کر دیا ہے اور قصے کے اسی حصے کو بیان کیا ہے جو ان فقرات سے ضروری تعلق رکھتا ہے ۔

سب سے پیشتر ہم ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں جو ہندی لفظ 'آم' سے تعلق رکھتا ہے ۔ چوتھی صدی کے عرب سیاح اس میوے کو 'انبج' کی شکل میں لکھتے ہیں ، جس سے ظاہر ہے کہ یہ لفظ فارسی سے عربی میں پہنچا ہے کیوں کہ فارسی میں انبہ ہے ۔ عربی میں ایسی 'ہے' 'جیم' سے بدل جاتی ہے ۔ فارسی کا 'انبہ' پنجابی 'انب' سے ماخوذ ہے اور ہائے مختفی آخر میں محض اظہار حرکت کے لیے اضافہ کر دی گئی ہے[1] ۔ فارسی میں اس میوے کا دوسرا نام 'نغزک' ہے جس کی وجہ تسمیہ حسب ذیل ہے :

سلطان شمس الدین التتمش (متوفی ۶۳۳ھ) اپنے عہد سلطنت میں ایک مرتبہ بدایوں گیا ۔ وہاں کے آم نہایت خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتے ہیں ۔ بادشاہ کے لیے یہ آم بطور تحفہ لائے گئے ۔ التتمس نے کچھ آم کھائے اور انہیں بہت پسند کیا ۔ پوچھا اس میوے کا کیا نام ہے ؟ لوگوں نے عرض کی 'آم' ۔ چوں کہ ترکی زبان میں آم ایک مکروہ حصۂ جسم کا نام ہے اس لیے سلطان نے کہا کہ اس کا نام 'نغزک' رکھنا چاہیے ۔ چناں چہ اس کا نام بعد میں نغزک ہو گیا ۔ امیر خسرو :

نغزک خوش میوۂ ہندوستاں

یہ حکایت 'فوائدالفواد' میں بالفاظ ذیل درج ہے :

''از آں سلطان شمس الدین فرمود کہ او وقتے در بداووں آمد ، نغزکے چند پیش او آوردند و آنجا نغزک نیک شیریں باشد ۔ چوں بخورد گفت ایں را چہ گویند ؟ گفتند ایں را 'آم' گویند ؛ مگر بزبان ترکی آم چیزے قبیحے را گویند ، سلطان فرمود ایں را نغزک باید گفت ، چوں ایں نام بر لفظ مبارک او رفت ہمیں نام شد ۔''

(فوائد الفواد ، صفحہ ۲۲۵ فخر المطابع ، دھلی)

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ اس حکایت کے راوی شیخ نظام الدین اولیا ہیں ۔

دھلی میں آباد ہونے کے بعد سب سے پہلا بچہ جو مسلمانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ شیخ حمید الدین صوفی ناگوری ہیں ۔ اخبارالاخیار میں یہ بیان خود شیخ کے اپنے الفاظ میں مذکور ہے :

''اول مولودیکہ بعد از فتح دھلی در خانۂ مسلمانان آمد ، منم ۔''
(اخبارالاخیار ، صفحہ ۱۳۵)

شیخ حمید الدین شیخ معین الدین چشتی کے مرید ہیں ۔ ان کا اکثر حصۂ عمر ناگور میں بہ حالت فقر و افلاس بسر ہوا اور ۶۷۳ھ میں وہیں وفات پائی۔ ان کے مزار پر سنگ زرد کی ایک عالی شان عمارت اب تک موجود ہے ۔

شیخ باجن اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ شیخ کے فرزند جو فاقوں کی کثرت سے نہایت لاغر و ناتواں ہو گئے تھے ، بھوک کی تاب نہ لا کر شیخ کی خدمت میں کشائش رزق کے واسطے دعا کی خاطر حاضر ہوئے۔ شیخ کے پاس پہنچنے تک کمزوری کی وجہ سے ان کو تنگے آنے لگے ، آخر ایک جگہ گر گئے ۔ شیخ حمید الدین حسب معمول آنکھ بند کیے یاد حق میں مشغول تھے ۔ گرنے کی آواز سے آنکھ کھول دیتے ہیں اور فرزند سے گرنے کا سبب پوچھتے ہیں ۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ نقاہت کے سبب سے میں گر گیا تھا ۔ شیخ ان کا مطلب سمجھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں :

''ہاں بابا کچھ کچھ''۔

جس سے یہ مطلب تھا کہ تم کو آیندہ کسی قدر فلاح نصیب ہو گی ۔

سرود و شعر کے سلسلے میں شیخ احمد نہروانی کا نام قابل ذکر ہے ۔ یہ ذات کے جولاہے اپنے ہم مسرب و ہم پیشہ شاہ کبیر سے دو صدی اقدم ہیں ۔ 'اخبارالاخیار' میں ان کو قاضی حمید الدین ناگوری کا مرید مانا گیا ہے اور یہ قصہ درج ہے کہ ایک روز قاضی حمید الدین شیخ احمد کے مکان پر گئے ، دیکھا کہ شیخ کپڑا بننے میں مصروف ہیں ۔ قاضی نے ملامت کے لہجے میں کہا ''احمد ! تم کب تک اس پیشے کے پیچھے پڑے رہو گے ؟'' قاضی یہ فقرہ کہہ کر چلتے بنے ۔ ادھر شیخ احمد ایک کھونٹی کے ٹھونکنے کے لیے جو ڈھیلی ہو گئی تھی اٹھے ؛ بدقسمتی سے ان کا پاؤں پھسلا اور گرے ، ہاتھ کھونٹی پر پڑا اور ٹوٹ گیا ۔ شیخ احمد نے اس وقت ہندی زبان میں کچھ الفاظ کہے جن کا مطلب تھا کہ اس بوڑھے نے میرا ہاتھ توڑ ڈالا :

''شیخ احمد بزبان ہندی گفت این پیر یعنے قاضی حمید الدین دست من بشکست ۔'' (اخبارالاخیار ، صفحہ ۵۶ ، ۵۷)

اس کے بعد شیخ احمد نے اپنا پیشہ ترک کر دیا ، لیکن شیخ احمد کے متعلق ایک قدیم روایت ہے جو فوائد الفواد میں

درج ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۳ھ) کے معاصر ہیں اور اس مجلس میں حاضر تھے جس میں شیخ قطب الدین کا بہ حالت سماع انتقال ہوا ہے ۔ یہ امر محقق نہیں کہ وہ کس کے مرید ہیں ؛ البتہ ان کو یہ نعمت ، فقیر مادھو امام جامع مسجد اجمیر سے ملی ہے ۔ شیخ احمد جو ان کے زمانے میں خوش صوت تھے اور ہندی سرود کا ان کو بڑا چسکا تھا ، ایک روز فقیر مادھو نے انہیں ہندوی گاتے سنا ، کہنے لگے ''افسوس ہے کہ ایسی اچھی آواز کو ہندوی نغمات میں برباد کرتے ہو ، قرآن کیوں نہیں حفظ کرتے ؟'' شیخ احمد نے اس کے بعد قرآن یاد کر لیا ۔ 'فوائدالفواد' کی اصل عبارت یہ ہے :

''چنیں گویند کہ او نعمت از فقیر مادھو یافتہ بود و این فقیر مادھو امام جامع مسجد اجمیر بود ۔ روزے شیخ احمد نہروانی ہندوی میگفت ؛ در اوان جوانی آواز خوب داشت ، ہندویہا خوش گفتے ۔ چوں فقیر مادھو شنید گفت چنین آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندی خرج کنی ۔ فقیر مادھو گفت کہ قرآن یاد کن ۔ شیخ احمد قرآن یاد گرفت ۔''

(صفحہ ۱۸۷ ، فوائدالفواد ، فخرالمطابع ۱۲۷۲ھ)

اس حکایت سے واضح ہوتا ہے کہ ۶۳۳ھ کے قریب مسلمانوں کا ہندی موسیقی سے تعلق قائم تھا ۔

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر پنجاب کے مشہور و معروف شیخ ہیں ۔ ان کے جد امجد کابل کے شاہی خاندان سے علاقہ رکھتے تھے ۔ ۶۱۷ھ میں بہ زمانۂ فترت مغول ان کو ترک وطن کرنا پڑا اور ہندوستان میں ہجرت کر آئے ۔ کچھ عرصہ قصور میں قیام کیا ، زاں بعد وہ کھوتوال کے قاضی بنا دیے گئے ۔ شیخ فرید الدین اسی قصبے میں پیدا ہوئے ، ملتان میں تعلیم پائی ، علمی نصاب ختم کرنے کے بعد ایک عرصے تک ممالک اسلام میں سیاحت کرتے رہے ۔ ہندوستان واپس آنے پر شیخ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۳ھ) کے دست مبارک پر

بیعت کی ؛ بعد میں ھانسی چلے آئے اور کچھ عرصے کے بعد قصبۂ اجودھن (پاک پٹن) میں آ کر مستقلاً قیام پزیر ھوگئے اور ۶۶۴ھ میں اسی مقام پر وفات پائی ۔

نقل ھے کہ ایک مرتبہ شیخ فرید الدین اپنے مرشد شیخ قطب الدین کو وضو کرا رھے تھے؛ آپ کی آنکھ دکھنے آئی تھی ، اس لیے اس پر پٹی باندھ رکھی تھی ۔ وضو کرتے کرتے یکایک شیخ قطب الدین کی نگاہ آپ کے چہرے پر پڑی ؛ دیکھا پٹی بندھی ھے ؛ سبب دریافت کیا ۔ آپ نے ھندی زبان میں عرض کی ''آنکھ آئی ھے ۔'' شیخ قطب الدین نے فرمایا ''اگر آنکھ آئی ھے ایں را چرا بستہ اید ؟''

(جواھر فریدی ، صفحہ ۲۰۸ ، وکٹوریہ پریس ، لاھور ۱۳۰۱ھ)

ایک موقع پر شیخ فرید الدین سرسے میں مقیم تھے اور اکثر اوقات شیخ عبدالشکور کے مزار پر تشریف لے جاتے تھے ۔ قصبے کے بعض لوگ اس امر کے تجسس کے لیے کہ شیخ اس مزار پر جا کر کیا کرتے ھیں ، ایک دن گھات میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ شیخ فرید تاڑ گئے اور آپ نے سرسے کے حق میں یہ فقرہ کہا :

''سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ ۔'' (جواھرالفریدی ، صفحہ ۲۷۵)

شیخ فرید الدین کے مرید شیخ جمال الدین ھانسوی نے ۶۵۹ھ میں وفات پائی ۔ ان کے فرزند شیخ برھان الدین اس وقت خورد سال تھے ۔ مرحوم کی ملازمہ مادر مومناں شیخ مرحوم کی وصیت کے مطابق شیخ زادہ برھان الدین کو لے کر شیخ فرید کی خدمت میں حاضر ھوئیں ۔ شیخ نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور شیخ زادے کو اپنی بیعت میں لے لیا ۔ کچھ دن اپنی خدمت میں رکھا اور رخصت کے وقت مرحوم جمال الدین کے تمام تعائف یعنی مصلیٰ وعصا وغیرہ شیخ زادے کے حوالے کر دیے اور فرمایا کہ جس طرح جمال الدین ھماری طرف سے مجاز تھے تم بھی مجاز ھو ۔ اس موقع پر مادر مومناں نے جو ساتھ تھیں ، عرض کی ''خواجہ برھان الدین بالا ھے'' یعنی ابھی بچے ھیں ۔ شیخ فرید الدین نے ھندی میں جواب دیتے ھوئے فرمایا ''مادر مومناں! پونیوں کا چاند

بھی بالا ھوتا ہے'' یعنی چودھویں کا چاند بچہ نہیں ھوتا ۔ اس میں اشارہ ہے شیخ زادہ برھان الدین کی عمر کی طرف ۔ یہ حکایت 'سیرالاولیاء' سے ماخوذ ہے جس کی اصل عبارت حسب ذیل ہے :

''چوں شیخ جمال الدین نقل کرد مادر مومناں کہ خادمہ شیخ جمال‌الدین بود رحمۃ اللہ علیہا مصلیٰ و عصاء شیخ جمال الدین کہ از شیخ شیوخ العالم یافتہ بود و مولانا برھان‌الدین صوفی پسر خورد شیخ جمال الدین کہ پدر شیخ قطب الدین منور بود و درعالم صغر بود بہ خدمت شیخ شیوخ العالم برد ۔ شیخ شیوخ العالم بہ مرحمت مولانا برھان‌الدین مذکور را تعظیم و تکریم نمودہ بشرف ارادت و بیعت خود مشرف گردانید و چند روز بر خود داشت و بوقت مراجعت خلافت نامہ و آں مصلیٰ و عصا با نعمتے کہ مولانا شیخ جمال الدین روانۂ کردہ بود بہ مولانا برھان‌الدین صوفی بخشید و فرمود چناں کہ جمال‌الدین از جہت ما مجاز بود توھم مجازی و ایں ھم فرمود باید کہ چند گہے در صحبت مولانا نظام‌الدین باشی یعنی سلطان‌المشائخ ۔ دریں محل مادر مومناں بخدمت شیخ شیوخ العالم عرضداشت کرد بزبان ھندوی کہ ''خوجہ برھان الدین بالا ہے'' یعنی خورد است ، ایں بار گراں را طاقت نتواند آورد ۔ شیخ شیوخ العالم قدس سرہ‌العزیز فرمود بزبان ھندوی کہ ''مادر مومناں! پونیوں کا چاند بھی بالا ھوتا ہے'' یعنی ماہ شب چہاردھم در اول شب خورد می باشد کہ بتدریج بکمال می رسد ۔''

(سیرالاولیاء ، صفحہ ۱۸۳ ، ۱۳۰۲ھ ، مطبع محب ھند ، دھلی)

شیخ علاؤالدین علی احمد صابری کو شیخ فرید الدین نے قصبہ کلیر میں قیام کرنے کا حکم دیا ، لیکن شیخ علاؤالدین اس قصبے کے لوگوں کے ھاتھوں نالاں تھے اور شیخ کی خدمت میں اھل کلیر کی متواتر شکایت کیا کرتے اور شیخ برابر ان کو برداشت و تحمل کی ھدایت کرتے ۔ بالآخر جب شکایات کا سلسلہ بند نہیں ھوا ، شیخ فرید نے انھیں لکھ بھیجا کہ کلیر تمھارے قبضے میں ہے :

''خواہ کھوہ کھاہ خواہ دوہ کھاہ''

یعنی خواہ بہ جبرو اکراہ اس سے نفع اٹھاؤ یا بلطف و مرحمت ۔

ایک مرتبہ ایک عورت شیخ فرید الدین کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سوال کیا کہ میرے کتنے لڑکے ہوں گے؟ آپ نے جواب دیا :

''ایک دو تین چار پنج چھہ ہفت ۔''

(جواہر فریدی ، صفحہ ۲٦۰ ، وکٹوریہ پریس ، لاہور)

بہ روایت شیخ بدرالدین معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین اکثر اوقات لوگوں کو 'بھیا' کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے ۔

(اردوی قدیم تاج نمبر ۲۱)

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک موقع پر کسی سوال کے جواب میں شیخ نے فرمایا ''بیچ سر کے'' اور یہ آیہ کریمہ پڑھی:

و تلک الامثال نضربها للناس وما یعقلها الاالعالمون[1]

(اردوی قدیم ، صفحہ ۲۱)

شیخ باجن نے آپ کا ایک ہندی دوہرہ اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے ۔ وھو ھذا :

سائیں سیوت گل (گھل) گئی ماس نرھیا دیہہ
تب لک سائیں سیوساں جب لک ھوسوں کیہہ

'جواہر فریدی' سے ایک اور دوہرہ درج کیا جاتا ہے :

فریدا دھر سولی پنجرہ تیلیاں تھوکن کاگ
رب اجیوں باھورے تو دھن ھمارے بھاگ

(صفحہ ۱۸۷)

شیخ فرید الدین کی طرف ایک ریختہ بھی منسوب ہے ، جس کا پتا ہم کو دو مختلف بیاضوں سے ملتا ہے ۔ پہلی بیاض دسنہ لائبریری بہار کی مملوک ہے ،دوسری بیاض راقم‌الحروف کی ملک ہے ۔ وہ ریختہ یہ ہے:

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز در آں وقت کہ برکات ہے

---

۱ ۔ آیت نمبر ۴۳ سورۃ عنکبوت (مرتب)

نفس مبادا که بگوید ترا
خسپ چه خیزی که ابهی رات ہے

بادم خود همره احرار باش
صحبت اشرار بری بات ہے

با تن تنها چه روی زین جہاں
نیک عمل کن که وهی سات ہے

پند شکر گنج بجان گوش کن
ضائع مکن عمر که هیہات ہے

شیخ فرید الدین گنج شکر کی طرف اور بھی متفرق دوهرے اور نظمیں به زبان هندی و پنجابی منسوب هیں ۔ مگر ایک امر موجب اشتباہ ہے یعنی انهی کی اولاد اور سجادہ نشینوں میں دسویں صدی هجری میں حضرت دیوان ابراهیم (متوفی ۹۶۰ھ) گزرے هیں جن کو ثانی فرید و ثالث فرید بھی کہا جاتا ہے ۔ یه بزرگ بھی فرید تخلص کرتے هیں ، اس لیے همارے لیے یه معلوم کرنا بالفعل دشوار ہے که یه کلام آیا فرید اول سے تعلق رکھتا ہے یا فرید ثانی سے ۔ سکھوں کے گرنتھ صاحب میں جو مجموعهٔ کلام ہے وہ فرید ثانی کا مانا جاتا ہے ۔

شیخ بہاءالدین ذکریا نے ایک پیغام حضرت گنج شکر کی خدمت میں بھیجا تھا جس میں آپ کو 'چندرہ' کے خطاب سے یاد کیا تھا ۔
(سراج السالکین یعنی ملفوظات مخدوم جہانیاں ، قلمی) ۔

شیخ شرف الدین بو علی قلندر (متوفی ۷۲۴ھ) فارسی کے علاوہ هندی زبان میں بھی اشعار کہتے تھے ۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے دوهرے کے جواب میں انهوں نے یه دوهرہ لکھا تھا :

ساهرے نه مانیوں پیو کے نہیں تہانو
کنتھه نه بوجھی بات اوی دهنی سہاگن نانو
(مجمع الاولیا ، قلمی ، ورق ۳۲۷ ب) ۔

... ذیل کا دوهرہ مع شعر فارسی انهوں نے مبارز خان کے نام بھیجا تھا

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

من شنیدم یار من فردا رود راہ شتاب
یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب
(دیباچۂ فرہنگ آصفیہ)

شیخ نظام الدین اولیاء ہندی موسیقی سے بے حد شغف رکھتے تھے اور پوربی راگ کے تو گویا عاشق تھے۔ صاحب 'کتاب چشتیہ' کا قول ہے :

''سلطان الاولیاٗ را پردۂ پوربی خوش آمدے ... میفرمودند کہ ما پیر شدیم و پوربی پیر نشد۔'' (ورق ۶۷ - کتاب چشتیہ ، قلمی)

قوال ایک روز مولانا وجیہ‌الدین کی جکری ''بنیابن بہاجی ایسا سکھ سیں باسوں'' بزم سرود میں گا رہا تھا ، سلطان الاولیاء کو اس جکری پر حال آ گیا ۔ صاحب 'سیرالاولیا' کے الفاظ ہیں :

''قوال جکری از مولانا وجیہ‌الدین بصوتے مری میخواند و غالب ظن من آنست کہ این جکری بود 'بنیابن بہا جی ایسا سکھ سیں باسوں' حضرت سلطان‌المشائخ را این ہندوی اثر کرد ۔''
(سیرالاولیا ، صفحہ ۵۱۲)

امیر خسرو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے ہندی اشعار کی تعداد ان کے فارسی کلام سے بہت زیادہ ہے ، لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ؛ غرۃالکمال کے دیباچے میں خود امیر خسرو فرماتے ہیں :

''جزوے چند نظم ہندوی نذر دوستان کردہ شدہ است ۔''
(صفحہ ۶۶ قیصریہ ، دھلی)

جس کا مطلب ہے کہ ہندی نظم میں چند جزو دوستوں کے لیے شایع ہوئے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہندی کلام کی تعداد چند جزو سے زائد نہیں ہے ۔ اس ذیل میں ان کے دوہرے ، دو سخنے ، چیستان ، مکرنیاں ، اور ریختے شامل ہیں اور چوں کہ یہ چیزیں

عام طور پر مشہور ہیں اس لیے میں ان کے نقل کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔

علاوہ ازیں امیر خسرو نے ملک غازی (جو بعد میں غیاث الدین تغلق ۷۲۰ھ - ۷۲۵ھ کے نام سے تخت دہلی پر بیٹھتا ہے) اور خسرو خان نمک حرام کی جنگ کے حالات بہ زبان پنجابی لکھے ہیں۔ ایسی رزمیہ نظمیں 'وار' کہلاتی ہیں۔ یہ نظم حضرت امیر نے غیاث الدین اور اس کے درباریوں کے سامنے سنائی ہے۔ مشہور مؤرخ سجان رائے اس واقعے کے ذکر میں لکھتا ہے:

''بعد ازاں غازی الملک در کوشک ہزار ستون رسیدہ بہ تعزیت سلطان قطب الدین و برادرانش گریہ و زاری نمودہ فاتحہ خواند، چناں چہ امیر خسرو بہ زبان پنجاب بہ عبارات مرغوب مقدمۂ جنگ غازی الملک تغلق شاہ و ناصرالدین خسرو خاں گفتہ کہ آنرا بہ زبان ہند 'وار' گویند۔'' (خلاصۃ التواریخ، صفحہ ۲۳۵، جے اینڈ سنز، دہلی)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم سجان رائے کے عہد تک باقی تھی اور ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر آج بھی کہیں موجود ہو۔ خسرو نے ہندی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے؛ بعض موقعوں پر ہندی افعال بھی ان کے اشعار میں ملتے ہیں، مثلاً:

منکہ: بر سر نمی نہادم گل   توبرہ بر نہاد و گفتا چل ۱

(منتخب التواریخ، بدایونی، صفحہ ۳۶، نولکشور)

از چل چل تو کار من زار شد کچل
من خود نمی چلم تو اگر می چلی بہ چل

(رسالہ عبدالواسع صفحہ ۴۱ مسیح الزمان)

اس موقع پر ایک تاریخی واقعے کا ذکر کیا جاتا ہے جو فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ) کے ایک ناکام حملۂ سندھ سے تعلق رکھتا ہے۔ سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵ھ و ۷۵۲ھ) ٹھٹھے پر حملے کے موقع پر چند

---

۱ - ملتانی زبان کے مصدر چلنا بہ معنی چلنا کا امر ہے؛ اردو کے محاورے 'ہلنا چلنا' میں بھی یہی مصدر موجود ہے۔

یوم مریض رہ کر وفات پاتا ہے ۔ اس کا جانشین فیروز شاہ تغلق شاہ مرحوم کی آخری آرزو بر لانے کے خیال سے کچھ عرصے کے بعد سندھ پر از سر نو حملہ کرتا ہے ۔ اس حملے میں اس کے ساتھ نوے ہزار سوار اور پانسو ھاتھی تھے ۔ ٹھٹھے پہنچنے پر غلے کی رسد بند ہو جانے سے شاھی لشکر میں قحط نمودار ہو گیا ۔ ادھر لشکر کے گھوڑوں میں وبا پھیل گئی ۔ فیروز شاہ بغیر کوئی فیصلہ کن جنگ کیے براہ ریگستان گجرات کی طرف لوٹ گیا ۔ اھل ٹھٹھہ جو دو مرتبہ دھلی کے لشکر سے بال بال بچ گئے تھے ، اس واقعے کو اپنی سرزمین کے شیخ[1] کی کرامت کی طرف منسوب کرنے لگے اور ذیل کا ھندی جملہ ان کے ھاں ضرب‌المثل بن گیا :

''برکت شیخ پٹھا اک موا اک نٹھا''

(تاریخ فیروز شاھی ، من شمس سراج عفیف صفحہ ۲۳۱)

شیخ اخی سراج پروانہ شیخ نظام الدین اولیا کے مرید تھے ؛ وہ اپنے مرشد کے حکم سے بنگالے چلے گئے مگر نظام المشائخ کے انتقال پر واپس دھلی آ گئے اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دھلی (متوفی ۷۵۷ھ) کے مرید بن گئے ۔ جب کمال حاصل ہو گیا چراغ دھلی نے انھیں پھر بنگالے جانے کا حکم دیا ۔ اخی سراج نے عرض کی کہ وھاں شیخ علاؤالدین قل پہلے سے موجود ھیں اور تمام بنگالے میں مقبول ھیں اس لیے میرا قیام وھاں مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے :

''شیخ بہ زبان ھندی فرمود ، تم اوپر وے تل ، یعنے تو بالائی و او زیر''۔ (صفحہ ۳۹۹ ، تاریخ فرشتہ ، نولکشور)

شیخ اخی سراج ان الفاظ سے اپنی کامیابی کی نیک فال سمجھ کر روانہ ہو گئے ۔

---

۱ ۔ اصلی نام شیخ حسین ؛ عوام میں شیخ پٹھا کے نام سے معروف تھے ؛ ۶۰۶ ھ میں فوت ہوئے ۔ مزار ٹھٹھے کے قریب ہے (مرتب)

یہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری (متوفی ۷۸۲ھ) کے ایک کبج مندرے سے دو دوھرے نقل کیے جاتے ھیں ۔ یہ شرف تخلص کرتے ھیں :

کالا ھنسا نرملا بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے بکھ ھرے نرمل کرے سریر

درد رھے نہ پیڑ

شرف حرف مایل کہیں درد کچھونہ بسائے
گرد چھویں دربار کی سو درد دور ھو جائے

(از بیاض مملوکۂ مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار)

شیخ زین الدین خلد آبادی (متوفی ۷۷۱ھ) کا ذکر ھے کہ جب ان کا زمانۂ وصال قریب آیا ، مریدوں نے ان سے اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے درخواست کی ؛ شیخ نے منہ پھیر لیا اور کہا :

''منجھ مت بلاوو'' یعنے مجھے نہ چھیڑو

(دکن میں اردو ، صفحہ ۱۰)

شیخ صدرالدین کایم ، شیخ نصیر الدین محمود چراغ دھلی کے مرید اور کتاب 'صحائف السلوک' کے مصنف ھیں ۔ اس میں ذیل کا دوھرہ مرقوم ھے :

سیس نسیے سود نکر اوبھے بانہہ نمائے
جس ھوں لوڑوں نہ لہوں او جہر میری بہای

(صحائف السلوک ، صفحہ ۱۶۲ ، مسلم پریس ، جھجھر)

اسی تصنیف میں ایک جوگی کا قول درج ھے :
''دھندھا لوک لجانے اندھا'' (صفحہ ۱۷۷)

اور فارسی کا شعر :

در چشم در آرمت بپوشم دیدہ
بے من نکرم بغیر نے ترا بگزارم

نقل کرنے کے بعد مصنف لکھتا ھے :

یکے ہندوئے ہم حوس گفتہ است :

دوھرہ

بس بھیر باہ کر آنکھیں سچ دھرلوں
ناں ھوں دیکھوں اور دھر نا تجھہ دیکھن دوں
(صفحہ ۱۸۱ ، صحائف السلوک)

اردو کا کلمہ 'کھڑا کھڑی' تاریخ میں ایک مرتبہ بنگالیوں ، پورسوں اور دلی والوں کی تعریض و شناخت کے لیے استعمال ھوا ھے۔ بہت سے بے گناہ جو اس کلمے کو صحیح طریق پر ادا نہیں کر سکے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ھے :

سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ ، ۷۹۰ھ) اپنے عہد سلطنت میں غلاموں کے جمع کرنے کا از حد شائق تھا ۔ وہ انھیں خریدنے کے علاوہ تحفہ تحائف میں بھی قبول کرتا ۔ اس کے عہدے دار شاھی اشتیاق سے واقف ھو کر اکثر اوقات غلام سرائے میں پیش کرتے ؛ بادشاہ ان کی تعلیم و تربیت میں بے حد دلچسپی لیتا ، اور پھر سلطنت کے دفتروں میں ان کو جگہ دیتا ؛ حتیٰ کہ فیروز شاہ کی وفات کے وقت ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے تجاوز کر گئی تھی اور ملک میں ان کا رسوخ اور اقتدار بہت بڑھ گیا تھا ۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کے زمانے میں یہ جماعت ملکی سیاسیات پر کامل طور پر قابض تھی ۔ بادشاھوں کا متواتر عزل و نصب اور ملک میں عام فتنۂ و شورش کا سلسلہ جو کئی سال تک جاری رھا ، زیادہ تر اسی گروہ کے غلبے اور تسلط کا نتیجہ تھا ۔ ناصر الدین محمد شاہ جس کو خود فیروز شاہ نے اپنے زمانۂ حیات یعنی ۷۸۹ھ میں بادشاہ تسلیم کر لیا تھا ، اس جماعت کی مخالفت کی بنا پر اپنا تخت کھو دیتا ھے لیکن جب ۷۹۲ھ میں دوبارہ تخت پر قابض ھو جاتا ھے تو سب سے پہلے اس جماعت کے استیصال کی فکر کرتا ھے ۔ وہ ایک فرمان کی رو سے پایۂ تخت دھلی سے ان کا اخراج لازمی قرار دیتا ھے ، اور شہر خالی کرنے کے لیے تین یوم کی مہلت مقرر کرتا ھے ۔ بہ صورت عدم تعمیل سزائے قتل و ضبطی املاک

کا مستوجب ٹھہرایا ھے - اس فرمان کے شائع ہونے پر اکثر غلام شہر سے نکل گئے، تا ھم ایک بڑی تعداد موجود رھی - یہاں یہ ذکر کردینا مناسب معلوم ھوتا ھے کہ ان غلاموں کی اکثریت ھندوستان کے مشرقی صوبوں یعنی بنگالہ اور پورب سے تعلق رکھتی تھی - محمد شاہ نے یہ دیکھ کر کہ اس کے حکم کی قرار واقعی تعمیل نہیں ھوئی ھے، اس گروہ کی گرفتاری کا فرمان شائع کیا - جب یہ لوگ پکڑے گئے انھوں نے اپنی بے گناھی کے اظہار میں یہ بیان دیا کہ ھم اصیل یعنی دھلی کے باشندے ھیں اور شاھی ملازموں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

ناصر الدین شاہ نے ان کے بیانات کی صداقت کا امتحان لینے کے لیے یہ طریقہ نکالا کہ قیدیوں میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے بلاتا اور کلمہ 'کھڑا کھڑی' کہلواتا ؛ اگر قیدی یہ لفظ دھلویوں کے لہجے کے مطابق ادا کر دیتا ، آزاد ھو جاتا ، ورنہ جلاد کے سپرد کردیا جاتا - اس داروگیر میں متعدد بے گناھوں کی جانیں ضائع ھوئیں ، خصوصاً ان اصیل بنگالیوں کی جو ضرورتاً دھلی میں آ کر آباد ھوگئے تھے - اس موقع پر فرشتہ کی اصل عبارت نقل کر دی جاتی ھے :

''ناصر الدین محمد شاہ فرمود کہ از غلامان فیروز شاھی ھرکہ زیادہ بر سہ روز در شہر بماند جان و مالش سبیل باشد - پس بیشترے از ایشان درین سہ روز از شہر بدر رفتند و آنہا کہ نرفتند بدست افتادہ بقتل رسیدند و بعضے از ترس جان مگفتند کہ ما اصیلیم - ناصرالدین شاہ فرمود کہ ھرکہ از شما 'کھڑا کھڑی' بگوید اصیل است و چوں بطوریکہ پادشاہ میخواستند نمی توانستند نمود و بزبان پورب و بنگالہ ادا میکردند کشتہ می شدند چنانکہ بسیارے از مردم پورب کہ اصیل بودند و زبان ایشان ہمی گشت نیز بقتل رسیدند -'' (تاریخ فرشتہ ، صفحہ ۱۵۳)

ایسا معلوم ھوتا ھے کہ مشرقی صوبوں کے باشندے ھندی 'کھ' اور 'ڑ' کا تلفظ دھلویوں کے مقابلے میں تکلف سے ادا کرتے ھیں - 'کھڑا کھڑی' اگرچہ اس قصے کی روشنی میں جلاد کی تلوار اور انسانی

قتل کے شکنجے سے کم جون خوار ثابت نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان ایام میں اردو زبان دہلی شہر اور شاہی دربار میں برابر بولی جاتی تھی۔

کتاب 'عشق نامہ' عبداللہ بن عبدالرحمان مرید حضرت سید محمد گیسودراز کی تصنیف ہے، اس میں فقرۂ آیندہ مصنف نے اپنے مرشد کی طرف منسوب کیا ہے:

''بھو کوں موئے سوں جدا کچھ اپڑیتا[1] ہے۔ جدا کوں انپڑنے کی استعداد ہور ہے۔'' (اردوی قدیم، تاج نمبر ۲۲)

محمود بن سعد ایرجی کی 'تحفۃ المجالس' کے ایک اقتباس سے جو 'اخبارالاخیار' میں منقول ہے، معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد کھٹو (متوفی ۸۴۹) اپنے مرشد شیخ اسحاق مغربی کو 'بابا جیو' اور 'بابو جیو' کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔

شیخ احمد عبدالحق (متوفی ۸۳۷ھ) قصبۂ ردولی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے اور شیخ جلال الدین پانی پتی کے مرید ہیں۔ ان کے بعض دوہرے شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۲ھ) نے اپنی تصنیفات 'رشد نامہ' اور 'انوارالعیون' میں نقل کیے ہیں؛ ان میں سے دو دوہرے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

کنواں ہوی تو پاٹوں سمند کہ پاٹن جائے
بارا ہوی تو برحوں جھمل کہ برجن جائے

(انوارالعیون، صفحہ ۳۳)

۱۔ حکیم شمس اللہ قادری صاحب اپنی تصنیف 'اردوے قدیم' میں 'اپڑنا' کے معنی پکڑنا تحریر فرماتے ہیں، لیکن مولانا عبدالحق مرحوم کی مرتبہ 'سب رس' کی فرہنگ الفاظ میں اپڑنا = پہنچنا، دیا ہوا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔ 'پہنچنا' کے معنی میں قریباً یہی لفظ پنجابی زبان میں آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ (مرتب)

ایک گسائیں سبھنا سو جو لکھن نجای
جو اس سن نہ ناوئیے سن مانتھن لکھن حای

(رشد نامہ قلمی)

'فرہنگ بحرالفضائل' میں جو محمد بن قوام کڑی شارح 'مخزن اسرار' نے ۸۳۷ھ میں تالیف کی ہے، 'اسم اللہ' کا ترجمہ 'خدا کا نام' 'اینک' کا 'اے دیکھی' اور 'ترنم' کا ترجمہ 'بکھان کرنیں' دیا ہے۔ اس کتاب میں ایک موقع پر ذیل کا شعر ہندی ملتا ہے :

دیکہ پیکہ پیہ پر گہر جاوے
نس نس نبنو نید نہ آوے

یہاں میں شیخ پیارے کے بعض ہندی اشعار درج کرتا ہوں، یہ بزرگ شیخ عارف بن عبدالحق (متوفی ۸۵۸ھ) کے مرید ہیں :

پہب بودے بہ جاسوں دھک جیون تیرا
سائیں بھیں نوں کی پہرا دیکہ کتنب گھنیرا

ایکو کام نہ آوسی جب پرسی بیرا
چھوڈ پیارا سائیاں نوں جانھن کیرا

(رشد نامہ قلمی)

'اخبارالاخیار' اور 'خزینہ الاصفیا' میں شیخ پیارے کو سید یداللہ کا مرید بتایا ہے اور سال وفات ۸۶۵ھ دیا ہے، لیکن شیخ کے اشعار آیندہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ احمد عبدالحق کے سلسلے کے مرید ہیں :

محمد محمد جگ کہے چینھے نا کوی
احمد میم گنوائیا کہو کیوں بھوجا ہوی

محمد پھول اناد کا پھل بھی آہیں سوی
سو کیوں جادیں با پراجن نہن چاکھیا ہوے

محمد عارف ہو رہا عارف احمد سوی
اکتہ کتھا یہ لدھن کی برلا بوجھے کوی

(رشد نامہ)

یہاں اشارہ ہے شیخ احمد عبدالحق (متوفی ۸۳۷ھ) ، ان کے فرزند شیخ عارف (متوفی ۸۵۹ھ) اور ان کے فرزند محمد کی طرف جو لدھن بھی کہلاتے تھے -

شیخ لطف شیخ نظام الدین اولیا کے مرید ہیں ؛ ان کے فرزند شیخ یحییٰ بحرانی مشہور شیخ عزیزاللہ متوکل کے والد ہیں ۔گجرات میں مقول شیخ باجن شیخ یحییٰ کی نسبت یہ ضرب المثل مشہور تھی :

''ووب شیخ یحییٰ جیسا بڑے دیسا سپھے ، ایسی بڈن کسے نکھیے''۔

سید برہان الدین عبداللہ قطب عالم (متوفی ۸۵۷ھ) مخدوم جہانیاں کے نبیرہ ہیں - ان کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شب آپ نماز تہجد ادا کرنے کے لیے اٹھے ، رات کی تاریکی میں ان کو گھر کے صحن میں سے گزرنا پڑا ؛ چلنے میں کسی چیز کی ٹھوکر لگی جس سے پاؤں زخمی ہو گیا ؛ آپ کی زبان پر اس حالت میں یہ الفاظ جاری ہوئے :

'' کیا ہے لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے ؟''

(صفحہ ۱۷ ، مرآت احمدی ، جلد دوم)

اور مرآۃ احمدی کی عبارت یہ ہے :

''قضارا پای ایشان به آفتوب خورد افتاد ؛ چنانچه مجروح گشت و خون آلود گردید برزبان مبارک گذشت ''که کیا ہے لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے۔''

(صفحہ ۱۷ ، مرآت احمدی، جلد دوم[1] و تحفۃ الکرام، جلد اول ، صفحہ ۱۷)

قطب عالم کے فرزند سراج الدین ابوالبرکات شاہ عالم عرف شاہ منجھن (متوفی ۸۸۰ھ) ایک روز شاہ بارک اللہ چستی کی خدمت میں حاضر ہوئے -

---

۱ - 'مرآت احمدی' جلد دوم طبع فتح الکریم ۱۳۰۷ھ اور 'تحفۃ الکرام' جلد اول صفحات ۸۵ ، ۸۶ تک بعینہ ایک دوسرے کی نقل ہیں اور ان کی عبارت حرف بہ حرف مل رہی ہے - دونوں کتابیں بمبئی کی مطبوعہ ہیں - مرآت احمدی کی جلد دوم جو پروفیسر نواب علی نے بڑودے سے شائع کی ہے بالکل مختلف چیز ہے -

شاہ نے انھیں شاہ عالم کے خطاب سے یاد کیا ؛ شاہ عالم نے واپس آ کر اس ملاقات کا ذکر اپنے والد قطب عالم سے کیا ، قطب عالم نے فرمایا :

''چشتیوں نے پکائی انے[1] بخاریوں نے کھائی ۔''

یہ فقرہ بعد میں ضرب المثل بن گیا ۔ چناں چہ 'تحفۃ الکرام' و 'مرأت احمدی' میں مرقوم ھے :

''و مثل مشہور کہ چشتوں نے پکائی انے بخاریوں نے کھائی ، یعنی چشتیاں پختند و بخاریاں خوردند اصلش ایست ۔''

(مرأت احمدی صفحہ ۳۸ ، جلد دوم ، تحفہ الکرام ، جلد اول صفحہ ۳۸)

قطب عالم دراصل پنجاب کے باشندے ھیں ؛ تیموری حملۂ ہند کے وقت جب کہ آپ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی ، ترک وطن ہو کر گجرات میں آباد ہو گئے ۔ آپ کے بعض فقرے ایسے بھی ھیں جو بہ زبان پنجابی آپ نے کہے ھیں ؛ میں اپنے پنجابی دوستوں کی دلچسپی کے خیال سے وہ فقرے یہاں درج کرتا ہوں :

جام جانوہ والئی سندھ کے دو لڑکیاں تھیں ؛ بڑی کا نام بی بی مغلی تھا جس کی نسبت قطب عالم کے فرزند شاہ عالم سے ٹھہری تھی اور چھوٹی کا نام بی بی مرکی تھا جو سلطان محمد شاہ والئی گجرات (۸۳۵ھ و ۸۵۵ھ) سے منسوب تھی ۔ جب شاہ گجرات کو علم ہوا کہ بڑی بہن مغلی بہت حسین ھے ، اس نے کوشش کرکے جام کو اس امر پر رضا مند کر لیا کہ بی بی مغلی سلطان سے بیاہ دی جائے اور بی بی مرکی شاہ عالم سے ۔ جب اس واقعے کی اطلاع شاہ عالم کو پہنچی بے حد آزردہ ہوئے اور اپنے والد قطب عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرنے لگے ؛ قطب عالم نے انھیں تسلی دی اور بہ زبان پنجابی کہا :

''تساڈ (۱) نصیب دوھوں ویچ ۔'' (کذا)

(مرأت سکندری ، صفحہ ٦٦ ، فتح الکریم)

---

۱ ۔ 'انے' بہ معنی 'اور' ، گجراتی زبان کا حرف عطف ھے ۔ (مرتب) ۔

حب قطب عالم کے فرزند سید محمود المعروف بہ شاہ بدھ کے ہاں ۸۵۴ھ میں شاہ شیخ جو پیدا ہوئے تھے، مولود کی خوش خبری حضرت کی خدمت میں پہنچائی گئی ؛ آپ بے حد مسرور ہوئے اور اپنے ایک مرید کو خطاب کر کے مسرت کے لہجے میں کہنے لگے :

''بھائی محمود خوش ہو اساں نہیں وڈا ساں ہیں وڈا سانڈے گھر جلال جہاناں آیا ۔'' (مرأت احمدی جلد دوم صفحہ ۱۸)

شیخ محمد جو گجرات کے ولی ہیں دراصل قصبہ نڑیاد کے متوطن تھے ۔ ایک روز شیخ موصوف اپنے گھر کے آگے بیٹھے ہوئے سبزی دھو رہے تھے ، اتفاقہ حضرت شاہ عالم نمودار ہوئے ۔ شیخ محمد نے انھیں آتا دیکھ کر دل میں کہا کہ آج جب تک شاہ عالم مجھے کوئی خطاب نہیں دیں گے میں ان کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا ۔ یہ ٹھان کر انھوں نے شاہ عالم کی طرف سے منہ موڑ لیا ۔ شاہ عالم نے آواز دی ۔ شیخ محمد نے جواب نہیں دیا ؛ دوبارہ آواز دی لیکن صدائے بر نخاست ؛ سہ بارہ پکارا ، شیخ محمد ٹس سے مس نہیں ہوئے ۔ اس وقت شاہ عالم مسکرائے اور بولے :

''ارے میاں الولک بولتے کیوں نہیں؟''

میں یہاں اصل اقتباس درج کرتا ہوں :

''چوں دیدند کہ حضرت شاھیہ دام اجلالہ تشریف می آرند بدانصوب پست کردہ بنشستند و در دل آوردند کہ باید امروز مرا خطاب عنایت فرمایند ۔ القصہ چوں حضرت شاھیہ نزدیک رسیدند توقف فرمودہ ایشاں را بنام ایشان خواندند ، جواب نداد و بار دویم خواندند ، جواب نداد ؛ بار سویم خواندند ، جواب نداد ؛ تبسم کناں فرمودند ''ارے میاں الولک بولتے کیوں نہیں'' یعنے اے مست ناز جواب چرا نمی دھید ؟''

(صفحہ ۸۱ ، جلد دوم ، مرأت احمدی - تحفۃالکرام ، جلد اول صفحہ ۸۱)

سلطان محمود بیگڑہ بادشاہ گجرات (۸۶۳ھ و ۹۱۷ھ) بچپنے میں فتح خاں کے نام سے مشہور تھا ۔ ان ایام میں اس کا سوتیلا بھائی

سلطان قطب‌الدین (۸۵۵ ھ و ۸۶۳ھ) تخت گجرات پر متمکن تھا ۔ قطب‌الدین شہزادہ فتح خاں کے قتل کے درپے تھا اور ہر وقت موقع کا منتظر رہتا ۔ فتح خاں کی ماں بی بی مغلی نے جس کا اس سے قبل ذکر ہوچکا ہے ، اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے آخرکار اپنی بہن بی بی مرکی کے گھر جو حضرت شاہ عالم سے بیاہی گئی تھی ، پناہ لی ۔ ایک روز فتح خاں حضرت شاہ عالم سے سبق لے رہا تھا ، مخبر نے اس امر کی اطلاع سلطان قطب‌الدین کے گوش گزار کر دی ۔ قطب‌الدین اپنے بھائی کے قتل کی نیت سے اٹھا اورگھوڑا سرپٹ دوڑاتاھوا شاہ عالم کی خانقاہ پر آ دھمکا لیکن خانقاہ کے دربان نے جس کا نام مقبول تھا بادشاہ کودروازے پر روک لیا ۔ سلطان نے کہا تم مجھے 'باپ جیو' کی زیارت سے کیوں روک رکھتے ہو ؟ شاہ عالم نے جو قریب کے کمرے میں بیٹھے تھے ، بادشاہ کی آواز پہچان لی اور مقبول کو آواز دی کہ آنے دو ؛ بادشاہ تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور شاہ عالم نے فتح خاں سے کہا 'بڈھ ڈوکرے' ۔ اب جو سلطان نے کمرے میں نگاہ ڈالی تو ایسا معلوم ہوا کہ شاہ عالم کے سامنے ایک دراز ریش اور سفید ابرو کبڑا بیٹھا پڑھ رہا ہے ؛ مورخ کے اصل الفاظ یہ ہیں :

''چوں آواز سلطان بگوش مبارک ایشاں رسید فرمودند مقبل بگزار تا بیامد و بہ فتح خاں گفت 'بڈھ ڈوکرے' یعنے بخواں اے پیرک کہ صورت فتح خاں در نظر سلطان مرد درار ریش ،ا برو سپید ، کوز پشت نمود ۔'' (مرأت سکندری ، صفحہ ۶۵)

ملک سیف الدین کا فرزند فخر الدین ابھی کم عمر ہی تھا کہ قضاے الٰہی سے فوت ہو گیا ۔ سوگوار باپ حضرت شاہ عالم کی خدمت میں آیا اور مردہ بچے کی زندگی کے لیے حضرت سے دعاے خیر کا طالب ہوا ۔ شاہ عالم نے ملک کو تسلی دینے کے لہجے میں کہا بچے کی اتنی ہی عمر تھی اور ہمیں مشیت ایزدی پر صابر و شاکر رہنا چاہیے ۔ ملک سیف الدین کو اس نصیحت سے کوئی تسکین نہیں ہوئی ؛ وہ مایوس ہو کر اٹھا اور حضرت کے چہیتے فرزند شاہ بھیکھ کے پاس جو متوفی بچے کے ہم سال تھے ، گیا اور التماس کی کہ تم جا کر حضرت شاہ کی

خدمت میں میرے بچے کی حیات کے لیے کوشش کرو - شاہ بھیکھ ملک سیف الدین کی زاری اور بے قراری دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور سیدھے اپنے والد بزرگ وار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مردہ فخرالدین کی زندگی کے واسطے طالب دعا ہوئے۔ شاہ عالم نے کہا میرے فرزند ! اگر تم اپنی جان اس بچے کی زندگی کے عوض قربان کرنے کے لیے تیار ہو تو میں دعا کر سکتا ہوں ۔ شاہ بھیکھ نے یہ شرط منظور کر لی ۔ شاہ عالم انھیں اپنے حجرے میں لے گئے اور یوں دعا کی :

''راجی جی بکروٹے بدل بکروٹا ۔''

یعنی اے مولیٰ ! بکری کے بچے کے عوض بکری کا بچہ قبول ہو۔
حضرت شاہیہ ایشان را در حجرۂ مبارک خود بردہ بزبان ہندی مناجات نمود کہ ''راجن جی بکروٹے بدل بکروٹا ۔''
(تحفہ الکرام ، صفحہ ۲۶ ، جلد اول ، مرأت احمدی ، جلد دوم ، صفحہ ۲۶)

سلطان شاہ غزنیں سلاطین گجرات کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے اور جوانی کے زمانے میں انتہا درجے کے ظالم اور تند خو واقع ہوئے تھے۔ لوگوں کا روپیہ اور اجناس وغیرہ زبردستی چھین لیا کرتے؛ اس پر طرہ یہ کہ پرلے درجے کے مغرور و متکبر تھے ۔ ایک روز حضرت شاہ عالم کے مرید شیخ احمد اپنے مرشد کا کچھ روپیہ بعض اشیاء کی خریداری کے لیے رسول پورے سے لے کر احمد آباد کی طرف چلے۔ راستے میں شاہ غزنیں سے مڈبھیڑ ہوگئی ۔ شاہ غزنیں نے سب روپیہ چھین لیا ۔ شیخ احمد واپس رسول پورے چلے آئے اور اپنی سرگزشت حضرت شاہیہ سے عرض کر دی ۔ شاہ عالم مسکرائے اور بولے شیخ احمد ! ہم نے شاہ غزنیں کے دل میں اہل اللہ کی محبت کی تخم ریزی کر دی ہے ۔ کچھ عرصے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ شاہ عالم ایک روز 'گھوڑ بہل'[۱] پر سوار جا رہے تھے، ساتھ میں شیخ احمد بیٹھے ہوئے

---

۱ ۔ گھوڑ بہل : یعنی ایسی رتھ جسے بیلوں کی بجائے گھوڑے کھینچتے ہیں ۔ (مرتب)

تھے ؛ سامنے سے شاہ غزنیں نمودار ہوئے اور شاہ عالم کو سلام کیے بغیر برابر سے گزر گئے ۔ شیخ احمد نے عرض کی حضرت آپ دیکھتے ہیں یہ نوجوان کس قدر مغرور ہے کہ آپ کو سلام تک نہیں کیا اور پاس سے نکل گیا ۔ شاہ عالم نے جواب میں کہا :

”جو راجن جی کا اونہ بھایا ہووے تو مجھ جیسے فقیروں کی برسوں تیں کناسی کرے ۔“ (تحفہ الکرام ، جلد اول ، صفحہ ۳۱)

ان الفاظ میں گویا بجلی کا اثر تھا ؛ مغرور شاہ غزنیں کا قلب الٹ گیا ، وہ فوراً لوٹا اور حضرت شاہ کے قدموں میں گر گیا اور تائب ہو کر درگاہ شاہیہ کے باورچی خانے میں دیگ شوئی پر مقرر ہوا ۔

سکندر بن منجھو اپنی تاریخ مرأت سکندری میں قصۂ ذیل بیان کرتے ہیں :

سلطان محمود بیگڑہ (۸۶۳ھ و ۹۱۷ھ) نے ایک مرتبہ کسی سنار سے ایک مرصع رباب تیار کرنے کی فرمائش کی ۔ کئی ماہ کی محنت کے بعد وہ رباب تیار ہوا اور سنار اسے لے کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے شاہی محل کی طرف روانہ ہوا ؛ راستے میں قاضی نجم الدین قاضی شہر احمد آباد آ رہے تھے ؛ قاضی نے سنار سے دریافت کیا کہ تیرے پاس کیا چیز ہے اور کس کی ہے ؟ اس نے جواب دیا شاہی رباب ہے اور بادشاہ کی خدمت میں لے جا رہا ہوں ۔ قاضی نے خادموں کو اشارہ کیا ، رباب سنار سے لے لیا گیا اور قاضی نے پکڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ، حتیٰ کہ قیمتی جواہرات جو اس پر لگے تھے زمین پر گر کر مٹی میں مل گئے ۔ سنار با حال تباہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رباب کے تلف کر دینے کا قصہ سنایا ۔ بادشاہ نے تمام کیفیت سن لی لیکن دم نہ مارا ؛ بعد میں اٹھ کر اپنے خلوت خانے میں چلا گیا ، ایک آہ بھری اور کہا:

”نیچی بیری سبکوئی جھوڑے ۔“

قاضی صاحب ہم پر امر بالمعروف کرتے ہیں اور رسول پورے جا کر میاں منجھلے کو کچھ نہیں کہتے۔ جو ریشمی کپڑے پہنتے ہیں

اور سرود سنتے ھیں ۔ سکندر منجھو کی اصل عبارت یہ ھے :

''زرگرے رباب مرصع بہ تکلف ساختہ بہ خدمت سلطان می آورد ؛ در اثنای راہ شریعت پناہ قاضی نجم الدین کہ منسوب بقضای شہر احمد آباد بودند پیش آمد ۔ چوں نظر قاضی بر رباب افتاد پرسید کہ ایں چیست و از آں کیست ؟ گفت رباب سلطان است ۔ فرمود بیارید ، متقاضیاں دویدہ آوردند ، قاضی گرفتہ پارہ پارہ کرد ، جواھرش از ھم پاشیدہ بہ خاک یکساں گردید ۔ زرگر خاک بر سر کردہ فریاد کناں پیش سلطان آمد و عرض کرد کہ مدت چند ماہ است کہ حسب الحکم در ترصیع رباب اوقات صرف کردہ بودم ، امروز بہ خدمت می آوردم ، قاضی نجم الدین از دست من گرفتہ چنیں ضائع و نابود کرد ۔ سلطان دم بر دم ؛ بعد ازاں برخاست و در خلوت نشست ، گفت 'نجی بری سب کوئی چھوڑے' یعنی درخت کنار کہ پست است دست ھمہ کس باوے میرسد ۔ بما امر معروف می کنند چرا بہ رسول آباد رفتہ بر میاں منجھلہ یعنی شاہ عالم امر معروف نمی کنند کہ ایشاں جامۂ ابریشمی می پوشند و استماع سرود می نمایند ۔''

(صفحہ ۱۱۱ ، مرأت سکندری)

ھم بالفعل انھی نمونوں پر اکتفا کرتے ھیں ۔ یہ مضمون مزید تلاش و تحقیقات کا متقاضی ھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تمام سلسلۂ ادب میں جو ھندوستان میں آٹھویں اور نویں صدی ھجری میں بہ ذیل تصوف تالیف ھوا ھے ، اگر باقاعدہ تفحص و تلاش سے کام لیا جائے تو بے شمار اور ایسے فقرات ھمیں نظر آئیں گے ۔ مقولہ بالا نمونے دھلی ، پنجاب ، اودھ ، گجرات اور دکن سے تعلق رکھتے ھیں ۔ دھلی جس طرح مسلمان سیاسیات کا مرکز رھا ھے اسی طرح اس زبان کا بھی یہی مرکز ھے ۔ اردو یا ھندی ، جیسا کہ ان ایام میں اس زبان کو کہا جاتا تھا ، ایک موٹی اور اکھڑ زبان کے مشابہ ھے جو ایک ھی صرفی و نحوی نظام کے ماتحت ھندوستان کے مختلف صوبوں میں بولی جا رھی ھے اور ھر صوبے میں صوبے کی مقامی زبان سے بھی اثر پزیر ھے اور مسلمانوں کی قومی زبان کی حیثیت رکھتی ھے ۔

دھلی کے مسلمان آباد کاروں میں شیخ حمید الدین صوفی پہلے مولود ھیں جو دھلی میں پیدا ھوئے ۔ ان سے فقرہ 'ھاں بابا کچھ کچھ' تعلق رکھتا ھے ۔ یہ فقرہ آج بھی اردو داں طبقے میں وھی مفہوم ادا کر رھا ھے جو ان ایام میں اس سے مقصود تھا ۔ مادر مومناں اور گنج شکر میں جو گفتگو ھوئی اس سے واضح ھوتا ھے کہ اردو ان ایام میں اپنے خصوصی خط و حال کی مالک تھی جس سے بہ آسانی دوسری زبانوں سے تمیز ھو سکتی ھے ۔ 'کا' اضافت اور 'ھوتا ھے' فعل حال اردو کے ساتھ خاص ھیں ؛ لفظ 'کھڑا کھڑی' کے تلفظ کو ناصر الدین محمد شاہ تغلق اصل باشندۂ دھلی کو غیر دھلویوں سے شناخت کرنے کے لیے ذریعۂ امتحان بناتا ھے ۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ھے کہ ان ایام میں مسلمان لوگ مختلف طریق کے لہجوں سے جو مختلف صوبوں میں بولے جاتے تھے، بہ درجۂ تام آشنا تھے ۔

مسلمانوں کے ساتھ ھندی موسیقی کا تعلق اگرچہ شیخ احمد نہروانی کے زمانے سے اقدم معلوم ھوتا ھے ، تاھم اس سلسلے میں شیخ احمد پہلے شخص ھیں جو ھمیں معلوم ھیں ۔ 'خزینۃ الاصفیا' میں ان کی تاریخ وفات ۶۶۱ھ دی گئی ھے مگر وہ روایت زیادہ معتبر اور قدیم ھے جو ان کو قطب الدین بختیار کاکی کا معاصر تسلیم کرتی ھے ۔ صوفی حلقوں خصوصاً سلسلۂ چشتیہ میں موسیقی کی حلت و جواز کا مسئلہ ھندی سرود کو مسلمان اقوام میں مقبول بنانے کے لیے بڑا کامیاب وسیلہ ثابت ھوا ھے ۔ اکثر مشہور مشائخ، مثلاً بہاءالدین زکریا اور شیخ نظام الدین اولیا اس ملک کی موسیقی سے خصوصیت کے ساتھ وابستگی رکھتے تھے ۔ جکری جو در اصل مسلمانوں کی چیز ھے اور خیال و ٹپے سے زیادہ قدیم ھے ۔ اس میں توحید و نعت اور بزرگان دین کی مدح کے مضامین ھوتے تھے ۔ ھم دیکھتے ھیں کہ یہ شیخ نظام الدین اولیا کے دور میں رائج تھی ۔ یہی صوفی مسلمانوں میں ھندی شعر کی اشاعت کے معاون ھوتے ھیں ۔ چناں چہ اس مضمون کے دوران میں دیکھا جا چکا ھے کہ شیخ فرید الدین گنج شکر ، نظام الدین اولیا ، شرف الدین بو علی پانی پتی ، شرف الدین احمد یحییٰ منیری ، احمد عبدالحق اور شیخ پیارا

وغیرھم کم و بیش شعر کہتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر دوھروں کے وزن میں لکھتے تھے جس کو ان ایام میں قبول عام کا خلعت حاصل تھا۔اس دور میں شعر کے میدان میں اردو زبان کا دوسری زبانوں سے تمیز کرنا ایک مشکل امر ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کے قائل مسلمان ھیں یا اس میں اسلامی الفاظ استعمال ہوئے ھیں یا بعض اوقات اسلامی جذبات کی پیروی کی گئی ہے اور کوئی وجہ امتیاز نہیں ، لیکن یہ مابہ الامتیاز بھی نہایت ھلکے رنگ میں نظر آتا ہے ، مثلاً مصرع :

''سچن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روی''

میں فارسی لفظ 'شکار' کو ھندی بنا کر 'سکارے' کی شکل میں تبدیل کرلیا گیا ہے۔ نیز یہ احتمال کہ شکار کا جذبہ مسلمانوں میں زیادہ غالب ہے ، اس کے سوا اس مصرع میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی رو سے اس کو مسلمانی کہا جا سکے۔ لیکن اکثر مثالیں ایسی ملتی ھیں جن میں یہ احتمال بھی مفقود ہے ، مثلاً یہ شعر لیجیے :

پنکھا ھو کر میں ڈولے ساتھے تیرے جاؤ
ڈولیے مکھوں جنم گیا تیرے لیکھے باؤ

اب اس شعر سے ہر قسم کی اسلامی خصوصیت غیر حاضر ہے ؛ اگرچہ بہ روئے روایت امیر خسرو کا ہے کیوں کہ وجہ الدین وجہی نے اپنی کتاب 'سب رس' میں (تالیف ۱۰۴۵ھ) اس کو امیر خسرو کے نام پر درج کیا ہے۔ درحقیقت یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمان عام طور پر ھندی اوزان و جذبات و خیالات کا تتبع کر رہے تھے۔ اردو نظم کا وہ دور جس میں وہ دوسری زبانوں کی شاعری سے ممیز ہوتی ہے ، دسویں صدی ھجری سے قبل شروع نہیں ہوتا جب گجرات اور بالخصوص دکن میں اردو شاعری بہ تقلید فارسی ، روشناس ہوتی ہے اور فارسی جذبات و خیالات و عروض کا پرتو قبول کر لیتی ہے۔

آخر میں اس قدر اور اضافہ کیا جاتا ہے کہ اردو زبان لشکر اور دربار کے مقابلے میں زیادہ تر خانقاہ سے تعلق رکھتی ہے اور شاعروں سے بہت پہلے مشائخ اس کو ادبی شکل دیتے ھیں۔ اور غالباً یہ سرزمین گجرات ہے جہاں سب سے پہلے اس زبان میں تالیفات شروع ہوتی ھیں ، جیسا کہ ہم آیندہ مضمون میں واضح کریں گے۔

گوجری یا گجراتی اردو
دسویں صدی ہجری میں

یہ مضمون دو قسطوں میں ''اورینٹل کالج میگزین''
بابت ماہ نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا
تھا ۔ اس کا عنوان تھا ''گوجری یا گجراتی اردو
سولھویں صدی عیسوی میں'' میں نے اس میں اتنی تبدیلی
کی ہے کہ عیسوی صدی کو اس سے قریب ترین
مطابقت رکھنے والی اور مضمون کے مواد کے لحاظ
سے مناسب ترین ہجری صدی میں بدل دیا ہے ۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ اس سے قبل بعض مضامین کے عنوانات
میں ہجری صدیاں دی گئی ہیں ۔ چناں چہ حسن ترتیب
کے لیے یہ تبدیلی ناگزیر تھی ۔ یوں بھی تمام
مضامین میں اکثر و بیشتر اور اس مضمون میں تمام تر
ہجری سنین استعمال کیے گئے ہیں اس لیے عنوان میں
عیسوی صدی کی شمولیت بے جوڑ نظر آتی تھی ۔ (مرتب)

اس سے پیشتر ایک مضمون میں واضح کیا جا چکا ہے کہ مسلمان ہندی زبان میں شعر گوئی دھلی میں آباد ھونے کے بہت جلد بعد اختیار کر لیتے ھیں ۔ ھندی شعر گوئی کے محرکین میں ھم کو بزرگان ذیل کے اسمائے گرامی ملتے ھیں :

شیخ احمد نہروانی ، شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج ، نظام الدین اولیا ، بو علی شرف قلندر پانی پتی اور امیر خسرو دھلوی ۔

اس شاعری کا مدار زیادہ تر دوہروں پر تھا ۔ اردو شاعری ان ایام میں بہ‌لحاظ جذبات و زبان و اوزان ہندوستان کی دوسری زبانوں سے کچھ مختلف نہیں تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ زبان ان خصوصی خط و خال سے جو دسویں صدی کے اواخر میں اس میں نمایاں ہونے لگے اور جو حقیقت میں فارسی اوزان و جذبات کا پرتو تھے ، اس وقت تک بیگانۂ محض تھی ۔

اردو اس حالت میں تھی جب وہ حملوں اور تعلقوں کی فتوحات کی بنا پر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اپنا قدم جما لیتی ہے ۔ نویں صدی کی ابتدا میں تیموری حملے اور سلطنت دہلی کی کمزوری کی وجہ سے طوائف الملوکی کا دور شروع ہو جاتا ہے اور مختلف صوبے ، مثلاً گجرات ، مالوہ اور جونپور اپنی اپنی خود مختاری کا اعلان کردیتے ہیں ۔ قرائن اس قسم کے موجود ہیں کہ ان صوبوں میں بھی اس زبان کا جس کو ان ایام میں ہندی کے نام سے پکارا جاتا تھا ، کافی چرچا تھا ۔ مثلاً مالوے کے مشہور بادشاہ سلطان علاؤ الدین محمود خلجی (۸۳۹ھ و ۸۸۰ھ) کے ذکر میں مؤرخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ اس نے ایک قصیدہ جو ہندی زبان میں تھا ، سلطان ابو سعید میرزا (۸۵۵ھ و ۸۷۲ھ) بادشاہ ایران کی مدح میں لکھ کر بھیجا تھا ۔ فرشتہ کی عبارت یہ ہے :

''و قصیدۂ غرا کہ در مدح سلطان ایران گفتہ بود ، ظاہراً بزبان ہندی بود مصحوب شیخ علاؤالدین ہمراہ خواجہ جمال‌الدین فرستاد .... وشہنشاہ ایران ازاں قصیدہ کہ زادۂ طبع بادشاہ مالوہ بود ، چنداں محظوظ شد کہ ازہدایای دیگر آنقدر خوشحال نہ شد ۔''

اس مختصر بیان سے سلطنت مالوہ میں نہ صرف اردو کے وجود بلکہ اس کی شاعری کا بھی پتا چلتا ہے ۔

موجودہ معلومات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کو ادبی شکل سب سے پہلے صوبۂ گجرات میں ملتی ہے ۔ یہ صوبہ ۶۹۶ھ میں سلطنت دہلی کے زیر نگیں آتا ہے اور مسلمان آبادکار اس میں داخل ہوتے ہیں ۔ تقریباً ایک صدی تک گجرات دہلی کے تابع رہا ، بعد

میں آزاد ہو گیا ۔ ہم اور واقعات سے اعراض کر کے امیر تیمور کے حملۂ ہند کا ذکر کرتے ہیں جس سے سرزمین گجرات میں اردو کو بالواسطہ تقویت پہنچتی ہے ۔ تیموری تاخت کی بنا پر لوگوں کی ایک کثیر تعداد صوبۂ دہلی سے ہجرت کرکے گجرات میں جا کر آباد ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ مرأت احمدی میں مرقوم ہے :

''ہم‌درین اثنا خبر رسید کہ حضرت (صاحب) قران امیر تیمور گورگان در دہلی نزول اجلال فرمودند و فتور عظیم دران دیار راہ یافت و خلق کثیر ازان حادثہ گریختہ بہ گجرات آمد ۔ مقارن این حال سلطان ناصرالدین محمود شاہ از دہلی فرار نمودہ بہ گجرات رسید و از آنجا مایوس شدہ بہ‌مالوہ رفت ۔''

(صفحہ ۴۷ ، مرأت احمدی ، جلد اول ، بمبئی)

گویا حملۂ تیمور سے دو امر متعلق ہیں : پہلے لوگوں کی مہاجرت جس میں بعض مشاہیر اولیاء کے نام بھی ملتے ہیں ، مثلاً شیخ احمد کھٹو شیخ برہان الدین قطب عالم اور مولانا خواجگی ۔ اس ہجرت سے گجرات میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ۔ دوسرے شاہان گجرات کی سلطنت کا قیام ، یہ واقعہ بھی اس صوبے میں اردو کی آئندہ ترقی کے لیے ایک زبردست محرک ثابت ہوا ۔ مسلمان جو مختلف مقاصد سے گجرات میں آباد ہوگئے تھے ، دہلی کی زبان کو اپنے ساتھ لائے اورقومی زبان کی حیثیت سے اس پر نظر ڈالتے رہے ۔ گجرات کی زبان اگرچہ گجراتی ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث‌القوم اردو کو اپنی زبان تسلیم کر لیا ۔

عام طور پر اقلیتوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی قومیت کو غیر اکثریت سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی زبان ، مذہب اور رسوم کی سختی کے ساتھ پابند ہو جاتی ہیں ۔ یہی حالت گجرات میں مسلمانوں کی ہوئی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی ۔

قرائن اور آثار سے پایا جاتا ہے کہ گجرات میں شروع ہی سے مسلمان اردو بولتے رہے ہیں ۔ بعض مورخین و مصنفین نے مشائخ و سلاطین گجرات کے ایسے ہندی فقرے اور جملے نقل کیے ہیں جو یقیناً

اردو زبان سے علاقہ رکھتے ھیں ۔ چونکہ ان فقروں کا ذکر گزشتہ مضمون میں کیا جا چکا ھے ، میں یہاں صرف ان کی ایک مختصر تکرار پر قناعت کرتا ھوں ۔

بقول شیخ باجن یہ فقرہ شیخ یحییٰ کے متعلق گجرات میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا : ''وقت شیخ یحیٰی جیسا پڑے ویسا سہے اپنی پنڈن کسے نکہے۔'' یعنے اگرچہ تمھارا شیخ وقت شیخ یحیٰی کی طرح مستجاب الدعوات ھو پھر بھی مناسب یہی ھے کہ جو تکلیف انسان پر آئے اسے خود جھیلے اور دوسرں سے اس کا تذکرہ نہ کرے ۔ شیخ یحییٰ شیخ لطف کے فرزند ھیں اور شیخ عزیزاللہ متوکل کے والد ۔

سید برھان الدین ابو محمد عبداللہ قطب عالم (متوفی ۸۵۷ھ) کی طرف فقرات ذیل منسوب ھیں :

(۱) جسموں نے نکائی اپنے مجاریوں نے کھائی[1]۔
(۲) کیا ھے لوھا ھے کہ لکڑی ھے کہ پتھر ھے[2]۔

ان کے فرزند شاہ عالم عرف شاہ منجھن (متوفی ۸۸۸ھ) سے یہ فقرے تعلق رکھتے ھیں :

(۱) ارے میاں الولک بولتے کیوں نہیں[3]۔
(۲) پڈہ ڈوکرے[4]۔
(۳) راجن جی نکروٹے بدل نکروٹا[5]۔
(۴) جو راجن جی کا اونہ بھایا ھووے تو مجھ جیسے فقیروں کی برسوں دین کیاسی کرے[6]۔

---

۱ ۔ تحفۃ الکرام ، صفحہ ۴۸ ، جلد اول ۔
۲ ۔ تحفۃ الکرام ، صفحہ ۱۷ ، جلد اول ۔
۳ ۔ تحفۃ الکرام ، صفحہ ۸۱ ، جلد اول ۔
۴ ۔ مرآت سکندری ، صفحہ ۶۵ ۔
۵ ۔ تحفۃ الکرام ، صفحہ ۲۶ ، جلد اول ۔
۶ ۔ تحفۃ الکرام ، صفحہ ۳۱ ، جلد اول ۔

ذیل کی ضرب المثل محمود شاہ بیگڑہ (۸٦۳ھ و ۹۳۰ھ) سے علاقہ رکھتی ہے :

نیچی بیری سب کوئی جھوڑے[1]۔

یہ نمونے زیادہ تر نویں صدی ھجری سے تعلق رکھتے ھیں ۔

اردو میں اھالی گجرات کی دلچسپی کا ایک قدیم تر ثبوت مولانا فضل الدین محمد بن قوام بلخی کی تصنیفات سے بھی ملتا ہے جو قصبۂ کڑی واقع گجرات کے باشندے ھیں ۔ مولانا فضل الدین اپنی تصنیف 'شرح مخزن اسرار' میں جو ۷۹۵ھ کے بعد لکھی گئی ہے ، فارسی کے بعض الفاظ کے اردو مرادف بتلاتے ھیں ۔ ان کی فرھنگ 'بحرالفضائل' میں جو ۸۳۸ھ میں تالیف ھوئی ہے ، تین سو سے زیادہ اردو الفاظ ملتے ھیں جو مختلف فارسی و عربی الفاظ کی تشریح کی غرض سے بیان ھوئے ھیں ۔ اس کے علاوہ مؤلف ھندوستان کے جغرافیے ، نجوم ، ماہ و سال ، موسیقی ، اوزان اور پھولوں پر بھی مختصر مختصر اطلاع دے رھا ہے ۔ سب سے آخر میں ایک باب دیا ہے ، جس میں بعض ایسے ھندی الفاظ کا ذکر کیا ہے جو ھندی شاعری میں کارآمد ھیں ۔ مولانا کے اصل الفاظ یہ ھیں :

''باب چہارم در بعض الفاظ ھندوی کہ در نظم ھندوی استعمال کنند ۔[2]''

ان امور سے واضح ہے کہ گجرات میں ان ایام میں یعنی فرھنگ بحرالفضائل کی تالیف کے وقت ھندی یعنی اردو میں عام طور پر کافی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا تھا ۔

گجرات میں ھندی نظم کے ابتدائی حامیوں کے نام اور حالات سے ہم قطعاً تاریکی میں ھیں ، اگرچہ ہم جانتے ھیں کہ نظم وھاں موجود تھی ۔ چناں چہ بحرالفضائل میں ایک شعر ملتا ہے :

دیکھ کہ پیکہ پی پر گھر جاوے
تس نس نینو نیند نہ آوے

---

۱ ۔ مرأۃ سکندری ، صفحہ ۱۱۱ ۔

۲ ۔ دیکھئے مقالہ گزشتہ بہ عنوان فارسی زبان کی ایک قدیم فرھنگ میں اردو زبان کا عنصر ۔

شیخ باجن کے ایک مختصر بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عطاالله الملقب به شیخ رن جو شیخ رکن الدین کان شکر (متوفی ۸۴۲ھ) کے مرید ہیں ، ہندی نغمے اور موسقی کے لیے مشہور تھے ۔ باجن کہتے ہیں :

''و پسر شیخ نصرالله بندگی شیخ عطاء الله بندگی الملقب به شیخ رنن که ایشاں در علم موسیقی و در جمیع علومہا دانشمند بودند که سرود ہاے ایشاں در عالم خدا ظہور مشہور و مقبول اند ۔''

شیخ رنن کے والد شیخ نصرالله ، شیخ عزیز الله متوکل کے بڑے بھائی ہیں ۔ رنن شیخ عطاءالله کا تخلص معلوم ہوتا ہے ۔ مسلمان ہندی گو شعرا اکثر اوقات ہندی تخلص بھی رکھ لیا کرتے تھے ۔

شیخ بہاءالدین باجن

شیخ باجن نویں صدی ہجری کے منتصف دوم سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کا نام بہاؤالدین بن معزالدین اور تخلص باجن ہے ۔ باجن کا ترجمه موسیقی ساز یا باجه ہے ۔ شیخ باجن ایک رسالے کے مصنف ہیں جو ان کے پیر شیخ رحمت الله بن شیخ عزیز الله متوکل اور ان کے اسلاف کے حالات نیز فقر و تصوف کے بیانات پر شامل ہے ۔ یه رساله بد قسمتی سے ناقص الطرفین ہے اس لیے مجھ کو اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا ۔

مختلف کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے که شیخ باجن اپنے زمانے میں کسی قدر شہرت کے مالک تھے ۔ صاحب 'خزینۃالاصفیا' کے نزدیک شیخ عزیز الله متوکل شیخ باجن کے پیر ہیں ۔ چناں چه لکھا ہے :

''شیخ عزیز الله متوکل قدس سره پیر شیخ باجن است که پیر شیخ علی متقی است ۔'' (صفحه ۴۱۱ ، جلد اول)

لیکن شیخ باجن بار بار اپنے رسالے میں شیخ رحمت الله[1] کو اپنا پیر بیان کرتے ہیں جس سے کسی قسم کے شبہے کی گنجائش نہیں رہتی ۔ شیخ باجن کے حالات بد قسمتی سے کسی تذکرے میں نہیں ملتے ۔

۱ ۔ شیخ عزیزالله متوکل کے فرزند تھے ۔ ۸۹۷ھ میں فوت ہوئے ۔ (مرتب)

ان کی تصنیف سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی متورع اور متقی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کے والد معز الدین سات مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے ہیں ، جن میں سے پہلے تین حج انھوں نے تنہا ادا کیے ہیں ، باقی چار حج اپنی والدہ ماجدہ کی معیت میں کیے ہیں ۔ اس کے علاوہ بیت المقدس و دیگر مقامات متبرکہ کی بھی زیارت کی ہے اور آخر میں شہادت پائی ۔ باجن فرماتے ہیں :

''پدر این فقیر هفت بار حج کرده بود (ند) ۔ سه حج اول تنها رفته بودند ، چون باز آمدند دوم بار برکاب خدمت والدۂ خود رفتند و چهار حج دیگر کردند و یک حج اکبر یافتند و در مدینۂ مبارک بزیارت سلطان المرسلین و در قدس و خلیل زیارت پیغامبران پیاده رفتند و (به) برکت آن حجها موت شهادت یافتند ۔''

شیخ باجن نے اپنے ایک بھائی کا بھی ذکر کیا ہے ؛ ان کا نام شیخ میناں تھا اور شیخ رحمت اللہ سے ارادت رکھتے تھے ۔ باجن کے ایک اتفاقیہ جملے سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے جنوب میں جزیرۂ سیلان تک اور شمال میں سرحد ایران تک سفر کیا ؛ کہتے ہیں :

''این فقیر تا طرف سنده قریب خراسان و طرف دکن تا قریب سرحد سیلان مسافر بود ۔''

وہ شادی آباد (منڈو) بھی گئے ہیں اور شیخ عزیز اللہ متوکل کے مزار کی زیارت کر آئے ہیں ۔ صاحب مرأت احمدی نے شیخ علی متقی کے ذکر میں دو مرتبہ شیخ باجن کا ذکر کیا ہے ۔ پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ علی متقی کو بہ عمر ہشت سالگی ان کے والد شیخ باجن کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور انھیں شیخ کی بیعت کرائی ۔

''پدر او در اوان هفت هشت سالگی به خدمت شیخ باجن چشتی برده مرید ساخت ۔'' (صفحه ۵٦ ، جلد دوم)

دوسری بار اس موقع پر ذکر کیا ہے جب شیخ علی متقی

جا کر شیخ باجن کے فرزند شیخ عبدالحکیم کے مرید ہوتے ہیں ۔

''بعد ازاں جاذبۂ عنایت الٰہی در رسید و حقارت دنیا در نظر آمد ، در خدمت شیخ عبدالحکیم بن شاہ باجن رسیدہ خرقۂ خلافت چشتیہ پوشیدہ جانب دیار ملتان سفر کردہ ۔'' (صفحہ ۵۶ ، جلد دوم)

محبد الکرام سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شیخ باجن کا مزار برہان پور میں ہے ۔ شیخ قطب محمد بن شیخ حسن محمد حسنی کے ذکر میں مرقوم ہوا ہے کہ :

''شیخ قطب محمد طرف برہان پور سکونت ورزیدہ بداعجا برحمت حق پیوستہ قبر نزدیک روضۂ شیخ باجن واقع است۔''

(صفحہ ۹۴ ، جلد اول)

حسب روایت تذکرہ گلزار ابرار باجن ۹۱۲ھ میں وفات پاتے ہیں ؛ جیسا کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست فارسی مخطوطات[1] مرتبۂ آئیو ناف میں درج ہے ۔

شیخ باجن کی تصنیف پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان ان کے ہاں زیادہ تر ہندی طرز تخیل و تکلم کے تابع بنا دی گئی ہے ۔ وہ ہندی میں سوچتے اور بولتے ہیں اور اسی لیے ان کی تحریر میں ہندی محاورات اور اسلوب کا پر تو موجود ہے ۔ ہندوستانی فارسی اسی چیز کا نام ہے ۔ اس عہد کے اکثر ہندوستانی بالخصوص جماعت صوفیہ کے ہاں اسی قسم کی فارسی لکھی جاتی تھی ۔ ان کی تحریر نہایت صاف ، سلیس اور سادہ ہے۔

اردو کا قاعدہ ہے کہ تعظیماً و تکریماً ایک شخص کا ذکر بہ صیغۂ جمع لاتے ہیں ، باجن کے ہاں یہ قاعدہ بالکل عام ہے ، مثلاً :

(۱) ''بندگی شیخ عبداللطیف عرضداشت کردند کہ ہم ازین معنیٰ پیش ازیں درخواست کردہ بودیم کہ شما راست بدانید کہ ما راست میگوئیم ۔''

---

۱ ۔ فہرست مخطوطات ، صفحہ ۱۰۱ ، ۱۹۲۴ء ۔

(۲) ''شیخ نظام الدین اولیا خوش شدند؛ آب وضو که در طشت بود عطا فرمودند و بر هر دو گوش شیخ عبداللطیف مالیدن گرفتند ۔''

ان کے ہاں بعض بالکل ہندی محاورے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً 'دب کردن' به معنی دفن کردن مثال:

''بعد مردن گاؤ را فرمایند که در زمین دب کنند ۔''

آئندہ جملے میں رھائس به معنی رھائی استعمال ہوا ہے:

''سبب دختران رھائس خود میکنند ۔''

بہ حیثیت فارسی نگار شیخ باجن کسی بلند رتبے کے مستحق نہیں ہیں، مگر وہ دونوں زبانوں یعنی اردو اور فارسی میں شعر کہتے ہیں، نہ ان کی شاعری بلند پایہ ہے؛ تا ہم دیگر شعرای متصوفین کی طرح انھوں نے شعر کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا آلہ بنا لیا ہے ۔ ہندی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کثرت سے شعر کہے ہیں ۔ اسی فارسی تالیف میں جس کا کئی بار ذکر آ چکا ہے، موقع بہ موقع ۵۰ـ۶۰ سے زیادہ ہندی دوھرے اور نظمیں منقول ہیں جو سب انھی کی طبع زاد ہیں ۔ ہم ان کی فارسی سے قطع نظر کر کے ان کے ہندی کلام کی طرف توجہ دیتے ہیں ۔

ان ایام میں قاعدہ تھا کہ ملکی زبانوں کو مختلف صوبوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، چناں چہ امیر خسرو دہلوی نے اسی طرح ان کا ذکر کیا ہے، یعنی زبان سندھ، لاھور، کشمیر، ڈوگر، دھور سمندر، تلنگ، گجرات، معبر، گوڑ، بنگالہ، اودھ، دھلی ۔ اس لحاظ سے دھلی اور اس کے علاقے کی زبان دھلوی کہلائی ۔ یہ نام ھمارے عہد تک باقی رھا ہے ۔ نواب میرزا داغ دھلوی کا شعر ہے:

احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن اترتا بہ زبان دھلی

ابوالفضل بھی آئین اکبری میں دھلی کی زبان کو اسی نام سے یاد کرتا ہے لیکن شیخ باجن پہلے شخص ہیں جو زبان دھلوی کا

نمونہ دیتے ھیں ۔ وہ اس کو ھندوی کے نام سے بھی پکارتے ھیں ، جس سے صاف ظاھر ھے کہ ان کے نزدیک ھندی اور زبان دھلوی ایک ھی چیز ھے ۔ ان کی تصنیف میں دنیا کی مذمت میں ایک چھوٹی سی نظم ھے جو اس عنوان سے شروع ہوتی ھے :

''صفت دنیا بہ زبان دھلوی گفتہ''

اور نظم حسب ذیل ھے :

یہ فتی کیا کسے یہ ملی ھے   جب ملتی ھے تب چھلتی ھے
اول آن جھل بہت جھلائے   آن چھوھری بہتی کھائے
آن رو کر بہت رولائے

یہ فتی کیا کسے یہ ملی ھے   جب ملی ھے تب چھلتی ھے

[بیں دوم]

آن بہت گھرے پیارے   جے اس ملکے وے انہ چھارے
جبے رھے اس بھیے تارے   وے جائے اس بھی پارے
جبے اس کارنہ تپنہ درسنہ   جے چکہ ملے تو اس سنہ بلسنہ
یہ فتنی انھوں سپاوے   چکہ پاس انھوں نہ آوے
جبے اس کدھی نہ لوریں   جے چکہ ملے تو بھی اس چھورنہ
جبے دیکھہ اس تھیے بھاگے   یہ نیلج ان سنہ لاگے
[تخلص] دیکھ باجن یہ تو جھوٹی   سکہ میٹھی چب نیٹھی
یہ اھے ایسی دھیتی   یہ کیا کسے یہ ملتی ھے

اس زبان کو شیخ باجن زبان دھلوی کہتے ھیں ۔ میں اسی تالیف سے ایک اور مثال دیتا ھوں ۔ اصحاب صفہ کے متعلق شیخ باجن روایت کرتے ھیں کہ جنگ میں جاتے وقت یہ لوگ لشکر اسلام سے آگے آگے چلتے تھے لیکن لڑائی سے واپسی کے وقت سب سے پیچھے پیچھے آتے تھے ۔ ان کی تعریف میں فرماتے ھیں :

''مناقب حضرت ایشاں بہ زبان دھلوی نبشتہ شدہ است'' عقد

چب راوت جھوجھن جاونہ   سب توں آ گیں ھووا جائیں

جھوجھہ کر باھر نہ [آونہ] تب توں پچھیں ھووا آئیں
باجن برو وھی جو خدا فرمایا محمد کی کافر نہ سوں دندلایا

ایک مناجات لکھتے وقت اسی زبان کو ھندوی کے نام سے یاد کرتے ھیں ۔ چناں چہ :

''و این مناجات بہ زبان ھندوی گفتہ شدہ است ۔''

ترے پنتہ کوئی چل نسکھے جو چلے سو چل چل تھکے
پڑہ پنڈت پونھی دھویاں سب جان سدہ بدہ کھویاں
سب جوگیوں جوگ بسارے سبہ نپشی تب بکارے
ایک درستی درسن بھولی سر نانگے ہانوہ کھلے
ایک سیوری ھوے سیو کرنہ ھوئی تپئی کیا دکنہ دھرنہ
ایک درویش ھوئیکر آئے ھوی قلندر روپ بھرائے
ایک ابدال ھوے اب دھوتی ایک ھاندہ ھا ھا ھوتی
ایک کھلی ھوئی دوانی ایک بادل ھند رانی
ایک راتی ماتی ھوے ارراون [بن] پی پے سدہ ھو ھو جاونہ
ایک چنگم جٹا دھاری ھور ھندونس اندھیاری
ایک کاہری ھوی کر کنپہ سند سیو تجھے چنپہ
ایک اہاسی راتنہ جاگنہ ھوے بھکاری تجھے مانگنہ
یوں ٹولی ٹولی ھوے کرے سبہ رل رل کھل کھل کھوی کرے
دے مکت منے ایوے دیکھے آرے باجن توں کس لیکھے

اب ظاھر ھے کہ دھلوی اور ھندوی شیخ باجن کے نزدیک ایک ھی چیز کے دو نام ھیں ۔ وہ اس امر سے بہ خوبی واقف معلوم ھوتے ھیں کہ یہ زبان جس میں وہ طبع آزمائی کر رھے ھیں ، اصلاً دھلی سے علاقہ رکھتی ھے ۔

باجن ایک موقع پر ایک ریختہ بھی دیتے ھیں جو حسب ذیل ھے ۔

ریختہ

یہ صوفی سرّ الٰہی ایں مرتبہ دارد شاھی
یہ مظہر عین خدائی

دراں مجلس کہ مظہر عین خدا باشد   آنجا عین شن خدا باشد
آنجا بارد رحمہ اللہ

آنجا ساقی رسول اللہ   آنجا روی تو شین اللہ
آنجا ہمہ اللہ باشد نہ عمر اللہ

یہ ریختہ زیادہ تر گیت کے مشابہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہاں اصطلاح کا استعمال نہایت قدیم ہے۔

یہاں بعض اور مثالیں باجن کے کلام کی دی جاتی ہیں:

محمد سرور نرم کا رحمہ اللہ بھریا
باجن جیوڑا وار کر سر آگیں دھریا

دیگر

باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے
اس سے درجن بھر نھر کانپے
نعمت علی اس سے پائی
میں جیاں (کدا) انکھاں جاری نکھائی

دوھرہ

باجن وہ کسی سریکھا نہیں اور اس سریکھا نہیں کوے
جیسا کوئی من منہ چت دے ویسا ہی ہوے

دوھرہ

مجھ ایک روپ اور بھانت بہت دیکھ عاشق شیدا ہوے
باجن ایکی ایک سریکھا ناہیں سمہ گئے جوے جوے

دیگر

نہ انہ جیانہ وہ جایا   نہ وہ مای باپ کیلایا
باجن سبہ انہ آپ نہ پایا   ہر گھٹ ہوا پر آپ لکایا

دوھرہ

بھونرا لیوے پھول رس رسیا لیوے باس
مالی سنچے آس کر بھونرا کھڑا اداس

دوهره

باجن میں بچھوڑا جس کوں هووے
پانی رووے سمه کوئی وه لوهو رووے

دیگر

جب مندل منه منه دهمکے یه رباب رنگ میں کھمکے
یه صوفی انه پر رقصے

دیگر

روزے دهر دهر بمار گزاری دیتی فرض زکلوه
بن فضل تبرے چھوٹک ناهیں آگیں بکھمن باٹ

دیگر

عقده در پردهٔ کدارا :

مصطفیٰ جگ کا موهن رے

کاندھے سوھے[1] کانبلی سر پر سوھے تاج
لب کب آوے نبی محمد تمه کارن معراج

دوهره

باجن پرنه درویش کی جس دیوے کرتار
اس جگ میانے راج کرے اَس جگ انرے پار

دوهره

گور اندهیاری ڈربڈا باجن کھڑا مفلس
هیڑا[2] کانپے جیو ڈرے یه دکه آکھوں کس

دوهره

باجن ناده تلهرا بندهیا بہتی بهار
آگیں دریا ڈراونا کیوں اتریسی پار

---

۱ ۔ هندی مصدر سوهنا به معنی سجنا و پهبنا ۔ (مرتب)
۲ ۔ جسم ۔ (مرتب)

دیگر

باجن جنہ روی اپنے پاپ دھوے
نینہ پانی نا رہیا تب لو ھو رووے

دیگر

روج جو آھے پاپنہ دھونا
ھس ھس رووے ایسا رونا

دیگر

کھر انگن حنگل ڈونگر[1] باحن من یکساں
کھر باھر بوھی رکھوالا نکھواں [نیرا نابومیرا تروے ری]
سبہ باتوں کا رکھوال اوگھٹ گھاٹ اتارن ھار
[نیرا نانو] میرا تروے ری
نکت دونگر پکھیں کانٹیاں پاگ بسں حس ٹھاؤں
سبہ بن کھنڈ کا توں ھی راحا واری نیرے حانوں

---

۱ ۔ ڈونگر راجستھانی زبان میں پہاڑ کو کہا جاتا ہے ؛ گجرات میں بھی رائج ہے ۔ گو ف رمانا ملتانی زبان میں نہیں ملتا لیکن خواجہ غلام فرید کے دیوان میں جابجا نظر آتا ہے ۔ حند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔ میرے پیش نظر ان کا وہ دیوان ہے جو ۱۳۴۳ ھ میں لاھور پرنٹنگ پریس میں چھپا تھا :

"رلدی روہ ڈونگر وچ" (کافی نمبر ۲۷ ، ۲۸)
"ڈونگر او کھیا گھٹیاں" (کافی نمبر ۱۱۶)
"روہ ڈونگردیاں او کھیاں گھٹیاں" (کافی نمبر ۱۵۰)
"لکھ ڈونگر او کھیاں گھاٹیاں" (کافی نمبر ۱۶۲)
"او کھیاں گھاٹیاں ڈونگر کالے" (کافی نمبر ۲۲۰)
"ڈونگر کالے بیریں چھالے" (کافی نمبر ۲۳۰)

(مرتب)

دیگر

کن کن ابھرن موندری دے پرم پیالا پیا
باجن جے کچھ کھٹیا سبہ کلالن لیا

دیگر

راول دیول ہم نجانا پھاٹا پہنہ روکھا کھانہ
ہم درویشنہ ایہی ریت پانی لوڑیں[1] ہور مسیت
بیٹھے آچھیں ٹھنڈی چھانو جو کجھ دیوے سو ھی کھانو

دوھرہ

باجن کوئی نجانے وہ کد ہوا او کد ہوے پرگٹ[2] ھووا
وھی جانے آپ کوں جب تھے پرگٹ ھووا

عقدہ

یہ جیو دیسوں یہ جیو دیسوں
سبہ؟ بر ھرتمہ سوں بھوگ کریسوں

پین اول

یہ جیو پیارا آھے منجہ تیرے تائیں
بھیٹ تمھارے کروں گسائیں
باجن جیو تمھارے تائیں
جیو جیوا ھے توھیں گسائیں

دیگر

باجن زھد ریائی کچھ کام نہ آوے
جب وہ بنجے ھات منہ اک جونپاوے

---

۱ - لوڑنا بہ معنی ضرورت رکھنا ؛ پنجابی میں اب بھی رائج ھے ؛ حاصل مصدر لوڑ ھے - ھندی میں اس کی شکل لوڑھنا ھے جس کے معنی چاھنے اور خواھش کرنے کے ھیں - (مرتب)

۲ - پرگت یا پرگٹ بہ معنی ظاھر و آشکار - (مرتب)

دیگر

باجن حیو آمر ہے موا نکھیو کوے
جے کوئی موا کہے وهی موا ہوے

عقده

راجے کے دربار سگل رات بھرے پر نہ
سدر سدر دیورے ملمہ رن بن پنکھڑی کرل کرنہ

عقده

ایک آپس حاگہ اورنہ بھی حگاونہ
بھرے بھرے سد سناونا
الک النک بیٹھی ہس حوکناں
حاکو لوکا حاتی راب

دوهره

سبہ رس پانی بیچے جیوں جاے سہ کوے
جس رس بیچے پانی وہ رس کیسا ہوے

اس موقع پر ان اشعار کی زبان کی بعض خصوصیات کا تذکرہ بے موقع نہیں ہوگا ۔ ان ایام میں اردو زبان کے امتیازی خط و خال جو دوسری زبانوں سے اسے ممیز کر سکیں ، صرف معدودے چند ہیں یعنی یہ کہ اس زبان میں مسلمانی جذبات و خیالات ہوں ، اس میں ایک حد تک عربی و فارسی الفاظ کا عنصر موجود ہو ، اس کی صرف ونحو ایک خاص اصول و قواعد کی پابند ہو ۔ یہ امور باجن کی زبان میں موجود ہیں ۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض عربی و فارسی الفاظ اس زبان میں ہندوستانی صرف کے طریق پر لائے گئے ہیں ، مثلاً کافر ، عاشق و درویش بہ حالت جمع کافرنہ ، عاشقنہ اور درویشنہ بنائے گئے ہیں جو برج کے مطابق ہے ۔ عربی رقص سے ہندی مضارع رقصے بنا لی گئی ہے ۔ فارسی لفظ میاں (درمیاں) سے بہ قاعدۂ صرف میانے

کر لیا گیا ہے ۔ اسی طرح مسجد اور نگہبان کو مسیت اور نگہوان لکھا گیا ہے ۔ روزے دھرنا اور نماز گزارنا فارسی روزہ داشتن اور نماز گزاردن کا ترجمہ ہے ۔

جمع مضارع میں رائج الوقت شکل کے علاوہ ایک اور جمع ہے جو اب اردو سے بالکل متروک ہے؟ یعنی دھرنہ (دھریں) ، کرنہ (کریں) ، بلسنہ (بلسیں) ، ترسنہ (ترسیں) ، تپنہ (تپیں) ، پرنہ (پریں) ، جاگنہ (جاگیں) اور مانگنہ (مانگیں) جو پنجابی جمع سے مطابق ہے ۔

مستقبل میں صیغۂ واحد متکلم کریسوں (کروں گا) ، دیسوں (دوں گا) اور واحد غائب اریسی (اترے گا) اکثر مستعمل تھا ۔ پنجابی طرز کی جمع کانٹیاں (کانٹے) ، انکھاں (آنکھیں) کے ساتھ ساتھ برج کی جمع کلالنہ (کلالوں) ، درویشنہ (درویشوں) پاپنہ (پاپوں) راتنہ (راتوں) اورنہ (اوروں) کثرت کے ساتھ آ رہی ہے ۔

بعض الفاظ کی قدیم شکلیں یہ ہیں :

جے = جو ، تھے = سے ، آہے[1] = ہے ، منہ یا منیں = میں (ظرفیہ) ، آپیں = آپ ، چکھ = کچھ ، آگیں = آگے ، سریکھا = سریکا ، لہنا = لینا ، چھوٹک = چھٹکارا ، پہلوں = پہلے ، منجھ = مجھ ، اب دھوتی = اب دھوت ، نیلج = نرلج ۔

باجن کے ہاں برج کی تمام جمع مثلاً کلالن ، لوکن اور تمام جمع مضارع یعنی دھرن ، کرن وغیرہ ، نیز اکثر مصدر اور ایسے الفاظ مثلاً تم ، اں ، جن ، نین ، بابوں ، لین ، دین وغیرہ بالعموم ایک ہائے مختتمہ پر ختم ہوتے ہیں ۔ ہندی اصوات کے لیے اس نسخے میں خاص علامات موجود نہیں ، البتہ حرف مشدد کو دوبار لکھا گیا ہے ۔ مثلاً لیّا ، لییا ، میرّا ، میررا ، اڑّانا ، اررانا وغیرہ ۔

یہ خصوصیت بحرالفضائل کے نسخے میں بھی موجود ہے جو بہ ظاہر نویں صدی ہجری کا نوشتہ ہے ۔

۱ ۔ سندھی زبان میں اب بھی ''آہے'' استعمال ہوتا ہے ۔ (مرتب)

باجن کا کلام ھندی اوراں میں ہے - دوھرے جو چوبیس ماترے پر حتم ہوے ھیں ، نہایت عام ھں - دوسرے اوزان بھی موجود ھیں - رائد اشعار کی صورت میں ابتدائی شعر جو متحد القافیہ ھونا ہے ، عقدہ کہلاتا ہے - بعد کے بند تین تین یا چار چار ھم قافیہ مصرعوں پر شامل ھوتے ھیں اور پین کہلاے ھیں - آحری بند جس مں تخلص لایا جاتا ہے ، مخلص کہلاتا ہے - نطم کی اس وسم کی نقسیم صوبۂ گجرات میں دیر تک رھی ہے -

قاضی محمود دریائی

قاضی صاحب گجرات کے مشاھیر صوفیہ سے ھیں - ھندی شعر گوئی میں ان کی شہرت نہ صرف گجرات تک محدود رھی ہے بلکہ ھندوستان مں بھی پھیل چکی ہے - ایک خاص طرز کی نطم کے سلسلے میں جس کو 'حکری' کہا جاتا تھا ، ان کا نام خصوصیت سے زبان زد عام ہے - 'جکری' مجالس حال و قال و عرس میں قوال پڑھا کرتے تھے - ایک زمانے میں قاضی صاحب کی حکریاں تمام گجرات میں مقبول تھیں - اخبارالاخیار میں منقول ہے :

''جکریهائے وے که بزبان ھندی دارد دستور قوالاں آن دیار است نعایت مطبوع و موثر و بے تکلف و آثار عشق و وجد از سخنان وے لائح است -'' (اخبارالاخیار ، صفحہ ۱۸۷)

علاؤالدین ثانی برناوی اپنی تصنیف 'کتاب چشتیہ' میں شیخ علاؤالدین کی 'علائیوں' کے ذکر مں (جو ایک خاص قسم کی متصوفانہ و عاشقانہ نطم ھوتی تھی) مثالاً قاضی صاحب کی جکری کا بھی ذکر کرتے ھیں اور لکھتے ھں :

''کلام مقبول او به مثل حکری قاضی محمود هر که می شنود برحمت او آفرین می ستود -'' (ورق ، ۳۳۹)

تحفۃالکرام میں مذکور ہے :

''از غلبات عشق پیوسته بحسب حال عاشقانه بهندی بطرز دلبندی می بست -'' (صفحہ ۸۰ ، جلد اول)

صاحب خزینۃ الاصفیا لکھتے ھیں :

''اشعار عاشقانه بزبان ھندی فرمودے که موالان آن دیار بوقت سماع اشعار آنجناب بمجلس اصفیا مىخوانند و بغایت موثر می باشند ۔''
(صفحه ۸۰ ، جلد دوم)

یہاں 'جکری' کے متعلق چند الفاظ لکھنے مناسب معلوم ہوتے ھیں ۔ 'جکری' دراصل 'ذکر' کی بگڑی شکل ھے ۔ اس کا اطلاق ایسی نظموں پر ھوتا ھے جن میں اور مضامین کے علاوہ سلسلے کا شجرہ اور مشائخ کی مدح ھوتی تھی ۔ نظام الدین اولیا (متوفی ۷۲۴ھ) کے عہد میں بھی جکری کا رواج تھا اور ان کو مولانا وجیه الدین کی جکری پر حال آیا تھا جو حسب ذیل ھے :

''بِنا بِن تِھا جی ایسا سکھ سے باسوں ۔''

اس سے ظاھر ھے که جکری بھی قدیم سے ھے ۔

به قول صاحب کتاب چستیه بعض راگ جکری کے ساتھ مخصوص ھیں ، یعنی للت ، بلاول ، دیساکھ ، ٹوڈی ، سیام بیراری ، دھناسری ، اساوری ، دیوگیری ، پوربی ، کلیان ، کانھڑا ، بھاکرہ اور گنڈ ۔

قاضی محمود بیر پور کے باشندے ھیں ؛ خرقه انھیں اپنے والد سے ملا تھا ۔ ایک عرصے تک احمد آباد میں رہے ۔ ۹۲۰ھ میں به قول مرأت احمدی وہ اپنے وطن بیر پور لوٹ گئے جہاں ۹۴۱ھ میں انتقال کیا ، لیکن مجمع الاولیا اور خزینۃالاصفیا میں ان کی تاریخ وفات ۹۲۰ھ درج ھے ۔

قاضی محمود کی طرف مختلف کرامات منسوب ھیں ۔ ان کو دریا کے مسافروں کا ولی مانا جاتا ھے اور اسی لیے ان کو بحری کہا جاتا ھے ۔ ان کے ماننے والوں کا اعتقاد ھے که تباھی زدہ جہاز و کشتی کے لوگ ان کا نام لے کر سمندر کی تباھی سے بچ جاتے ھیں اور به خیر و عافیت ساحل پر پہنچ جاتے ھیں ۔

مجھے افسوس ھے که میں سردست قاضی صاحب کا نمونۂ کلام یہاں درج کرنے سے قاصر ھوں ۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (متوفی ۹۷۳ھ)

سید احمد کبیر[1] رفاعی کی اولاد میں ہیں اور قطب عالم شاہ ابراہیم بن شاہ عمر الحسینی الاحمدی کے فرزند ہیں ۔ ۱۴ جمادی الاول ۹۷۳ھ کو وفات پاتے ہیں ۔ ان کی نظموں کا مجموعہ جو زیادہ تر تصوف کے رنگ میں ہے ، ''جواہر اسرار اللہ'' کہلاتا ہے اور اسی مجموعے کی بنا پر ان کی شہرت باقی ہے ۔ مرآت احمدی کے مصنف محمد حسن شاہ صاحب کی تصنیف کا پایہ شیخ مغربی[2] کے دیوان فارسی کے برابر مانتے ہیں ؛ ان کے الفاظ ہیں :

''دیوانے دارد بہ زبان ہندوی در روش و معنی برابر دیوان مغربی است ۔'' (صفحہ ۱۴ ، جلد دوم ، مرآت احمدی)

جب شیخ بہاء الدین برناوی گجرات تشریف لے جاتے ہیں ، احمد آباد میں شاہ علی جیو کے مہمان ٹھہرے ہیں ۔ شاہ صاحب نے ایک روز انہیں اپنا ہندی کلام جو مختلف بحور و اوزان میں تھا ، سنایا ؛ شیخ نے بہت پسند کیا ۔ اس پر شاہ علی محمد نے اس دیوان کا ایک نسخہ تحفۃً شیخ کی خدمت میں پیش کیا جو آیات کلام پاک و احادیث رسول سے محشی و مزین تھا ۔ شیخ علاء الدین ثانی جو شیخ بہاء الدین برناوی

۱ ۔ سید احمد کبیر ابن سید ابوالحسن علی ابن سید یحییٰ ابن سید ثابت ابن سید حازم ابن سید احمد ابن سید حسن اپنے جد کی نسبت سے رفاعی مشہور ہیں ۔ ۵۱۲ھ میں شہر واسط میں پیدا ہوئے اور ام عبیدہ میں ۵۷۸ھ میں وفات پائی ۔ تاریخ ولادت (جاوید سرالرب) سے برآمد ہوتی ہے اور تاریخ وفات (للہ جاوید سرالرب) سے ۔ (صفحہ ۶، ۷ ''ترجمۂ حکیم رفاعیہ'' مترجمہ گیلانی زادہ السید محمد سیف الدین طبع استنبول ۱۳۰۲ھ)

۲ ۔ نام محمد شیرین ہے ، نائن کے رہنے والے ہیں ، ۸۰۹ھ میں وفات پائی ۔ تقی اوحدی نے سال وفات ۸۰۷ھ بیان کیا ہے ۔ آپ شیخ اسماعیل سیسی کے مرید ہیں اور فارسی کے نہایت مشہور صوفی شاعر ہیں ۔

کے جانشین ھیں ، اپنی تالیف 'کتاب چشتیہ' میں جو ۱۰۶۵ھ و ۱۰۶۶ھ کی تصنیف ہے ، تحریر کرتے ھیں کہ یہ نسخہ اب تک ھمارے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ ان کے الفاظ ھیں :

''آں متصوف صادق شعار اشعار واثی هندویهٔ خود را که به زبان گجرات و در بحر عجیب پر لذات جمع کرده بود ، به حضور آن مخدوم با شعور از سر حبور برخواند و انصاف طلبید ۔ این امام تمام کلام لدائذ انجام شیرین کام را به وجه احسن به پسندید و آن رسالهٔ مجلد که در وے تمام جھولنه و نکات موحدانه مندرج بودند و بآیات و احادیث موافق ساخته محشی کردند نسخهٔ هندویه بایں قدوهٔ چشتیه گزرانیدند که تا امروز آن رساله یادگار ازاں بزرگوار در اجزاے اوراق آن مهرضیای صاحب وفاق باقی است ۔''

(کتاب چشتیہ ، ورق ۳۳۵)

شاہ علی محمد کا نقش نگیں 'اللہ باقی محمد ساقی' تھا جس کو بہ شکل برگ تنبول کندہ کرایا گیا تھا ۔ جب مریدوں کو شجرہ عنایت ہوتا تھا اس پر اس کی مہر[1] لگائی جاتی تھی ۔

''جواھر اسرار اللہ'' کی دو اشاعتیں ھیں ؛ پہلی اشاعت جو غالباً مصنف کی زندگی میں تیار ہو چکی تھی ، ان کے مرید شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی نے کی ہے ۔ اس اشاعت پر ذیل کا مختصر دیباچہ درج ہے :

'' . . . . . . .میگوید بنده فقیر حقیر که یکے از کمینه مریدان و خاکروبان حضرت رب العالمین بندگی حضرت قطب الاقطاب العالم . . . . .تاج الافراد سلطان العارفین غوث الاعظم الشریف سلطان سیدی معشوق الله الحسینی الرفاعی رضی الله عنه المسمی به شیخ حبیب الله[2] ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی کان الله له که چند مکاشفات حضرت بندگی سیدالسادات سیدی و شیخی شیخ العالم الشریف شاه علی جیو معشوق الله مدظله ابن شاه ابراهیم ابن شاه عمر

۱ ۔ کتاب چشتیہ ۔ ۲ ۔ کذا ۔

الحسینی الاحمدی رضی اللہ عنہم کہ آن حضرت یک لسان لسان دربار جوہر نثار بزبان مبارک فرمودہ بود ، دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ و آن ملفوظ حضرت سلطان العالم شاہ علی محمد معشوق اللہ المبادت جواہر اسراراللہ را بکتاب جواہر اسراراللہ نام داشتہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دوسری اشاعت کے مالک مصنف کے نبیرہ سید ابراہیم ابن شاہ مصطفیٰ حسب اللہ ابن شاہ علی محمد ہیں جو آپ کے مرید بھی ہیں۔ اس اشاعت کا دیباچہ ایک طویل الذیل عربی عبارت سے شروع ہوتا ہے ، اس کے بعد فارسی دیباچہ آتا ہے جس میں سید ابراہیم کہتے ہیں کہ مجھ سے بعض دوستوں نے کہا کہ جواہر اسرار اللہ کا دیباچہ جو ابو الحسن[1] شیخ محمد العریسی الاحمدی نے لکھا ہے ، نہایت مختصر ہے ، آپ اس پر نیا دیباچہ لکھیے ۔ میں نے اس فرمائش کی تعمیل کردی ہے اور آن حضرت کے حکم سے اس کو ابواب میں مرتب کر دیا ہے اور وہ قصیدہ[2] بھی درج کر دیا ہے جو ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان نے آن حضرت کی مدح میں لکھا ہے ۔

---

۱ - مولوی عبدالحق اڈیٹر رسالۂ اردو نے ان کا نام ابن الحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان العریسی الاحمدی دیا ہے (دیکھو رسالہ اردو صفحہ ۴۵۱ ، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۸ء) لیکن 'ابوالحسن' بجائے 'ابن الحسن' زیادہ صحیح ہے کیوں کہ اشاعت دوم میں سید ابراہیم نے دو مرتبہ ابوالحسن لکھا ہے ۔ اس کے علاوہ ابوالحسن نے اپنے قصیدے میں بھی یہی کنیت دی ہے ۔ چناں چہ :

گرچہ شعرای ذکر مستند از جام خضر
بوالحسن خواهد ز فیض بادۂ کو عم رواست

۲ - قصیدے کا ابتدائی شعر یہ ہے :

آن ولی اللہ کہ ذاتش مظہر اسم خدا ست
قطب عالم در جہان گفتن کنون او را سزا ست

اور شاہ صاحب کا نام اس شعر میں درج ہے :

شاہ من شاہ علی است ابن ابراهیم شاہ خاتم ختم ولایت افتخار اولیا ست

ذیل میں اس دیباچے کے بعض ضروری اجزا نقل کر دیے
تے ہیں :

''فیقول العبد الفقیر یکے ار کمینہ مریداں خاکروبان و فرزندان
حضرت سلطان العارفین شاہ علی محمد معشوق اللہ المسمی سید ابراہیم
ابن سلطان الصالحین شاہ مصطفی حبیب اللہ ابن غوث الاعظم سلطان
العارفین شاہ علی محمد معشوق اللہ الحسینی الاحمدی کہ آنحضرت و نیز
مرشدی و شیخی شیخ العالم در بحر حقیقت الحقائق و معانی غواصی
فرمود دل خود را بجواہر و مرجان ولولو لالای حقیقی پر کردہ
آنرا در سلک شعر ساختہ مکاشفات و نکات اسم کردہ پس آنرا بلسان
درریاب و جواہر نثار بطریق نظم بہ الفاظ گوجری بزبان حق و گاہے
حق بلسان ایشان بہ وقت مکاشفات و مشاہدات و معاینات فرمودہ
در بیان اسرار اللہ کہ اثبات توحید و وجود واحد و وجود مطلق با
دلایل و براہین عقلی و نقلی و وجدانی و تمثیلات آں درس مختصر
آوردہ و جمع کردہ و آنرا 'جواہر الاسرار اللہ نام' دانستند کہ اس درج
ملفوظ پر از جواہر اسرار است ....وقتے بعضے طلاب
وجود واحد ایں فقیر را گفتند کہ دیباچۂ جواہر اسرار اللہ کہ
ابوالحسن شیخ محمد القریشی الأحمدی فرمودہ بغایت مختصر ، است تو
دیباچۂ دیگر املا کن ۔ بعد ار تامل بسیار فرمودۂ ایشان قبول کردہ
بمقدار حضور خویش انشا کردہ عرض نمودم ......۔''

ایں جواہر اسرار اللہ را باذن آنحضرت سلطان العارفین بہ طریق باب
اختم تا طالب مکاشفہ را مطلوب فی الحال در نظر آید و ایں قصیدہ کہ
ر مناقب آنحضرت سلطان العارفین مرشد آنحضرت سلطان ابوالحسن
یخ محمد ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی فرمودہ بود آں ہم آوردہ ۔''

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ دونوں دیباچہ نگار جواہر اسرار اللہ
، زبان کو 'گوجری' کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ یہ اصطلاح غالباً
ں زبان کو گجرات کی زبان سے ممیز کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے ،
میں بہ الفاظ دیگر گجراتی اردو مراد ہے ۔ ابوالحسن محمد پا

شیخ حبیب اللہ کے ہاں یہ اصطلاح جہاں تک ہمیں معلوم ہے، سب سے پہلی مرتبہ استعمال ہوئی ہے لیکن بہت جلد بعد قبول عام کا خلعت اس کو مل جاتا ہے اور گجرات سے نکل کر دکن پہنچ جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ برہان الدین جانم (متوفی ۹۹۰ھ) جو اولیائے بیجا پور (دکن) سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں، مثلاً کتاب 'حجت البقا' میں انہوں نے لکھا ہے:

جے ہویں گیان بچاری   نہ دیکھیں بھاکا گجری

اور کتاب 'ارشاد نامہ' میں کہا:

یہ سب گجری کیا زبان   کر یہ آئنہ دیا نما

علاوہ بریں ایک نثر کے رسالے موسوم بہ کلمۃ الحقائق میں لکھا ہے:

''سبب جو زبان گجری نام اس کتاب کلمۃ الحقائق[۱]''

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ بیجا پور کے اہل اللہ شیخ برہان الدین جانم جو بہ ظاہر حالات دکنی ہیں اور دکنی زبان میں لکھ رہے ہیں، اپنی زبان کو گجری کیوں کہتے ہیں۔ اس کی کوئی تسلی بخش توجیہ نہیں بتائی جا سکتی۔ مولوی عبدالحق کہتے ہیں:

''لیکن خصوصیت کے ساتھ گجری کہنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ وہ زبان جس میں ان کا کلام ہے، 'ہندی' ہے لیکن گجری ہندی ہے اور جیسا بھی ہے۔ کلام کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر گجرات کا اثر ہے[۲]''

میں یہاں ڈاکٹر محی الدین مصنف 'اردو شہپارے' جلد اول کی رائے بھی درج کرتا ہوں؛ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''اس عہد کی تواریخ دکن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ

---

۱ - رسالۂ اردو، اورنگ آباد، صفحہ ۵۴۱ - ۵۴۲، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء، جلد ہفتم، حصہ بست و ہفتم۔

۲ - رسالۂ اردو، صفحہ ۵۴۱، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء۔

گجرات سے بہت سے ادیب اور عالم بیجا پور آیا کرتے تھے۔ وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں کو اپنے دربار میں بلا لیا؛ چناں چہ گجرات کے ان پناہ گزینوں نے دکن میں اردو کا ادبی ذوق بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجا پور کے بعض اردو مصنفین جیسے شاہ برہان اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ گجرات کے اثر سے دکن کی ادبی زبان بڑی حد تک بدل گئی ہو اور جو لوگ اس متبدلہ زبان میں لکھتے تھے وہ اپنی زبان کو گجری کہنے لگے اور پرانی زبان دکھنی کہلانے لگی۔ مگر یہ فرق زیادہ عرصے تک نظر نہیں آتا کیوں کہ متاخر اہل قلم ہمیشہ اپنی زبان کو دکھنی کہتے رہے[۱]۔"

ان دونوں بیانوں سے دکن پر گجرات کا لسانی اثر صاف واضح ہے، لیکن محض بربنائے اثر گجراتی آمیز دکھنی زبان کا گجری کہلایا جانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ دکن میں گجراتیوں کی اور گجرات میں دکنیوں کی آمد و رفت ہر عہد میں رہی ہے؛ لوگ نقل مکان و ترک سکونت کرتے رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ اپنی زبان کو گوجری یا گجری کہتے ہیں وہ در حقیقت گجرات سے تعلق رکھتے ہیں، اور ہم نے اس اصطلاح کو گجرات و دکن کی عام اصطلاح مان کر در حقیقت اپنے آپ کو مغالطے کا شکار بنا لیا ہے، ورنہ موزوں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گوجری کو گجرات کے لیے مخصوص مانا جائے۔ اگر دکن میں یہ اصطلاح کسی مصنف کے ہاں ملتی ہے تو ہم سمجھ لیں کہ دراصل وہ مصنف گجرات کا باشندہ ہے اور اسی لیے اپنی زبان کو گجری کہہ رہا ہے۔ اگر شیخ برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں تو اس سے یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے آپ کو گجراتی الاصل تسلیم کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ گوجری سے مراد مسلمانان گجرات کی اردو ہے۔

گوجری یا گجری کی اصطلاح دیر تک استعمال ہوتی رہی ہے حتیٰ کہ بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے۔

۱ - اردو شہپارے، جلد اول، صفحہ ۱۲ -

چناں چہ محمد امین نے اپنی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں جو ۱۱۰۹ھ میں بہ عہد اورنگ زیب عالمگیر ختم ہوئی ہے، اپنی زبان کو گوجری کہا ہے ۔

آمدم بر سر مطلب ، جواہر اسرارالله مختصر نظموں کا ایک مختصر دیوان ہے جو عشق و معرفت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ دیوان کی اکثر و بیشتر نظموں کا موضوع مسئلۂ وحدت وجود ہے جس کو شاہ صاحب سینکڑوں طرح سے بیان کر جاتے ہیں ۔ اسی بنا پر ان کے ہم وطن اس دیوان کو دیوان مغربی کا ہم پلہ مانتے ہیں ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ صفات سے گزر کر عین ذات میں محو ہیں ؛ قلب پر وصالی کیفیت طاری ہے ؛ بشر، شجر، حجر، پھول ، کلی ، غنچہ غرض تمام مظاہر قدرت میں محبوب حقیقی جلوہ نما ہے اور یہ اس کے نسۂ محبت میں سرشار ہیں ، اس سے رنگ رلیاں کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں ، کبھی مجنوں بنتے ہیں ، کبھی لیلیٰ ، کبھی شیریں ہیں ، کبھی خسرو ، کبھی دولہا ہیں اور کبھی دلھن ۔ محبوب ان کا دھیس بورہا ہے اور یہ محبوب کا بہروپ اختیار کرتے ہیں ؛ وہ ان پر نثار کرتا ہے اور یہ اس پر نثار کرتے ہیں ؛ رنگ اڑاتے ہیں اور ہولی کھیلتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی محبت میں مگن ہیں ۔ چوں کہ ان نظموں میں شاہ صاحب نے اپنی قلبی کیفیات اور وجدانی احساسات کا ذکر کیا ہے ، اس تقریب سے ان کا نام مکاشفات رکھا ہے ۔ صرف چند ایسی نظمیں ہیں جن میں فارسی مضامین روشناس ہوئے ہیں ۔ مثلاً ایک نظم آفرینش سے تعلق رکھتی ہے ، ایک میلاد نبی پر ہے ، ایک میں نماز کے مسائل مذکور ہیں ، ایک نظم شاہ صاحب نے اپنے جد امجد شاہ احمد کبیر کی مدح میں لکھی ہے ۔

جواہر اسرارالله کی زبان ہمارے لیے خاص طور پر مشکل ہے ۔ اول تو اب سے چار سو برس پہلے کی زبان ہے اور وہ بھی گجرات کی ، اس کے علاوہ اس میں گجراتی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں ۔ ان امور نے شاہ صاحب کی زبان کو دقیق سا دیا ہے ۔ طرز بیان صاف و سادہ ہے ، خیالات و جذبات زیادہ تر ہندی ہیں ۔ اگرچہ فارسی جذبات بھی موجود ہیں ؛ فارسی عربی الفاظ کافی تعداد میں موجود ہیں ۔

ابوالحسن شیخ محمد کی اشاعت میں نظموں میں ہر قسم کی ترتیب

مفقود ہے ، البتہ سید ابراہیم نے اپنی اشاعت میں ان نظموں کو ابواب میں مرتب کر دیا ہے اور ابتشی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے ، لیکن نہ اس طرح پر جس طرح ہمارے ہاں عام دستور ہے ۔ مرتب کا التزام صرف نظم کے ابتدائی مصرع کے پہلے حرف پر منحصر ہے ، یعنی اگر نظم کا پہلا لفظ الف سے شروع ہوتا ہے تو وہ نظم باب الف میں داخل کر دی گئی ہے ، اگر 'بے' سے شروع ہوا تو ردیف با میں ، باقی علی ہذالقیاس ۔ اس قسم کی ہر ردیف ایک باب مان لی گئی ہے ، یعنی باب‌الالف ، باب‌البا ، باب‌التا وغیرہ ۔ نظمیں چھوٹی بڑی سب طرح کی ہیں ، اوزان بھی مختلف ہیں ۔ ہر نظم ایک مکاشفہ کہلاتی ہے اور مختلف بندوں میں منقسم ہے ۔ ہر بند نکتہ کہلاتا ہے اور عدد شمار کا حامل ہے ۔ نکتہ دو دو تین تین اور چار چار متحد القافیہ مصرعوں پر شامل ہے ۔ پہلا نکتہ ''نکتۂ اول در عقدہ'' کہلاتا ہے ، اور آخری نکتہ ''نکتہ در تخلص'' کہلاتا ہے ۔ چوں کہ غزل کے مقطع کی طرح اس بند میں بھی تخلص کے لانے کا التزام ہے ، اس لیے یہ نام دیا گیا ہے ۔

باب‌اللام میں ایک سی حرفی ملتی ہے ، چوں کہ پنجاب میں اب تک یہ صنف رائج ہے اس لیے میں اس کی شرح سے اعراض کرتا ہوں ۔ معلوم ہوتا ہے بارہ ماسے کی طرح سی حرفی بھی ہندی نظم کی ایک پرانی شاخ ہے ۔

یہاں میں ان کی ایک نظم سے جو معراج نبی پر ہے ، کچھ اشعار نمونے کے طور پر نقل کرتا ہوں :

آدم آدمیں ہور جن سارے اے نور نبی تھے کیتے
بھیس بھرا کر آپ دکھایا ہم تم اوپر بول سو دیتے
ڈونگر حیواں ہور نباتات اے سب نور نبی کا جانوں
احمد محمد نانوں احد کے دو جامن منہ کوئی نہ آنوں
توریت ماں خدا ایں کہیا مہتر موسیٰ ہاتھ
محمد رسول حبیب خدا کا ساروں کہہ یہ بات

احمد بھی ہے نوریت مانہیں ۱ محمد کیرا نانو
احمل میں بھی احمد کہیا مکے بھیں س مولد تہانوں

احدیت بھیں وہ ھووا ظاہر حضرت بی محمد میرا
آئے صلب عبداللہ کے سگلے ۲ بہانوں کرتے پھیرا

باجے گاجے سہیلی گاوس رے تجھ روپ اجاگل کیرے .
آج ہماری عید ہی ہے نبی سلونے دیکھے ہیرے

حسب خدا کا خاتم انبیا ساروں کا سرتاج
جس کے مولود ناحب گاؤ عید ہماری آج

علی محمد ایکس نور ہے نکھر گیا ہے چوندیس سوئے
بھیں اپڑے آپیں لمایا رھیا آپس آپیں جوئے

نظم آیندہ شیخ احمد نیر کی مدح میں ہے :

سلطاں سید احمد میرے اے سب نور نوازے میرے

جد تمہارے امت شاہ نبی ایں معراج کی رات
امت سگلی تجکوں بخشی مرید کیے سب تیرے ہاتھ

شاہ شہاں ھیں جے جگ ماہاں سوا کریں سو تجھہ دربارا
غوث قطب سب عالم کیرے واریں جانویں تجھہ پر پیارا

سانچا شاہ حسینی راجا نو کھنڈ تیری آن
سارے مرید تمہارے پیار نہ کریں بکھان

سلطان انبیا کل جگہ داتار شاہ علی بن عیسو
سلطان سید احمد راجے ساروں کایں جیسو

ذیل کی مختصر نظم پھولوں اور مالی پر ہے جو جذبات کے لحاظ

۱ - یعنی 'میں' یا 'اندر' راجستھانی کا حرف جار ہے ، گجراتی میں بھی رائج ہے (مرتب)

۲ - راجستھانی وگجراتی میں بہ معنی 'سب' یا 'تمام' مستعمل ہے - (مرتب)

سے بالکل مذاق حال کے مطابق ہے :

جس بولوں سونگھن جاؤں نس باس ہمارا پاؤں
کرھارنہ کیئیوں گل لاؤں

یہ کرنے اور گلالاں ہور کلیاں جے اب لالاں
سب دیویں بیریاں بھالاں

توں سوگر چانپیں چانکھے دھن بیدھی کیتا سانکھے
کیئیوں تاں نہ لاگل راکھے

یہ جوھی بھی نرمائی ہور باس ہماری لیائی
تو ھیڑے مس لے باھی

ان ھار حمبلوں سارے سب کابوں پھول پیارے
ھنس کرے سوتوں مہکارے

تجہ مالی جے ھوں پاؤں لے چوری ما نہ چھپاؤں
میں نبنوں نا بہ دکھاؤں

توں گھر گھر شہ ہو آوے ھوا لمل کلیوں راوے
جگ نیرا سہاگ کھنداوے

شاہ علی محمد ان بزرگوں میں سے ھیں جنھوں نے فارسی اوزان کو
ندی زبان میں روشناس کرنے کی ابتدائی کوشش کی ھے ۔ ان کے ھاں
زج مربع سالم و رجز مربع سالم میں دو نظمیں موجود ھیں ۔ یہاں
ن بحروں کے چند اشعار درج کیے جاتے ھیں :

رجز مربع سالم

۸ جیو تو رھتا نہیں ھور من دوکھ سہتا نہیں
کو جاے پیو کہتا نہیں رے بھائیو ھوں سوں[1] کروں

---

۱ ۔ 'ھوں سوں کروں' یعنی 'میں کیا کروں' ۔ 'ھوں'
اجستھانی کا اسم ضمیر ھے اور 'سوں' گجراتی کا حرف استفہام ۔
مرتب) ۔

مجھہ حگ کہے حمتا نہں پیو باح مجھ کمتا نہیں
مں ماںہہ نہ سمتا ہمں رے بھائیو ھوں سوں کروں
کہچھ بات ھے پن کیوں کہوں من مانہہ کی من لے رھوں
یوں سکھہ کرےھوں دو کھ سہوں رے بھائیو ھوں سوں کروں
کے لوک مجکو دکھ دھں حابو حو ایسا کو سہیں
مجھ باح علیحسو کے کہیں رے بھائیو ھوں سوں کروں

هزج مربع سالم

حو جوڑا پیوسوں لاگا ھئیے جس نیہ کی آگا
تہوں کا لوحہ سب بھاگا

حو اوٹیں بر بہریں نا کہیں رونویں ھور دوکھ سکھ حا کہیں
بہوں اسے ناحیے آ کہیں

نبولو بول کچھ کا حو جو لاگے پیار تم سانحو
تمنہ بھی ایسو ھیں ناچو

جو لوٹیں بر بہریں نا کہیں رونویں ھوردوکھ سکھ حا کہیں
بہنوں اسے ناچتے آ کہیں

جنہوں مں پرم کا بھٹکا نلیں دل نہ کا کھٹکا
سو جاے مرم کا لٹکا

الہٰی انکہ کہیں لاگے سونا یہ جوڑا جاگے
جواں کا دوکھ پن دھاگے

جو ایسے پیوکوں پاویں اٹھیں ھور دھیڑ گل لاویں
بہریں ھور وارنیں جاویں

سو لٹکں لٹکتا آوے لٹک گل بانہ جب پاوے
علی سب چانپ گل لاوے

ذیل میں چند اور اشعار مختلف نظموں سے دیے جاتے ھیں :

سادہ اتھے یوں پیارں منجکوں دیس کریکر آپس راؤں
کہیں سو نوشہ ھوکر آؤں کہیں سو آرس آپ کہاؤں
پگڑی باندہ ما لٹکاؤں پہروں ھانس زرینہ سارا
سہرا ھار حمیلاں پہروں دل بادل لے ھوؤں اسوارا

ڈھول دمامیں اونٹوں پر سات بد سب راحت جانویں
سب جگ کی رہے خوشبوئی لوک سب بھربھر لاویں

دنیا اور عقبیٰ

اس بستی کا کیا پتیارا آج تمھوں کل دوجوں مارا
سو کیوں سکوں دھرے پیارا

یہ جگ باندی اس جگ کیرے جہاں نہ نمڑے کھیل سویرے
جانوں بات سہی کر مری

لیلیٰ اور شیریں

چھوڑو لوکا حہ لڑائی کان کرو یہ پرم کہانی ۔
تمھوں تمہاری شیریں بھاوے منحکوں مری لیلیٰ سہانیں

جے تم لیلیٰ جویا لوڑو مجھ مجنوں کی نینوں دیکھو
تمھوں تمہاری شیریں جوؤ لیلیٰ کوں کیوں پیکھو

جذبات و خیالات کے لحاظ سے ان کا کلام اگرچہ زیادہ تر ہندی ہے تاہم فارسی اثر بھی موجود ہے۔ مصرع 'جے تم لیلیٰ جویا لوڑو منجھ مجنوں کی نینوں دیکھو' سعدی کے مشہور فقرے 'لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید' سے ماخوذ ہے ۔ اسی طرح مصرع 'ساجن گھر میں کرے سو لٹکے اے گگن پر ڈھونڈھں جانویں' فارسی کی ضرب المثل مصرع 'یار درخانہ و من گرد جہاں میگردم' کا پرتو ہے ۔

کان کرو یہ پرم کہانی ، میں 'کان کرو' فارسی 'گوش کن' کا ترجمہ ہے ، اور مصرع 'دھن تجھ پر لٹکے کیوں نکرے تجھ جیسا ساتھی پیار دھرے' میں 'لٹکے کرنا' ناز کردن کا اور پیار دھرنا ، محبت داشتن کا ترجمہ ہے ۔

فارسی و عربی الفاظ بعض اوقات ہندی بنا لیے گئے ہیں ۔ اوپر کے اشعار میں الفاظ ذیل ہمیں نظر آتے ہیں ۔

نوازے (نواختن سے) ، نرمائی (نرمی) ، اسوار (سوار) ، خوشبوئی (خوشبو) ، حمیل (حمائل) ، باندی (بندہ) ، سہی (صحیح) ، لیکن سب

ے زیادہ جو لفظ بگاڑا گیا ہے وہ 'عروس' ہے جس کی شکل شاہ صاحب کے ہاں 'آرس' ہے۔

ان ایام میں اردو زبان کی یہ ایک خصوصی شان ہے کہ اس میں ر زبان کے الفاظ داخل ہو کر کم و بیش اپنی اصلی حالت سے تبدیل کر لیے گئے ہیں اور بالعموم دیکھا جاتا ہے کہ سخت ہندی اور عربی سوات میں ترمیم کر دی گئی، مثلاً 'ڑیں' 'عین' اور 'حائے حطی' کی بل صوت اڑا دی گئی ہے۔

میاں خوب محمد چشتی

گجرات کے مورخ صاحب صفت احمدی نے انھیں صوفی کامل اور اعر صاحب سخن بیان کیا ہے۔ تصوف کے میدان میں ان کا مرتبہ بلند ہے۔ جام جہاں نما پر ایک شرح لکھی ہے۔ 'امواج خوبی' اور خوب ترنگ' ان کی مشہور و معروف تصنیفات ہیں۔ مرآت احمدی کی بارت ہے:

''درویش کامل و صاحب لسان وصاحب سخن بودند۔ در تصوف دست رسا داشتند و بر 'جام جہاں نما' شرح نوشتہ۔ 'امواج خوبی' و 'خوب ترنگ' از ایشان یادگار مشہور و معروف است۔''

(صفحہ ٦٤، مرآت احمدی)

ان کے دھی کارنامے تصوف کے میدان تک ھی محدود نہیں ھیں یہ دیگر فروع علوم پر بھی شامل ھیں۔ ھندی اور فارسی عروض پر کی ایک تصنیف کا ذکر آیندہ سطور میں آئے گا۔

ان کے واقعات زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ھوا ہے؛ ھمیں صرف قدر علم ہے کہ ان کا انتقال شوال کی ۲۴ کو ۱۰۲۳ھ میں ھوا چوک احمد آباد میں مسجد فرحت الملک کے پاس خان پور ازے کے قریب مدفون ھیں۔ ان کی وفات کی تاریخ 'خوب دھے' برآمد ھوتی ہے۔

خوب محمد کا نام ان کی ھندی مثنوی خوب ترنگ تصنیف ۹۸۶ھ

ور اس کی فارسی شرح تالیف ...۰۱ھ کی بنا پر اب تک زندہ ہے
عض وجوہ کی بنا پر میں ان کی فارسی شرح 'امواج خوبی' کا ذکر ہ
مناسب سمجھتا ہوں ۔ اس کی تاریخ تالیف شعر ذیل سے نکلتی ہے :

عدد شمار ز تاریخ 'شرح نعت محمد'
ہزار سال مکمل ز 'فکر خوب محمد'

'شرح نعت محمد' اور 'فکر خوب محمد' اس کے مادۂ تاریخ ہیں ۔
ایک اور شعر جس میں مصنف نے ایک نہایت اچھوتے طریقے
تاریخ تصنیف نکالی ہے ، حسب ذیل ہے :

شمارم سال شرح نعت احمد
دہم سال از دہم عشر از دہم صد

معنی دسویں صدی کے دسویں عسر کا دسواں احد ۔ اس سے وہی س
یک ہزار ہجری مقصود ہے ۔

اس شرح پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے
مصنف فارسی زبان کا ایک قابل منشی ، اعلیٰ شاعر اور عم
تاریخ گو تھا ۔

اس کا انداز تحریر نہایت سلیس ، سادہ اور رواں تھا ۔ ایک مصنف
کی حیثیت سے اس کا رتبہ ان تمام بزرگوں سے جن کا ذکر ان اوراق می
ہو چکا ہے ، بہت بلند ہے ۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خوب م
اپنی زبان کو عربی فارسی آمیز گجراتی کہتے ہیں ؛ چناں چہ کہتے ہیں

''ہر یک شعر بربان خود تصنیف کردہ اند و میکنند و من بزبا
گجراتی کہ الفاظ عجمی و عربی آمیز است ۔''

(امواج خوبی ، صفحہ ۷ ، قلمی

یہ عبارت ان کی مثنوی 'خوب ترنگ' کے اس شعر کی تشریح ہے

جوں میری بولی منہ بات
عرب عجم مل ایک سنگات

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس عہد کے گجراتی مصنفین دھلی سے اپنے لسانی تعلقات کو بالکل فراموش کر چکے ھیں اور اپنی زبان کو نئے نئے نام دے رہے ھیں ۔ اگرچہ اس عہد سے ایک صدی پیشتر تک دھلی کے ساتھ وہ اپنے تعلقات کے معترف تھے ، جیسا کہ شیخ باجن کے ہاں ہم دیکھ چکے ھیں ۔

'امواج خوبی' حقیقت میں شرح کہلانے کی مستحق نہیں ہے ، کیوں کہ اس میں مصنف نے اپنی مثنوی کے متن کی پابندی کا بہت کم لحاظ رکھا ہے ، نہ ہر شعر کی علیحدہ علیحدہ تشریح کی ہے ، البتہ مطالب وھی ھیں جن کو مصنف نے یہاں فارسی نثر میں منتقل کر دیا ہے ۔ تاھم یہ نثر اصل مثنوی کے مطالب کے سمجھنے میں بڑی حد تک امداد کرتی ہے ۔

مثنوی خوب ترنگ ایک طویل الذیل مثنوی ہے جو چھوٹے ھندی وزن میں لکھی گئی ہے ۔ اس میں مسائل تصوف کا تفصیلاً مذکور ہے ۔ اکثر اوقات اس میں نادرہ اور جدید تشبیہات و حکایات درج کی ھیں ۔ یہ تصنیف اس عہد کے اردو ادبیات میں ایک ممتاز پیداوار مانی جا سکتی ہے ۔ خوب محمد شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید ھیں اور یہ مثنوی حقیقت میں ان کے مقالات اور ارشادات پر مبنی ہے ۔ جس کے متعلق مصنف کا بیان ہے :

میں مرشد تھیں سنا بیان	وے مرشد صاحب عرفان
جنھوں منجھے سکھایا دین	جہ تھیں منجہ دل ھوا یقین
وارث مہدی ہر ٹھانوں	شیخ کمال محمد نانوں
اون تھیں میں سنا درایت	اوس منہ یاد رھی کچھ بات
وہ جیوں منجکوں آئی ترنگ	جمع کئے نے بس بس ڈھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب	مدح رسول اللہ باب

خوب ترنگ دو شنبے کے دن دوم شعبان ۹۸۶ھ کو ختم ھوتی ہے چناں چہ :

نسخه کی تارخ اس نہانہ   پائے عدد ہر مصرے مانہ
خوب محمد گنے بچار   چودہ گھاٹ اوس برس ہزار
دوجا چاند جو تھا شعبان   دیس دو شنبہ کیا بیان

دوسرے شعر کا ہر مصرع الگ الگ مادۂ تارخ ہے ، بلکہ مصرع 'چودہ گھاٹ اوس برس ہزار' سے ملفوظی اور مکتوبی دونوں تاریخیں نکلتی ہیں ۔ اردو زبان میں یہ ایک قدیم نارخ ہے جو ہمیں معلوم ہے ۔

اس تصنیف میں متعدد فارسی وعربی الفاظ بگڑی حالت میں ملتے ہیں ۔ ان میں سے بعض اس قدر مسخ ہو گئے ہیں کہ ان کی شناخت بھی مشکل ہے ۔ میں بعض یہاں درج کرتا ہوں :

مصرے = مصرع ، مثال : 'پائے عدد ہر مصرے مانہ'
سہی = صحیح ، مثال : 'اسے سہی کر برائے خدا'
دوس = درست ، مثال : 'درس کہوں وے توں من آن'
داندانوں = جمع دندانہ ، مثال : 'جان داندانوں سوں تس سیں'
درئے = دریا ، مثال :
'ندی بھلے درئے میں جد'   'بھی پھر دریا کہویں تد'
نیسان = نشان ، مثال : 'بے نیشان اوس کا نیسان'
کاگل = کاغد ، مثال : 'کھڑیا لیکھن کاگل ذاب'
تانبا = طعمہ ، مثال :
'بیلا تانبے کی نہی تب   تانبا کھاتے تھے وے سب'
زلیچہ = زیلوچہ ، مثال :
'ٹوٹا یوں زلیچہ سوی   جوں پوتلا چتریا ہوی'

اسی طرح جانور کو جناور ، ذہین کو ذھنی ، خوی (پسینہ) کو 'خو' اور نام کو نانو لکھا ہے ۔

مثنوی اگرچہ بروئے قواعد اردو میں لکھی گئی ہے تاہم گجراتی زبان کے الفاظ جو حروف جارہ و اسماے صفات و دیگر اسما کی صورت میں اس تصنیف میں پیہم ملتے ہیں ، اس کا سمجھنا ایک اردو خوان محض

کے لیے مشکل کر دیے ھیں ۔ میں نے ذیل میں ایسی مثالیں انتخاب کی ھیں جو حکایات کی شکل میں ھیں ۔ سب سے پیشتر میں حکایت کا خلاصہ ناظرین کے سامنے پیش کروں گا اور بعد میں اصل انتخاب دوں گا ۔ اس طریق سے مجھے امید ھے کہ ناظرین کرام کو اصل عبارت کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی ۔

حالت محویت و استغراق کی مثال دیتے وقت مصنف نے شیخ چلی کی جس کو 'شیخ جلہی' لکھا گیا ھے ، ایک کہانی دی ھے ۔ شیخ چلی جیسا کہ سب جانتے ھیں ، ھماری کہانیوں میں ایک مشہور و معروف ھستی ھے جو اپنی بے بدل حماقت اور بے وقوفی کے لیے غیر فانی شہرت حاصل کر چکا ھے ۔ وہ بہ ظاھر حالات ایک تاریخی شخصیت ہونے کی بہ نسبت ایک افسانوی شہرت کی شخصیت معلوم ھوتا ھے ؛ اگرچہ ضلع کرنال میں ایک عالی شان گنبد کی نسبت عام طور پر بتایا جاتا ھے کہ وہ شیخ چلی کے مزار پر ھے ۔

شیخ کے متعلق مصنف نے جو کہانی دی ھے حسب ذیل ھے :
شیخ چلی کے چار مکان تھے جو ایک ھی صحن میں واقع تھے ۔ مرمت کی ضرورت سے شیخ ایک مکان پر چڑھا ؛ چھت پر پہنچ کر دیکھا تو تین مکان نظر آئے اور چوتھا مکان جس پر شیخ چڑھا تھا ، نظر نہیں آیا ۔ شیخ اس مکان کی یک لخت گم شدگی سے سخت پریشان ھوا اور سوچا کہ اس مکان کی مرمت پہلے نہ ھونے کی وجہ سے وہ روٹھ کر کہیں چل دیا ھے ۔ دل میں کہا کہ اس کی تلاش میں جاؤں اور منا کر لاؤں ۔ یہ ٹھان کر وہ جلد جلد اترا اور گلی میں پہنچ کر لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ اس قسم کا مکان تم نے ادھر سے جاتا ھوا تو نہیں دیکھا ؟ سننے والے اس سوال پر مسکرائے اور دل لگی کی غرض سے کہنے لگے کہ ھاں فلاں سمت جاتے دیکھا ھے ؛ تم پھرتی کرو اور دوڑو ، ابھی کوئی دم میں اسے جا لو گے ۔ شیخ دوڑنے لگا اور یار لوگ اسے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر دوڑاتے رھے ، مگر مکان نہیں ملا ۔ بالآخر تکان سے چور اور پسینے

میں شرابور شیخ ستانے کے لیے ایک مسجد میں گھس گیا ۔ مسجد میں قلندروں کی ایک ٹولی بھی ٹھہری ہوئی تھی ۔ ان سے شیخ نے اپنی تلاش اور ناکامی کا قصہ دھرایا ۔ انھیں بھی مذاق سوجھا ، چناں چہ جب شیخ کو نیند آ گئی ، اس کی چار ابرو کا صفایا کر دیا ۔ صبح کے وقت وہ حوض پر وضو کرنے کے لیے گیا ، پانی میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر حیران رہ گیا ، چہرے کی ہیئت اور ہی نظر آئی ؛ داڑھی اور مونچھوں کو غائب پا کر سمجھا کہ میں گم ہو گیا ہوں اور یہ کوئی اجنبی ہے جو میری جگہ آ گیا ہے ۔ اب شیخ چلی نے مکاں کی تلاش چھوڑ کر اپنی تلاش شروع کر دی ۔ آوازوں پر آوازیں دیں اور مسجد کا کونا کونا چھان مارا لیکن شیخ چلی کو اپنا سراغ نہیں ملا ۔ قصہ مختصر یہ کہانی ہے جسے خوب محمد نے ابیات آیندہ میں بیان کیا ہے :

شیخ چلھی کے تھے گھر چار ۔۔۔ چڈھے پھرانے ایکس بار
اونچے چلہ کر لیکھا کیں ۔۔۔ گنتی چھپرے ہوے سو تین
جس پر بیٹھے آپ پھر ایس ۔۔۔ سکوں گنی مانہ نہ لیایں
فکر کریں نیں کھویں یوں ۔۔۔ اندازا گھر جاوے کیوں
من منیں یوں کیا بچار ۔۔۔ دل ستیں [یو دییا قرار
پہلوں اسے پھرا نیں مات ۔۔۔ روس گیا گھر کس اک بات
اوتروں ڈھونڈوں جنہ کہیں پاؤں ۔۔۔ دیکھوں جاؤں منا کر لیاؤں
اوتر چلے پوچھیں اس گھاٹ ۔۔۔ گھر جاتا دیکھا کس باٹ
ایسا چھپرا ایسی بھینت[1] ۔۔۔ ایسے کولے گھر ہے پھینت
سب کو کہے کہ اے دکہ جاے ۔۔۔ دوڑیں کہیں نجانے پائے
ھانپے سانس نہ منہ منہ مانے ۔۔۔ خوے کہ جھرنوں ریل بہاے
ٹہاک پڑے آ مسجد مانہ ۔۔۔ رھیں قلندر بھی تس ٹہانہ
بات جاعت میں کہی کھول ۔۔۔ جوان ملے اور کہے تکول

---

۱ ۔ بھینت = دیوار ۔ سنسکرت لفظ 'بھت' سے ماخوذ ہے ۔ سندھی میں اب بھی دیوار کو 'بھت' کہا جاتا ہے ۔ (مرتب)

شیخ چاہی کو سوتے بوج | کتر گئے وے دادھی موچھ
نس کہری ایک دو سحس لب | دادھی کا کحھ فہم نہ کیب
چلتے محر ہوئی جس بھانہ | آے وضو کوں پانی مانہ
پانی میں مکہ دیکھ بار | بج دادھی یوں دیا فرار
ہوں رہا مسجد مانہ سوی | یہ منحہ پسرا تبں ہے کوے
کوئی قلندر ہے جنہ نانہ | بھولا آیا مری تھانہ
حاؤں ڈھونڈہ سجھے لے آؤں | واہ ہمیں ہوں منحہ کیوں پاؤں
پھر آی مسجد کے دوار | ہاکاں[1] ماریں بہت پکار
ہو ہوں ہو ہوں کہ حی لاویں | رہےہوں ہم ہونکوں کوں پاہیں

بہادر شاہ گجراتی (۹۳۲ھ و ۹۴۳ھ) نے سادی آباد عرف منڈو کو ۹۳۷ھ میں ایک لڑائی کے بعد جس میں محمود شاہ خلجی والی مالوہ گرفتار ہوتا ہے، فتح کر لیا۔ فاتح نے برائے نمس ایک بہری اڑائی جس نے آسماں میں ڈوب کر اپنے مقام چمپانیر کا رخ کیا۔ وہ چنپانیر اسی وقت پہنچی جب اس کے ساتھی پرندوں کو طعمہ دیا جا رہا تھا۔ اشعار ذیل میں یہ واقعہ درج ہے:

فتح ہوئی مانڈو کی جب | حاکم شاہ بہادر تب
سبرگاہ مانڈو کے مانہ | بہری ایک اوڈائی تانہ
حدہ جا کے لاگی آکاس | اوجی حدہ دیکھیا جنہ پاس
چانپانیر سہس جس ٹھانہ | سر گاہ تھی دائم جانہ
مانگ جناور جس ٹھار | لے آ بیٹھا مبر شکار
بیلا تانبے کی بھی سب | نانبا کھانے تھے وے سب
سدا سو نانبا کھاتی جا نہ | آ کر بہری اوتری تانہ
اونچے چدہ دیکھے حکوئی | سب تھانہ اسے برابر ہوی
بہری ٹھوری بیلا مانہ | مانڈو نہیں آئی نس ٹھانہ

---

۲ - ہاک = زور سے دی گئی آواز - پنجابی میں بھی موجود ہے - راجستھانی کا لفظ 'ہاکا' بہ معنی 'شور' بھی اسی کا ساتھی ہے - ان کی اصل ہندی الفاظ 'ہانک' اور 'ہانکا' ہیں - (مرتب)

ذیل کی حکایت میں ایک شہ زور کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس کو کوئی شخص بھی جب کہ وہ چپ غالیچے پر لیٹ گیا تھا نہیں اٹھا سکا۔ جب بہت لوگوں نے مل کر غالیچے سمت زمین سے اٹھانے کی کوشش کی تو بھی اس نے جنبش نہیں کھائی بلکہ غالیچے کا وہ حصہ جو اس کے جسم کو مس کر رہا تھا بہ شکل قد آدم درمیان سے پھٹ گیا۔ یہ کرتب غالباً ولی عہد گجرات کے سامنے دکھایا گیا تھا۔ مصنف کا بیان ہے :

ایک بلونت سو هوا سوار ۔۔۔ آیا راج کنور کے بار
کہیا کہ میرا زور آرماؤں ۔۔۔ آج تماشہ اک دکھلاؤں
بڈا زلیچہ اک بچھوای ۔۔۔ سوتا جا سں اوپر جای
دوھوں هاتھ پگ لانیے تاکہ ۔۔۔ زور پیٹھ کے سورھیا راکھ
کہیا ایہاں نہیں مجھے اجاؤ ۔۔۔ لاکھوں مل اٹ سو هلاؤ
سب بلونت ملے اک ٹھور ۔۔۔ کہیا زلیچہ پھرنے دور
ایسا بل اکٹھے مل کیت ۔۔۔ جیوں زلیچہ اوچا سولیت
جنہ بلونت سوتا تھا نانہ ۔۔۔ اوتنا توٹ رهیا سں تھانہ
توتا یوں زلیچہ سوی ۔۔۔ جیوں پوتلا چتر یا هوی
ایتا بهار سو تھا اک زور ۔۔۔ جس کا اب لک آیا شور
بهار تو اتنا تھا سب مل ۔۔۔ جیوں لیجای تتو منزل

(ورق ۱۲۷ - ب ، خوب ترنگ)

اس موقع پر همیں مولانا خوب محمد کی ایک اور تصنیف 'چھند چھنداں' نامی کا جو عروض هندی و فارسی و تال ادھیا کے بیان پر شامل ہے ، ذکر کرنا مناسب معلوم هوتا ہے۔ یہ ایک نہایت غیر معروف رسالہ ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی کے کتب خانے میں اس نایاب تالیف کا ناقص الآخر نسخہ جو کرم خوردہ ہے ، موجود ہے اور بظاهر عہد جہانگیری کے اختتام یا دور شاهجہانی کے آغاز میں نقل کیا گیا ہے۔ نسخۂ هذا کی شکستہ حالی کی بنا پر طویل اقتباس

نہیں دیا جا سکتا ، ابتدائی شعر یہ ہے :

سم اللہ کر ناوں دھر چھند چھنداں
پنگل اور عروض اور بال ادھیا نینہ آں

یہاں میں صرف اس کے عروضی حصے کے متعلق کسی قدر کہنا چاہتا ہوں جس کا آغاز اس دوہرے سے ہوتا ہے :

پنگل کی سہ کہہ رہیا اب عروض گن آکھ
مصرے خوب ایس کے جدی جدی بدہ بھاکھ

عروض فارسی کی شرح کے وقت مصنف نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے جو مروجہ عروضی طریقے سے بالکل مختلف ہے ۔ مصنف کا یہ طریقہ زیادہ تر پیچیدہ اور الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ ارکان عروض کے بارے میں لکھا ہے :

خوب اصل جز آٹھ ہیں اونکی بکت پچھان
دوئی خماسی تن میں چھکون سباعی جان

یعنی فعولن اور فاعلن خماسی ہیں اور مفاعیلن ، فاعلاتن ، مستفعلن ، مفعولات ، متفاعلن اور مفاعلتن سباعی ۔

بحور و اوزان کے بیان میں خوب محمد نے اپنے تصنیف کردہ اشعار مثال میں دیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوب محمد کے زمانے سے قبل ہندی اشعار کا فارسی اوزان میں لکھے جانے کا دستور بہت کم تھا ۔ یہ کتاب چونکہ طلبہ کو حفظ کرانے کی غرض سے لکھی گئی ہے ، اس لیے شاعر نے اوزان اور ان کے زحافات کا ہر ہر مثال میں ذکر کر دیا ہے جو طالب علموں کے لیے بہت مفید ہے ۔ اس موقع پر فارسی اوزان کی بعض مثالوں کا یہاں نقل کیا جانا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا :

متقارب مثمن سالم :

تقارب مثمن جسو سوبیں کہیے ہے
چھوں جن سو مصرے مثمن لہیے ہے

متدارک مثمن سالم :

بحر سن جب تدارک میں آنئیے
خوب تب فاعلن اصل اوس جانئیے

رمل مثمن محذوف :

یہ رمل محذوف جانیں خوب ٹک سن کان دھر
جے وزن محذوف کیجے حرف جھیھ کے دو نکر

رمل مثمن مخبون مقصور :

جو رمل خبن کرے قصر تو یوں خوب پچھان
نکہوں ھوں جو یوں نہیں فہم کرے گا یو یوں جان

رمل اشکل :

جو رمل کہے شکلج یو یوں بحر میں کریں در
نکریں سو خوب دوجا نکریں سو سابواں ار

مضارع :

مضارع کو کیوں کریں گے سنیں خوبیں اصل جانیں
ھزج پیچھیں بھی رمل کر ، ملا دوئیں یوں پچھانیں

مضارع اخرب مثمن :

اخرب کرے مضارع تب خوب سن سو من دھر
پہلا انے سو جہلا ، : ے دو کہیں جدی کر

ھزج مربع سالم :

ھزج خوبیں مربع کی
سبھی دو کھ کی سوداروِدی

متقارب اثلم مقبوض :

کہیں سو خوبیں جو قبض اثلم تقاربیں سوں سمجھ پچھانیں
کرے جو اثلم تو یاد پہلا سبے خماسی مہیں سو آنیں

یہ فارسی عروض کی ھندی زبان میں اشاعت تھی جس نے اردو زبان
کے مستقبل میں ھمیسہ کے لیے ایک ھنگامہ خیز انقلاب پیدا کر دیا -

یہ انقلاب گیارھویں صدی ھجری (سترھویں صدی عیسوی) کے آغاز میں شروع ھوتا ھے اور اس کا پہلا نتیجہ محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ ھ و ۱۰۲۰ ھ) کا کلیات ھے ۔ اس کلیات میں ھم دیکھتے ھیں کہ اردو زبان اوزان و بحور ، جذبات و تخیل اور تشبیہ و محاورہ میں فارسی زبان کی تابع بنا دی گئی ھے اور ھندی جذبات و تخیلات و اوزان ترک کر دیے گئے ھیں ۔ جس طرح فارسی اھل قلم نے عربی ذخیروں سے کام لیا تھا ، اب اردو نے فارسی خرمن سے خوشہ چینی شروع کر دی ھے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تبدیلی نے اردو زبان کے دائرے میں بے حد وسعت پیدا کر دی ھے ۔ اس میں ھر قسم کے مطالب و خیالات کی ادائگی کے لیے استعداد آ گئی ھے ۔ ھندی عروض کی بے بضاعتی ظاھر ھے ۔ اس میں شگفتہ اوزان بہت کم ھیں ۔ دوھروں اور مثنوی کے اوزان محدود ھیں ۔ اس پر طرہ خود ان رتاںوں کی بہی مائیگی ھے ۔ بہر حال فارسی کے پیوند نے اردو زبان کو ھر لحاظ سے مالا مال کر دیا اور ابھی گیارھویں صدی ھجری ختم بھی نہیں ھونے پائی تھی کہ اس زبان میں محمد ولی جیسے استاد فن اور صاحب دیوان پیدا ھونے لگے ۔ فی زمانتا اس تحریک کی مخالفت میں بعض حلقوں سے آواز بلند ھوئی ھے اور اس کو غیر ملکی اور ناعاقبت اندیشانہ کہا گیا ھے ، لیکن ھمارا خیال ھے کہ بزرگوں کی یہ جدت پسندی جہاں تک کہ اس کے نتائج دیکھے جاتے ھیں ، نہایت مفید اور سود مند ثابت ھوئی ھے ۔ اردو زبان نے اس وقت تک بے حد ترقی کر لی ھے اور آج وہ فارسی زبان کے دوش بدوش کھڑی ھے ۔

مثنوی لیلیٰ مجنوں از احمد دکنی

(از 'اورینٹل کالج میگزین' بابت ماہ نومبر ۱۹۲۵ء)

ساتویں صدی ہجری میں سکندر ثانی علاؤالدین خلجی نے دیوگڑھ، ورنگل، کرناٹک وغیرہ فتح کر کے دکن کو سلطنت دھلی کا صوبہ بنا دیا اور مسلمانوں کا قدم اس سرزمیں میں جم گیا۔ لیکن یہ محمد تغلق کا عہد ہے جو سیاسی اور اقتصادی تغیرات سے مالا مال ہے۔ وہ شاھانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا، تخت ھندوستان پر قدم رکھتے ھی چین و ایران کی فتح کے خواب دیکھنے لگا لیکن وقت اس کی اولوالعزمیوں کے استقبال کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ چناں چہ ھندوستان ھی نے اس کے راستے میں اس قدر مشکلات پیدا کر دیں کہ وھی تلوار جو اس نے ممالک غیر میں ھندوستان کا اقتدار قائم کرنے کے لیے تیز کی تھی، اپنی رعایا کے خون سے رنگین کرنی پڑی۔ راجا اور پرجا، راعی اور رعیت میں ایک زبردست نفرت قائم ھوگئی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ نفرت خطرناک بغاوتوں کی شکل اختیار کرتی گئی اور اسی وقت ختم ھوئی جب اس کو پیام اجل آ پہنچا۔

محمد تغلق کی اصلاحی تجاویز میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ دھلی کو ترک کرکے دولت آباد کو ھندوستان کا پایۂ تخت بنایا جائے۔ وہ اپنی اس تجویز پر ایک ناقابل یقین حد تک مصر رھا۔ ھر چند دولت آباد، آباد نہ ھو سکا لیکن ایک مرتبہ اس نے دھلی کو ضرور اجاڑ دیا۔ اور جب اس پر تجویز کی عملی مشکلات واضح ھو گئیں تو اگرچہ اس نے رعایا کو واپس دھلی جانے کا حکم دے دیا تاھم ان

میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے نئے وطن کو ترجیح دی اور یہیں آباد ہوگیا ۔ دلی کے یہ آباد کار اپنے ساتھ دلی کا تحفہ یعنی زبان اردو بھی ساتھ لائے تھے ۔ یہ پہلا موقع تھا جب اردو زبان دکن میں مرہٹی اور تلنگی زبانوں کے درمیان گلیوں اور بازاروں میں بولی جانے لگی ۔

بعاوت امیران صدہ کے واقعے نے دکن کو بہت جلد خاندان تغلق کی اطاعت سے آزاد کر دیا اور عین وقت پر محمد تغلق کی وفات نے حسن بہمنی کو دکن کا مستقل تاجدار تسلیم کرا دیا ۔

بہمنی دور میں جو ۷۴۸ھ سے شروع ہوکر ۹۳۲ھ پر ختم ہوتا ہے ، اردو زبان دکن میں رواج پاتی رہی ۔ اگرچہ تحریری شہادت موجود نہیں تاہم قیاس اغلب ہے کہ مسلمانوں کی اس نئی بستی کی عام زبان اردو تھی کیوں کہ اس کو تعلیم یافتہ فرقہ بول سکتا تھا ۔ فارسی صرف درباری زبان تھی اور کوئی تعجب نہیں اگر ضرورتاً اس عہد میں اردو تالیفات شروع ہو گئی ہوں ۔ بہمنی خاندان کی بربادی پر ان کی میراث پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گئی ۔ ان میں اردو ادبیات کی ترویج کے لیے خاندان قطب شاہیہ کا قدم پیش پیش ہے ؛ بالخصوص محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ و ۱۰۲۰ھ) کا نام اردو کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے ، جس کے عہد میں مستقل تصنیفات لکھی جانے لگی تھیں ۔ خود محمد قلی اردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا ۔ اس کے ضخیم کلیات پر جو اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہے ، حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ اردو بابت ماہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ایک پر مغز اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے ۔

محمد قلی بہ لحاظ علم دوستی ایک بے نظیر شخصیت معلوم ہوتا ہے ۔ علوم کی سرپرستی میں جس قدر اس نے حصہ لیا ہے ، ہم ابھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کیوں کہ اس کے عہد کے ذہنی کارناموں کی تاریخ ابھی تک مدون نہیں ہوئی ہے ۔ اس کی سرپرستی میں متعدد نفیس اور علمی کتابیں تالیف ہوئی ہیں جو آج یورپ کے مشرقی کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں ۔

'اختیارات قطب شاہی' جو 'اختیارات بدیعی' (طبی تصنیف) کی ایک ضخیم تنقید ہے ، اسی بادشاہ کے حکم سے اطبا کی ایک جماعت نے تالیف کی ہے ، جس کا اصل نسخہ راقم کے مجموعۂ کتب کے نوادرات میں سے ہے ۔ 'مثنوی لیلیٰ مجنوں' بھی احمد دکنی نے اسی بادشاہ کے حکم سے نظم کی ہے ؛ اس کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ اور نفیس کتب خانے کا مالک تھا ۔ راقم نے ایسی بیسیوں کتابیں دیکھی ہیں جو اس کی مہر اور اس کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ کی مہر اور دستخطوں سے مزین ہیں ۔

ایک لحاظ سے یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں زریں دور کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے ۔ آگرے کے تخت پر جلال الدین اکبر بادشاہ جلوہ افروز تھا ۔ علوم کی سرپرستی اور فنون ظریفہ کی حمایت میں گویا سلطان حسین مرزا اور امیر علی شیر نوائی کے عہد کا احیا ہو گیا تھا تصویر کشی اور خطاطی کی بے حد قدر کی جاتی تھی ؛ صناع اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جاتا تھا ؛ ادب و شعر کی گرم بازاری تھی ۔ دکن میں اگرچہ اکبر کی ارضی فتوحات دیر میں شروع ہوتی ہیں لیکن اس کی علمی اور صنعتی فتوحات کی ہوائیں پیشتر سے گولکنڈے اور بیجا پور کی پہاڑیوں سے جا جا کر ٹکرا چکی ہیں ۔ اسلامی تاریخ کے دوران میں ایک مخصوص اصول بار بار نظرافروز ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سلاطین اور رؤساء ایک دوسرے کی تقلید میں بے حد اصرار کرتے تھے اور جب ایک دربار کسی خاص علمی یا صنعتی اوصاف میں ممتاز ہوتا ، دوسرے رؤساء اور سلاطین اپنے اپنے دائرۂ اثرات میں ضرور اس کا اتباع کرتے تھے ۔ وہ علم کا جواب علم سے اور باغات و عمارات کا جواب باغات و عمارات سے دیتے تھے ۔ اور یہ ہم چشمی ان میں ہر زمانے میں مشاہدہ کی جاتی ہے ۔ اکبراعظم کی علمی ضیا باریوں نے نہ صرف فتح پور اور آگرے کو جگمگا دیا تھا بلکہ اس کی شعاعوں نے وندھیاچل کی چوٹیوں سے نفوذ کر کے دکن کی وادیوں کو بھی مطلع نور بنا دیا تھا ۔ دکن میں تصویر کشی کا

ایک نیا دبستان قائم ہو جاتا ہے جو اصفہان کے مقابلے میں آگرے سے زیادہ فیضان حاصل کرتا ہے ۔ اس میں بعض مقامی خصوصیات بھی موجود ہیں ۔ یہ دکنی دبستان اگرچہ وسعت ، بلند آہنگی اور عظمت میں کبھی بھی آگرے کے دبستان کو نہ پہنچ سکا لیکن دل کشی ، نزاکت اور پختگی میں اکبری دبستان سے کم نہیں ہے ۔

کتاب زیر نظر ایک منظوم و مصور لیلیٰ مجنوں ہے ، جو محمد قلی قطب شاہ کے ارشاد پر دکنی اردو میں لکھی گئی ہے ۔ ناظم کا تخلص احمد ہے ؛ اس سے زیادہ مصنف کے متعلق کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا ۔ گارساں دتاسی نے پانچ 'لیلیٰ مجنوں' کا ذکر کیا ہے ، لیکن یہ کتاب اس مجموعے میں شامل نہیں ہے ، نہ کسی اور تذکرے میں اس کا سراغ ملتا ہے ۔

میرے مخدوم اور کرم فرما پروفیسر سید عبدالقادر ایم ۔ اے پروفیسر تاریخ ، اسلامیہ کالج لاہور ، تاریخی کتب کی تلاش کے سلسلے میں اس کتاب کو حاصل کرتے ہیں اور نہایت مہربانی کر کے میرے استفادے کی غرض سے مجھ کو عنایت فرما دیتے ہیں ، جس کے لیے میں سید صاحب کا تہ دل سے منت گزار ہوں ۔

یہ مثنوی اپنی گزشتہ آب و تاب اور حسن کی ایک خستہ یادگار ہے ۔ اس کی موجودہ ویرانی اس کے اصلی جوبن کا پتا دیتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی مصاحبت زیادہ تر اس کی بربادی کی ذمہ دار ہے ۔ کتاب کا اکثر حصہ غائب ہے ، صرف اساس منتشر اوراق ہیں جو زمانے کی دست برد سے باقی رہ گئے ہیں ۔ ان میں چودہ تصاویر اکبری دبستان کی طرز میں موجود ہیں لیکن اکثر شکستہ وریختہ ۔ قریب قریب کوئی ورق سلامت نہیں ہے ۔ اس کی جو پیوند کاری ہوئی ہے وہ سکھا شاہی زمانے سے تعلق رکھتی ہے ، لیکن ایسے شخص کے ہاتھوں سے عمل میں آئی ہے جس کو نہ تصاویر سے کوئی محبت تھی اور نہ متن سے سروکار تھا ۔ تصاویر پر جو اصل کتاب سے تعلق رکھتی ہیں ، کسی غیر قلم میں جو گزشتہ صدی کا معلوم ہوتا ہے ،

مشائخ و بزرگان دین کے نام مرقوم ہیں ؛ مثلاً لیلیٰ کی بیماری کی تصویر پر لکھا گیا ہے 'بادشاہزادی'، ایک پر لکھا ہے 'حضرت غوث اعظم پادشاہ' کسی مجلس پر 'فرہاد و شیریں' کسی پر 'حضرت امام حسین بن علی بن طالب'، کسی پر 'حضرت امام حسن رحمۃ اللہ علیہ علی ابن طالب کرم وجہ' (کذا) ۔ ایک پر 'خواجہ فرید الدین عطار' اور ایک پر 'حضرت خواجہ خضر' ۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان تصاویر سے ان بزرگوں کو کوئی علاقہ نہیں ہے ۔

پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ فن مصوری میں دبستان دکن بہ لحاظ مجموعی دبستان اکبری کا مقلد ہے جو اپنے پیش رو دبستان ہرات کا اتباع کرتا ہے ۔ پرشکوہ عمارات ، قدرتی مناظر ، صحرا و باغ ، گل و ریاحین ، سبزہ و لب جو ، طیور و وحوش ، میدان جنگ اور کوہستانی مناظر کے پیش کرنے میں دبستان اکبر بہت پیش پیش ہے ۔ فتح پور سیکری کے قدرتی مناظر اور عمارات اکبری مصورین کے پیش نظر نہیں اور ان کو ، اکثر اوقات کثرت تکرار کے خوف سے بے خبر، عالم رنگ و نقش میں بار بار پیش کرتے ہیں ۔ دور افق میں پہاڑوں کی ٹیکریاں اور پتھروں کی چٹانیں دکھائی جاتی ہیں جن کی ترتیب اور اظہار میں مصورین خاص اہتمام سے کام لیتے ہیں ۔ چٹانوں کے دامن میں سبزہ زار ہے جس کے گرد سر سبز نہال دور و نزدیک نظر آتے ہیں ۔ نیلگوں آسمان میں غروب ہونے والے آفتاب کی ناتوان شعاعوں نے ایک زریں دربا کی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ اس نیم سبز اور نیلگوں سراب میں بسیرا لینے والے پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کو جاتے نظر آتے ہیں ۔ سب سے بلند چٹان پر ایک پہاڑی بکرا اپنی پوری عظمت کے احساس کے ساتھ زیر قدم وادیوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال رہا ہے ۔

قریب قریب یہی خط و خال دبستان دکن میں بھی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ہیں جو مقامی خصوصیات کی مناسبت سے نشو و نما پاتے ہیں ؛ ترتیب اشیاء ، لباس ، چہرے کا حلیہ بعینہ وہی ہے ؛ البتہ انسانی جسم کے دو اعضاء کے اظہار میں وہ مختلف ہے ۔ دکن نے آنکھ کو کٹار

کے ساتھ تشبیہ دی ہے ، سینے کو بہت ابھارا ہے اور کمر کو بہت باریک بنا دیا ہے ۔ دکنی نقاش خاص خاص تصاویر پر اپنا زور قلم دکھاتا ہے اور اکثر تصاویر کو ایک قابل رحم اور غیر تکمیل یافتہ حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے ۔

ایک امر میں ہندوستانی مصور ایرانی نقاش پر تفوق رکھتا ہے ؛ وہ یہ ہے کہ ایرانی مصور تخیل کے اعتبار سے ، برخلاف ایرانی شاعر کے ایک محدود سرمائے کا مالک ہے ۔ ایران کی قدرتی سرسبزی ، چار فصلیں ، باغات کی کثرت ، گل و ریاحین کی بہتات ، طیور و وحوش اور قدرتی مناظر کی افراط سے تو یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہاں کا مصور برعکس اپنے ملکی مناظر اور گرد و پیش کی فضا میں اپنی تصاویر کو بے انتہا متفاوت مناظر اور جذبات کا دلکش مرقع بنا دیتا ہوگا ، لیکن افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کی قوت تخیل نہایت محدود ہے ۔ وہ قدرت کی دل فریب اشیا پر نظر نہیں ڈالتا ؛ اپنے گرد و پیش فطرت کے اعلیٰ نمونوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا ۔ اس کے پیش نظر وہ مرقعے ہیں جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مغولی اور تیموری دبستان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یہ نمونے بجائے خود ہر قسم کے تخیل سے عاری ہیں اور ایرانی مصور کی معراج یہی ہے کہ وہ ان نمونوں کی تقلید کرے ۔ جس طرح شعر میں ایرانی شاعر تقلید کا پابند ہے ، یہی حالت وہاں کے مصور کی ہے ۔ ہندوستان میں شاعر اگرچہ ایرانی شاعری کا مقلد رہا ہے لیکن برخلاف اس کے ہندی مصور نے اپنے آپ پر تقلید کی زنجیروں کا سلسلہ برپا نہیں کیا ۔ صحیفۂ فطرت اس کے پیش نظر ہے اور قدرتی مناظر کی طرح اس کا متخیلہ بھی غیر محدود ہے ۔ وہ فطرت کے نمونوں کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ، اہم ہو یا غیر اہم نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور اس کی تمثال کو نقش و رنگ کے واسطے سے صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیتا ہے ۔

قطب شاہی خاندان مذہب جعفریہ کا ، جو شیعہ فرقے کی ایک شاخ ہے ، متبع تھا اور اسی لیے شاہان صفویہ سے جنھوں نے ایران

میں شیعہ مذھب کو بہ زور شمشیر فروغ دیا تھا ، ان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اور رسل و رسائل کا سلسلہ باھم جاری تھا ۔ شیعہ فقہا نے ایران میں نستعلیق کی بجائے خط نسخ کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی ؛ انہا کی تقلید یا اتفاق سے قطب شاھی دربار میں بھی خط نسخ کو بہت تقویت دی گئی ، چناں چہ اس لیلیٰ مجنوں کا خط بھی نسخ ہے ۔ کتاب کی تقطیع ½۵×۹ ہے ؛ فی صفحہ گیارہ اشعار ھیں اور نہایت صاف جلی قلم میں مرقوم ہے ۔ رسم الخط میں بعض مقامی خصوصیات مشاھدے میں آتی ھیں جو زیادہ تر ھندی اصوات کے اظہار کے لیے ایجاد ہوئی ھیں ۔ چناں چہ جیم فارسی ، رائے ھندی یعنی ڑ اور دال ھندی یعنی ڈ اور بائے فارسی کے نیچے بالعموم تین نقطے دیے گئے ھیں ۔ تائے ھندی یعنی ٹ پر چار نقطے لگائے ھیں ۔ کاف فارسی کو کاف تازی کی طرح لکھا گیا ہے اور بعض اوقات اس کے نیچے بھی تین نقطے دیے گئے ھیں ۔

میں اس کی زبان کی بعض خصوصیات یہاں بیان کرتا ہوں :

عربی و فارسی الفاظ جو روزمرہ میں مستعمل ھیں ، کاتب نے ان کا املا بالکل ھندی طریق پر لکھا ہے ۔

مثلاً فائدہ کو فائدا (الف کے ساتھ) صراحیاں کو 'سراحیاں' یا 'سوریاں' 'ذوق' کو 'زوق' عذرخواھی کو 'عزر خواھی' 'نور' کو 'سور' 'ذرہ' کو 'زرہ' 'افطار' کو 'افتار' 'خوش' کو 'خش' 'خوشی' کو 'خشی' 'راضی' کو 'راجی' 'ساز' کو 'ساج' 'منجم' کو 'مونجم' 'جواب' کو 'جاب' 'خیر' کو 'کھیر' 'مدد' کو 'مدت' 'نثار' کو 'نسار' 'حیا' کو 'ھیا' 'صورت گری' کو 'سورت گبری' اور 'کبیر' کو 'کنبیر' لکھا ہے ۔

جمع کی حالت میں اسم کے آخر میں الف نون عام طور پر زیادہ کر دیا جاتا ہے ۔ امثال : جنس ، جنسان ۔ میوہ ، میویان ۔ نعمت ، نعمتیان ۔ حکمت ، حکمتان ۔ سنبل ، سنبلاں ۔ سوال ، سوالاں ۔ جواب ، جواباں ۔ حرف ، حرفاں وغیرہ ، لیکن ذیل کی صورتیں مختلف ھیں ۔

'رشک' واحد ، 'رشکوں' جمع ، 'دروں' واحد ، 'درونیں' جمع ، 'ابرو' واحد 'ابروں' جمع ، 'صراحی' واحد ، 'سوریاں' جمع -

ایسے الفاظ جن میں حرف دوم ساکن ہے ، شاعر ایسے ساکن کو متحرک کر دیتا ہے ، امثال :

نرم - نرَم (بہ تحریک دوم) سرم ، سَرَم (بہ تحریک دوم) صدر ، صَدَر (بہ تحریک دوم) مچھّر ، مَچَھر (بلا تشدید بہ تحریک دوم) دنیا ، دنیاں - دریا ، درَیا (بہ تحریک دوم و اشمام یا) جرعہ ، جَرُعَ (بہ تحریک سوم و تخفیف دوم) سخی ، سخی (بہ تخفیف تشدید)

بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ شاعر بعض الفاظ میں نون کو غنہ بنا دیتا ہے -

مثال جنگل

جو چمکے ترے عدل کی بجلی جنگل ظلم کا جال لینی چلی

مثال ننگا

ننگے سر ننگے پاؤں ننگے سر پر پھرے شہر میں جن سو کیوں ہوئے کھنبیر

مثال بندہ

جو عاجز بندے عجز سوں پیش آئیں (کذا)
سو بصرہ بخشائے بخشش لجائے

ماضی کے آخر میں الف سے پیشتر ایک 'یے' جو اشمام کے ساتھ بولی جاتی ہے ، اضافہ کر دی گئی ہے - امثال :

کہا - کہیا ، چھوٹا - چھوٹیا ، لگا - لگیا ، لکھا - لیکھیا ، بھرا - بھریا ، مانا - مانیا ، رکھا - رکھیا ، پڑا - پڑیا -

اس مثنوی میں عربی فارسی الفاظ ایک معتدبہ مقدار میں ملتے ہیں ، بعض مثالیں عرض ہیں :

جلال سوں جب یک تجلا کرے تو آکاس کوں نوڑ سرمہ کرے

دیگر

جو توفیق دے شکر کارن کسے
سو وہ پھیر نعمت او کہ ہووسے

سو نعمت پہ پھر شکر لازم کرے
سو اس پر بی جگ شکر قائم دھرے
سو وہ شکر نعمت او کہ ہوئے پھر
سو نعمت ستن یوں بدھے جم بحیر
ولے جن کرے عجز سوں اعتراف
قبولے کرم ساب راکھے معاف
بہو عجز سو آس احمد دھرے
کہ سائیں دکھن عجز رحمت کرے

بعض ہندی الفاظ کے املا میں بھی وہ ہم سے مختلف ہے ۔ مثلاً دکھ ، سکھ ، مکھ ، رکھ وغیرہ کو دکہ ، سکہ ، مکہ ، رکہ لکھتا ہے ۔ لیکن تجھ ، سادھ ، ھاتھ ، کچھ وغیرہ کو نج ، سات ، ھات اور کچ کی شکل میں تحریر کرتا ہے ۔

بعض حروف و اسماء کی قدیم شکلیں دکھائی جاتی ہیں ۔

خیال ، خیال (باشمام یاء) ۔ مشاطہ ، مشاطا (بغیر تشدید) ۔بغیر ، بغر (بہ تخفیف یا) ۔ آزمانا ، ازمانا (بغیر مد) ۔ سالک ، سلوک (بہ فک اضافت) ۔ سبھی ، سبہ ۔ بوند بوند ، بند بند ۔ باھر ، بھر ۔ اکیلی ، یکیلی ۔ سے ، تھے ۔ مجھے ، منجے ۔ اور ، ھور ۔ میں ، مانہ ۔ نہیں ، نانہ ۔ تو ، تیا ۔ بھی ، بی ۔ کبھی ، کبہیں ۔ ہے ، اچھے ۔ کا ، کیرا ۔ میں ، مان (ظرفیہ) ۔ میں ، منی (ظرفیہ)۔ جلانا ، جالنا ۔ گلانا ، گالنا ۔ آگ لگائی ، آگ لائی ۔ جلاجلا کر ، جال جال کر ۔ ہوں ، اچھوں ۔ چھری ، چھوری ۔ میں ہوں ، میں سو ۔ کبھی ، کدھیں۔ بہت ، بھوت ۔ بہت ، بھوتیکر۔ طرح، دھاتھ ۔ تیرا سبق، تجھ سبق ۔ سب کچھ ، سب کوچ ۔ بجلی ، بیجلی ۔ جلا لیتی ، جال لیتی ۔ کیا ، کیتا ۔ دیا ، دتیا ۔ جوش کرکے ، جوش کر کن ۔ سراھنا ، سرھاناں ۔ رکھتا ، راکھتا ۔ آپ ، آپیں ۔ سورج ، سوو ۔ چاند ، چندا (بانون غنہ) ۔ جو کچھ ، جے کچ ۔ کا ، کرا ۔ تک ، لک ۔ چوما ، چمیا ۔ بہت ، بھوتیک ۔ ھزار ، سہس ۔ میرا ، منج ۔ بھنورا ، بھنور (بہ تحریک واو) ۔ سے ، تے ۔ کہ ، جو ۔ انہوں کا ، انوکا ، ساتوں ، سیں ۔ کے ، کہ ۔ تلے ، تل ۔

مثنوی کے افتتاحیہ ابیات یہ ھیں :

اس اللہ کے نانوں سوں سب جگ
جودانی دیا دنب اس کی صفت

سرھانا سب اللہ کوں جم قرار
جو جگ کا دھنی ھور پروردگار

جو دنیا میں کافر مسلمان کوں
منگے من سو بخشے بھوماں سوں

شاعر نے حمد کے بعد تین مناجاتیں لکھی ھیں ۔ ان مناجاتوں کے پہلے پہلے بیت درج کرتا ھوں :

مناجات اول

الہی جو میں داس ھوں تودھی سدا میں گدا ھور تو ھے غنی

مناجات دوم

رحیمی سو رحمت کرے سو رحیم کریمی کے سب گن دھرے سو کریم

مناجات سوم

جگ کا عی سب سکت کا دھنی جو اسکوں سبھی کبریا ھور منی

یہ کتاب محمد قلی قطب شاہ کے نام پر لکھی گئی ھے ۔ سرخی کے علاوہ بادشاہ کا نام شعر ذیل میں ملتا ھے :

محمد قلی قطب شاہ ھے شاھاں جسے چرن سیوک شاھان جہاں

بادشاہ کی فرمائش کا ذکر ذیل کے ابیات میں ملتا ھے ۔

جو منج بخت کو فتح یاور ھوا
سو منج بخت کا سیوک انبر ھوا

جو شہ آپ بھے آپ منج یاد کر
منجے غم کی بندگی تھے آزاد کر (کذا)

دیتی امر علی کی یہ باغ لاؤں
جو پا لوں اپے شہ امر یب نانوں

جو میں شاہ کا امر سر پر لیتا
نرب باغ لانی شتابی کیتا

بھوتیک پریشانئی روزگار
اگرچے منجے ہے ملامت سو بار

بھو تیک شغلاں ستبں راہ دن
نتھی منج فرصت بھلڑ یک بن

ولے آس دھر شہ کے فرمان پر
لگیا تن سنگارن بھو قصد دھر

دھریں عشق کی باس اس بنکی پھول
جو اس باس پرجوں بھنورجگ کوں بھول

سو کج عشق کوں اب جگ میں جگاؤں
جو گھرگھر کے لیلیٰ و مجنوں او حاؤں

جو لیلیٰ و مجنوں تھے بولوں پوران
سو تازہ کروں اب انوں کا پوران

جو اس بن چمن پر تھے گزرے پون
پون باس تھے باس لے سرک بن

جو اس باغ پر شہ کا داغ ہے
سو باغوں میں یہ باغ شہ باغ ہے

دھنی باغ کا شہ میں باغبان
بھنور باغ کا کیوں نہوے آسان

جو اس باغ مہکار تھی جگ بھرے
سو سرمست کر قدسیاں کو دھرے

سو کج شہ کوں یہ بن مبارک رھو
چو اس بن تھے ہر روز نو روز ھو

شہنشہ کے ارکاں دولت جے کوئی
مبارک انوں پر بھی یہ باغ ہووے
جکوئی باغ کی باغبانی کرے
سو اس باغ تھے شادمانی کرے
دھی باغ کا باغباں کوں نوار
ہو مرحمت سوں کرے سرفراز
جو احمد کرے آس دھر بن سنگار
سو اب شہ تھے پائے سیتیں سنگار

احمد ایک ایسے عہد میں جب کہ اردو زبان اپنا گہوارہ چھوڑ کر گھٹنوں چلنے کی کوشش کر رہی تھی ، خاصی مہارت اور نادر الکلامی کا ثبوت دے رہا ہے ۔ اشعار آیندہ میں اس نے مجنوں کے باپ کے جذبات کا خاکہ کھینچا ہے ۔ موقع یہ ہے کہ قیس آبادی کو چھوڑ کر جنگل آباد کر چکا ہے ، اس کے باپ کو خبر ہوتی ہے ، بے تاب ہو کر آتا ہے ، فرزند کی زار حالت دیکھتا ہے ، اس کا دل کڑھتا ہے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے :

گیا پوت کا سکھ دکھن آس سو
رہیا پوت کے دکھ سوں نر آس سو
بری آگ تھے جیو میرا جلے
بری آہ تھے موم ہوین گلے
کیتا سو جلے ہور جالے منجے
تیا کیا گلے ہور گالے منجے
جوبوں ہے پیار نین منج کوں
ہنسوں کیوں جو روتے دیکھوں تیں کوں
میرا جیو ہے توں مرے لاڈلے
جلے جیو جس کا سو کیوں نا جلے

رکھیا آس جو توں بساوے محل
محابا کہ توں یوں جگاوے جنگل

جو گھر چھوڑ جنگل بسانے لگیا
سو بج تھے جنگل ہور جنگل ہی جلیا

نین میکہ برسن جو ہوئے نپاس
گلے ہر بتاں ہور جلے سب اکاس

ولے دل ترا کچ پگھلتا نہیں
جو مرے کبھے ساب حلتا نہیں

رہی مائی جاں کندنی من جرم
سو اس پر نہیں چک بیرا کرم

ولادت مجنوں :

معمر از خدا کوں قدرت رکھے
جو پانی سوں سورہ گیری[۱] کر سکے

بہو چاہو کیتی دیکھت کرب جب
سو پورے ہوے کرب کے ماس سب

جو ناموس کوں چودواں چاند ہووے
ار کھایا اجالا کیتا جگ دوئے

نکھا مکھ مبارک دیکھی دائی جب
سنی میں دبی سرنھی پگ لاگ سب

اپے دائی پھل تیرسوں سر نہلائی
دلے ان کنک دان سوں سیس نہائی

بچھائی اوڑائی اسولک حریر
کیتی دائی کوں مال دیکر کنبھیر

---

۱ - غالب صورت گری مراد ہے (مرتب) -

خوشیاں کرا دے قیس راکھی جو نام
لگی وارنے دام اس پر تمام

خرسنے دفمنے دیسی وار وار
سو سگے فمیراں ہوئے مالدار

احمد کے کلام میں پختگی کے علاوہ اس کی زبان میں صفائی اور
ور دونوں موجود ہیں ۔ یہ ابیات ملاحظہ ہوں جن میں ایک بزرگ
نوں کے باپ کو اس کے اولاد نہ ہونے پر تسلی دیتے ہیں :

خداوند جگ کا کریم و رحیم
جکچ دیس حکمت سودے دو حکم

ہے کچ حکمت اس کی تماشا کرے
سو وہ چھور کس دھابھ دوجا کرے

ہیں باج حکمت کچ اس کا کھیا
لس مصلحت کچ لیا ہور دیا

ہو تیک مراداں نہوے مرحمت
سو اس میں اچھیں خیر ہور مصلحت

کسی پر سو نعمت بلا ہو بھرے
کسی کو بلا دے سو نعمت کرے

نہ اسھی بلا دیک نہ آس ہووے
نہ نعمت کوں بھل کرسٹی دھاک کوے

ان اشعار پر بھی نظر رہے :

(۱) میری خاک میں سے جو ابھرے نہال
وفا کے لگے پھول پھل ڈال ڈال

(۲) جو روشن کرے رات کوں آہ سوں
سو ہوے روشی دین کی راہ کوں

(۳) سنے کی چھوری ہوئے تو کیا ہوا
نہیں پیٹ میں مار لینا روا

دکن میں اردو کے ساتھ ساتھ طبقۂ عوام میں فارسی بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی لیکن وہ اس قسم کی فارسی ہے جس پر تعلیم یافتہ طبقہ ہر زمانے میں ناک بھوں چڑھائے گا۔ احمد دکنی اس مثنوی کا ناظم اردو کا زبردست شاعر ہے لیکن فارسی سے بے بہرہ ہے۔ اگرچہ اپنی مثنوی میں اس نے بعض موقعوں پر حکمت اور نجوم کی اصطلاحات کو خوب برتا ہے۔ وہ اپنے مذہب سے بھی جو شیعہ تھا، بہ‌خوبی واقف معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک شعر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوستان سعدی سے بے خبر نہ تھا؛ مثلاً سعدی کے مصرع

"مر او را رسد کبریا و منی۔"

کا بجنسہ اس نے اپنی زبان میں اس طرح ترجمہ کیا ہے: ع

" جو اس کو سہی کبریا ومنی "

تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فارسی ہمارے عہد کے کالجوں کے انگریزی خواں طلبہ کی فارسی سے کسی طرح بہتر نہیں تھی۔ میں اس کتاب کی سرخیوں سے جو فارسی میں مرقوم ہیں، بعض فقرات نقل کرتا ہوں:

"نزد درویش بردند مجنوں را پدر او"

دیگر: "مجنوں فقیر شده به خانۂ لیلیٰ رفتند"

دیگر: "آں صحیفه دیدن لیلیٰ و باز مضمون آں صحیفه فرستادن نزد مجنوں"

دیگر: "پدر مجنوں بخانه لیلیٰ رفتن" (کذا)

دیگر: "پنہاں کردند لیلیٰ را دشنام دادند مادر"

دیگر: "پدر لیلیٰ دختر خود را بردندمجنوں‌نزد شتر لیلیٰ آمدند"

دیگر: "در خواب لیلیٰ مجنوں مرده دید خود واتپ آمدند "

میں نے دانستہ احمد کی شاعری کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے اس ، لیے کہ ایک قدیم زبان کے ساتھ جو اب سے ہیں سو سال پیشتر رائج تھی ، وہی شخص انصاف کر سکتا ہے جو اس زبان کا پورا ماہر ہو ۔ اس امر میں شک نہیں کہ ادب اردو کی تاریخ میں اس مثنوی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اس کے ذریعے ہمیں ایک ایسے شاعر کا سراغ ملا ہے جو اب تک نا معلوم تھا ۔ دکن میں جتنے شعرا گزرے ہیں اور جن کے حالات تذکروں میں ملتے ہیں ، سب کے سب محمد قلی قطب شاہ اور احمد کے دور کے بعد کے ہیں ۔ اس نظر سے بھی یہ مثنوی خاص وقعت کی مستحق ہے ۔

یہاں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ احمد کے ہاں جو نظم کی حالت دیکھی جاتی ہے ، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مثنوی کا ابتدائی نمونہ نہیں ہے ، بلکہ ایک ایسے وقت کی یادگار ہے جب کہ نظم نے ایک معتدبہ حد تک ترقی کر لی تھی ، اس لیے ضروری ہے کہ سلاطین بہمنیہ کے دور میں بھی اردو شعرا موجود ہوں ، لیکن ان کے کلام کا سراغ لگانا حضرات دکن کا کام ہے ۔

سب رس

ملا وجہی کی قابل قدر تصنیف 'سب رس' (یعنی قصہ حسن و دل) مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے مرتب کر کے ۱۹۳۲ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شائع کی تھی - زیر نظر مضمون حافظ صاحب مرحوم نے 'سب رس' پر بطور تبصرہ تحریر کیا تھا اور 'اورینٹل کالج میگزین' بابت نومبر ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا - (مرتب)

فتاحی نیشا پوری نے 'حسن و دل' کا ایک مثالی افسانہ نویں صدی ہجری میں اولاً فارسی نظم میں ، بعدہ نثر میں لکھا - اس کے بعد متعدد اشخاص نے اس پر طبع آزمائی کی جن میں زیادہ تر ترکی اور ہندوستانی اہل قلم شامل ہیں - ترکوں میں آہی ، لامعی اور صدقی کا نام ملتا ہے - ہندوستان میں داؤد ایلچی نے فارسی میں اور شاہ عبدالعرفان اور شاہ پیراللہ مجرمی نے دکنی میں نظم کیا - اہل مغرب نے بھی اس میں دلچسپی لی ہے - آرڈر براون نے ۱۸۰۱ء میں اور ولیم پرائس نے ۱۸۲۸ء میں اس کے تراجم بہ زبان انگریزی کیے - جرمن ڈاکٹر رڈولف دوراک نے ۱۸۸۹ء میں اصل فارسی متن مع ترجمہ ایک منتقدانہ مقالے کے ساتھ شائع کیا اور مسٹر گرین شیلڈس نے ۱۹۲۶ء میں اصل فارسی متن پھر طبع کیا - اس سے ظاہر ہے کہ قصۂ حسن و دل کو فتاحی کے زمانے سے لے کر اب تک خاصی شہرت رہی ہے اور ایک جماعت اس میں دلچسپی لیتی رہی ہے -

ہمیں مولانا عبدالحق پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد و اڈیٹر انجمن ترقی اردو کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس سلسلے میں

ایک نہایت اہم تالیف دریافت کی ۔ اس سے ہماری مراد ملا وجہی کی نثری تصنیف 'سب رس' ہے جو ۱۰۴۵ھ میں عبداللہ قطب شاہ والی حیدر آباد (۱۰۳۵ھ - ۱۰۸۳ھ) کے واسطے دکنی زبان میں لکھی گئی ۔ مولانا نے علمی دنیا کو سب سے پہلے اس کا سراغ ایک عالمانہ مقالے کے ذریعے سے جو اپریل ۱۹۲۵ء کے رسالۂ اردو میں چھپا تھا ، دیا اور اب اصل کتاب مع مقدمہ و فرہنگ مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد ترتیب دے کر شائع کی ۔

کتاب کے صفحات کی تعداد ۳۷۲ ہے جن میں مقدمے کے ۵۲ ، کتاب کے ۳۰۰ ، فرہنگ کے ۱۶ اور غلط نامے کے ۴ صفحات ہیں ۔

وجہی کے حالات میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ وہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا ایک زبردست عالم ، بلند پایہ شاعر اور بے مثل ادیب ہے ۔ 'سب رس' کے علاوہ جیسا کہ فاضل مرتب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے ، وہ 'تاج الحقایق' ایک نثری تالیف اور مثنوی 'قطب مشتری' کا مالک ہے ۔ علوم میں اس کا پایہ معلوم نہیں لیکن اس کے اس کارنامے سے جو ہمارے پیش نظر ہے ، اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اسلامی علوم والسنہ کے علاوہ ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کو کافی دسترس ہے ۔ مرہٹی اور گوجری (گجراتی اردو) کے ساتھ ساتھ گوالیری (برج بھاشا) کے لٹریچر سے آشنا ہے ، امیر خسرو کے ہندی کلام سے واقف ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ اردو (جسے وہ زبان ہندوستان اور قول اہل ہند کے ناموں سے یاد کرتا ہے) بھی جانتا ہے ۔ اب جو شخص عربی ، فارسی ، برج ، گوجری ، اردو اور مرہٹی سے واقف ہو اور ان کے چیدہ اور منتخب اساتذہ کے کلام پر عبور رکھتا ہو ، شعروادب کے نکات کو سمجھتا ہو ، صحیح دماغ ، نکتہ رس طبیعت اور بلند تخیل کا مالک ہو، ظاہر ہے کہ اس کا ادبی مذاق کس قدر شائستہ اور شستہ ہوگا ۔ وجہی کی خوش مذاقی کے ثبوت میں یہ کتاب پیش کی جا سکتی ہے ۔

'سب رس' اس دیں اور رنگیں طرز میں لکھی گئی ہے جس کو مقفیٰ اور مسجع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ فارسی اور عربی میں اس

انداز کی بہت کتابیں ملتی ہیں جن میں زیادہ مشہور 'مقامات بدیعی' 'مقامات حریری'، 'مقامات حمیدی'، 'تاریخ وصاف'، اور 'درۂ نادرہ' قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان میں دو کتابیں مشہور ہیں؛ پہلی 'نو طرز مرصع' از تحسین، دوسری 'فسانۂ عجائب' از مرزا رجب علی بیگ سرور۔ موجودہ دور میں جب ہمارا صحیح مشرقی مذاق اپنے مرکزثقل سے ہٹ کر مغربی دوق و وجدان کی طرف جھکتا جا رہا ہے، ہم نثر کے ایسے مرصع کاروں اور عبارت کے معماروں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن تکلف اور طمطراق ہماری تہذیب کا ایک ما بہ الامتیاز ہے اور اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو نثر کے سادہ کاروں کی بجائے مرصع کاروں کو پسند کریں گے۔ نثر عموماً روکھی پھیکی اور سادہ ہوتی ہے۔ دقت پسند طبائع اس میں سجع کی چاشنی دے کر خوش آیند بنانا چاہتی ہیں اور نثر میں نظم کا لطف پیدا کر دیتی ہیں اور جس قوم نے اپنی طفولیت کے زمانے میں قرآن پاک کی مسجع اور خوش آہنگ آیات بینات کی تلاوت کی تھی کس طرح ممکن ہے کہ وہ قوم بڑی ہو کر اس خاص طرز نگارش میں کوئی دلچسپی نہ لے۔ رنگینی اور رنگیں بیانی مسلمان قوموں کی گھٹی میں پڑی ہے۔

وجہی نے جب آنکھ کھولی ہے ہندوستان میں فارسی زبان کا دور دورہ تھا۔ شمال اور دکن میں فردوسی، سعدی، خسرو اور حافظ کے نام لیوا موجود تھے۔ نظم میں تازہ گوئی اور نثر میں خیال بندی اپنا سکہ جما رہی تھی۔ ظہوری نے دکن میں اور ابوالفضل نے ہندوستان میں نثر کے ایسے اعلیٰ نمونے پیش کیے جو آیندہ چل کر ادبی شاہکار مانے گئے۔ عرفی، نظیری اور فیضی نے شعر کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ مغل اور دکنی سلاطین کے زرق برق درباروں میں ایرانی اور ہندوستانی باکمالوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں اور گھر گھر فارسی کا چرچا تھا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان تہذیب و شائستگی میں رشک صفاہان و شیراز تھا۔ وجہی تہذیب و تربیت کے لحاظ سے بالکل فارسی رجحان کا ادیب تھا اور جن بلند ادبی نمونوں کی فضا میں

اس نے ترتیب پائی ، انھی کے اتباع میں اس نے اپنے اس شاہکار 'سب رس' کی بنیاد ڈالی ۔ فارسی میں رنگیں نگاری چنداں مشکل نہیں ہے ۔ لیکن وجہی نے اپنی ادبی مہم کے لیے جس زبان کا انتخاب کیا وہ اردو تھی ، جس زبان میں اس کا کوئی رہبر تھا نہ پیش رو ۔ اردو ان ایام میں محض معمولی بول چال اور تفریح کا ذریعہ تھی ۔ اس میں ہر قسم کا ادبی سرمایہ مفقود تھا ۔ نظم میں البتہ گجرات اور دکن میں بعض تالیفات تھیں لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے مطلع بالکل صاف تھا ، سناٹے اور ہو کا عالم تھا ۔ ان حالات میں وجہی کا دنیا کے سامنے یکایک ایسی بلند پایہ تصنیف پیش کرنا در حقیقت اعجاز سے کم نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وجہی کو اپنی جدت طرازی کا پورا پورا احساس ہے ۔ اس نے اردو میں جدید شاہراہ کھولی ہے ، وہ اس کی اہمیت اور مہم کی دشواریوں کا ذکر بار بار دیباچے میں پورے شد و مد کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں کرتا ہے :

''فرہاد ہو کر' دونوں جہان تے آزاد ہو کر ، دانش کے تیشے سوں پہاڑاں اُلٹایا تو یو شیریں پایا ، تو یو نوی باٹ پیدا ہوی تو اس باٹ آیا ۔'' (صفحہ ۱۳)

''جکوئی اچایا بنیاد ، اول آخر وہی استاد ۔ یو عجائب نظم ہور نثر ہے ۔ جانو بہشت میں کا قصر ہے ۔ سطر سطر پر برستا ہے نور ، ہر یک بول ہے یک حور ۔ اسے پڑ کر جنے حظ پایا ، جانو بہشت میں آیا ۔'' (صفحہ ۱۴)

بہر حال وجہی اپنے کارنامے پر اور اردو وجہی پر جس قدر فخر کرے کم ہے ۔

'سب رس' کا طرز بیان رنگینی کے التزام کے باوجود شگفتہ اور دلکش ہے ۔ عبارت کی آرائش اور قافیے کی پابندی کے باوجود مصنف سے سلاست کا دامن نہیں چھوٹا ہے ۔ کتاب اگرچہ دکنی میں لکھی گئی ہے اور دکنی بھی وہ جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانوں میں بولی جاتی تھی ، تاہم اردو خواں اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔

کتاب کا پلاٹ چنداں دلچسپ نہیں ، فرائض افسانہ نگاری سے عام طور پر پوری غفلت برتی گئی ہے ۔ لیکن ایک ادبی پائے کی تصنیف میں یہ نقص چنداں قابل لحاظ نہیں ۔ ایسی تصنیفات کا مقصد در حقیقت افسانہ نگاری نہیں ہوتا بلکہ افسانے کے پیرائے میں اخلاق سبق اور درس حیات دینا اور ساتھ ہی متین خیالات کو ایک دلفریب پیرائے میں ادا کرنا : اسی لیے ایسی کتابوں میں اخلاق پہلو ہر بہانے سے نمایاں کیا جاتا ہے اور طبیعت کا تمام زور اسی پر صرف کر دیا جاتا ہے ۔ نظامی خسرو اور جامی کی مثنویات کا یہی ڈھنگ ہے اور اس نقطۂ نظر سے 'سب رس' ان کی نہایت قریبی مقلد ہے ۔

مصنف کی عام معلومات ، دوسری زبانوں کے لٹریچر سے اس کی وسیع آشنائی اور عام زندگی کے تجربے نے اس کو اس بات کا اہل بنا دیا ہے کہ زندگی کے اخلاق اور معاشی مسائل ، فضائل و رذائل اور معائب و اوصاف پر صحیح طریقے سے رائے زنی کر سکے ۔ اس تعلق میں وہ اپنی معلومات کے ذخیرے سے جو غیر محدود معلوم ہوتا ہے، کام لیتا ہے ۔ آیات کلام پاک ، احادیث و اقوال بزرگاں ، اساتذہ کے اشعار اور دیگر مختلف زبانوں کی امثال کے برمحل ایراد سے کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے بلکہ اپنی طرف سے بھی پاکیزہ خیالات اور چست فقرات کا اضافہ کرتا ہے ۔

ادبی پہلو سے قطع نظر اور اوصاف ہیں جن کی بنا پر یہ کتاب گوناگوں دلچسپیوں کا مرکز بن جاتی ہے ۔ لغت و لسان اور قدیم صرف و نحو کے محقق اس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھیں گے ۔ بالخصوص اس کے اس حصے کو جو قدیم محاورات اور ضرب الامثال سے تعلق رکھتا ہے ۔ اسی طرح فارسی بھی اس میں نمایاں حصہ لیتی ہے ۔ اردو پر فارسی کا اثر صرف الفاظ و محاورات و ضرب الامثال تک محدود نہیں ہے بلکہ اسلوب بیان ، طریق ادا اور حرفی پہلو تک پر عامل ہے ۔ آیندہ صفحات میں انہی چند خصوصیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے ۔

جن بعض امور پر یہ کتاب بالواسطہ روشنی ڈالتی ہے ان میں

سب سے اہم وہ ہے جو اردو اور برج سے متعلق ہے ۔ ہمارے ہاں یہ نظریہ مقبول عام ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے ، یعنی جب سے برج بھاشا میں فارسی عربی الفاظ کا پیوند ہونے لگا اردو پیدا ہوگئی ۔ یہ نظریہ اردو زبان کے بہترین مورخ مولانا آزاد کا ہے ، لیکن وجہی کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں زبانیں بالکل مختلف ہیں ۔ اردو کو زبان ہندوستان یا قول اہل ہند کہتا ہے اور برج کو گوالیری کے نام سے یاد کرتا ہے ؛ جس طرح اردو نام قدیم نہیں ہے اور خان آرزو کے عہد سے رواج میں آیا ہے ، اسی طرح برج نام بھی قدیم نہیں ، فارسی اہل قلم اردو کو ہندی یا ہندوی کہتے ہیں اور برج کو گوالیری ۔ مغلیہ عہد کے مصنفین ابوالفضل ، عبدالحمید لاہوری ، محمد صالح بلکہ خان آرزو تک برج کو اسی نام سے پکارتے ہیں ۔ وجہی ان دونوں زبانوں سے دوہرے اور کہاوتیں نقل کرتا ہے ۔ دوہرے گوالیری سے اور کہاوتیں اردو سے ، اور جہاں جس زبان سے اس نے کچھ لیا ہے وہاں اس زبان کا حوالہ دے دیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہندوستانی اور گوالیری کو دو مختلف زبانیں مان رہا ہے ۔ خان آرزو جو وجہی کی طرح ان دونوں زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں ، پھر ان زبانوں کو دو مختلف زبانوں کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں ۔ ایک ان کے نزدیک گوالیری ہے جو 'افصح السنۂ ہند' ہے اور دوسری 'زبان اردوی معلیٰ' یا 'زبان شاہجہان آباد'۔ ان بزرگوں کے بیانات کی رو سے جن میں پورا ایک ڈیڑھ صدی کا فاصلہ ہے ، صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں زبانیں معاصر ہیں اور ان میں ماں بیٹی کے تعلقات ہرگز نہیں ہیں ۔

امیر خسرو کی ہندی شاعری ہمارے ہاں معرض بحث میں ہے ۔ 'سب رس' میں خسرو کا ایک ہندی دوہرہ درج ہے وھوھذا :

بیت

پنکھا ہو کر میں ڈولے ساتی تیرے جاؤ
منجھ چلتے جم گیا نیرے لیکھن باؤ

یہ گویا ایک قدیم ماخذ ہے خسرو کی ہندی شاعری کا ۔

عربی اقوال

کتاب میں عربی مقولے کثرت سے ملتے ھیں اور مصنف نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ ان کا استعمال کیا ھے :

(صفحہ ۲۳) جس میں سلوک وھی سالک نہیں نو، مذبذبین بین ذالک ۔

(صفحہ ۵۸) دانایاں مبں یوں چلی ھے بات ، العقل نصف الکرامات ۔

(صفحہ ۱۶۷) مرتضی فرماے ھیں: جنو کی باب دایم قایم ، عرفت ربی بفسخ العزائم ۔

(صفحہ ۱۷۳) کھولے ھیں اسباب کی گرہ ، کہے ھیں ، الدنیا مزرعہ الآخرہ ۔

(صفحہ ۱۸۱) صبوری ے دنیا صبوری تے دین ، مصحف کی آیت ھے ان اللہ مع الصابرین ۔

(صفحہ ۲۰۱) مصحف میں یوں دیے ھیں خبر ، اذا جاء القضا عمی البصر ۔

(صفحہ ۲۰۸) مصحف کی آیت بھی آئی ھے یہاں رھنموں ، کل حزب بمالدیہم فرحون ۔

(صفحہ ۲۵۶) ھمنیچہ (ھمیں) نیں سمجے کس کا کیا کرنا گلہ ، پیغمبر کہے ھیں کہ 'المرء عند المعاملہ' ۔

(صفحہ ۱۸۳) عاقلاں نے بی یوں کہے کہ ، آخرالدواء الکیے ۔

صرفی خصوصیات

ضمائر

بعض تو وھی ھیں جو اردو میں رائج ھیں ، بعض ایسے ھیں جو اردو سے مختلف ھین ۔ میں ان کا یہاں ذکر کرتا ھوں :

۱) فاعلی جمع متکلم = ھمیں (ھم) :

(صفحہ ۱۴۶) ''ھمیں بی عجب مرد ھیں ، بہت کوئی بڑے فرد ھیں ۔''

(صفحہ ۸۰) ''دنیا مں کون سنا راست کرتا ، همیں عبث گیے تھے سنے کی آس اسا ۔'' (یعنے هم نے)

(صفحہ ۲۵۹) ''انو کے دلاں مں که همیں کرتیاں هں ناز ۔''

(۲) مفعولی جمع متکلم = همنا (هم کو) ۔

(صفحہ ۲۲) ''همنا هماری نہایت کی معلوم نں هوتی خبر ، اس کے نہایت کی کسے خبر ۔''

(صفحہ ۱۱۸) ''ظاهر کی صورت ہماری دیکھتے هیں ، اپے باطن کی همنا کوں دکھاؤ ۔''

(۳) مجروری جمع متکلم = همناتے (هم سے) ۔

(صفحہ ۱۴۶) ''هر ایک کام اپے سنبھالتا آتا هے ، نیں تو کیا همناے سنبھالیا جاتا هے ۔''

لیکن نہایت تعجب سے دیکھا جاتا هے که 'هم' جو اردو میں اس قدر عام هے ، اس کتاب میں بہت کم ملتا هے ۔

(۴) فاعلی جمع حاضر = تمیں (تم) ۔

(صفحہ ۲۴۷) ''کھانے میں تے اڑیا لون ، اتال تمں کون همیں کون ۔'' (یعنی تم)

یہاں علامت جمع حذف کر دی گئی هے اور یاد رهے که امثلۂ آئندہ میں بجائے خطابیہ 'هو' غائب کی علامت 'هیں' لائی گئی هے ۔

(صفحہ ۸۸) ''نظر پوچھیا که تمیں کون ، هیں کیا نام دھرتے هیں ، کیا کام کرتے هں ؟''

(صفحہ ۱۱۹) ''تمیں دونوں ہی میرے پر عاشق هیں ۔''

(۵) واحد غایب = آن (اُس) ۔

(صفحہ ۱۳۱) ''آن نے سنیا که دل اتال جاتا هے ۔''

(صفحہ ۵۱) ''آنے کہیا اے پیر سلام صاحب ندبیر سلام ، انے کہیا اے جوان علیک سلام ۔''

(صفحہ ۱۴) ''جنے خلیفے کوں نیں سمجھیا اونے کیا سمجھیا ۔''

(٦) جمع غائب = انو (انھوں) ۔

(صفحہ ۱۲) ''جنوں کے دل میں دانش نے کیا تھا گھر ، انو دیکھتیچ کہے کہ نبی حق کے برحق پیغمبر ۔''

(صفحہ ۱۲) ''انو کے دلاں انو کیاں انکھاں انو کے کاناں قدرت سوں باند کر غفلت کی دی گرہ ۔''

(٧) جمع غائب = اینو (انھوں) ۔

(صفحہ ۳۸) ''تیرے پاس ہی . . . . صاحب شمشیر صاحب تدبیراں ہیں ، اینو کا دل ہات لے ، اینو کی موں کی بات لے، اینو سوں قول قرار اچھہ ۔''

اسم اشارہ

واحد قریب : ان (اس) ۔

(صفحہ ۱۳۲) ''اں چورنے ان حرام خور نے چاڑی کھایا ۔''

(صفحہ ۲۵۵) ''ان چھنال نے مجھے جیوں ماری ، ان چھنال نے اپنا دند ساری ، ان چھنال نے میرا گھر گھالی ، ان چھنال نے مجھے دیس انتر دی ۔''

ایضاً = یو (وہ) :

(صفحہ ۱۳) ''دانس کے تیشے سوں پہاڑاں الثایا تو یو شیریں پایا ، تو یونوی بات پیدا ہوی ۔''

(صفحہ ۵٦) ''لہوے تے یو ملک یوراج آیا ، لہوے تے یو تخت یو تاج آیا ۔''

واحد بعید = وو (وہ) ۔

(صفحہ ۱۵۳) ''جس کوٹ کوں کوٹ کہیا جاے سویو کوٹ ہے ، یو کوٹ ہوے تو وو کوٹ سہاوے ، یو کوٹ نہیں تو وہ کوٹ کیا کام آے ۔''

جمع قریب = یو (یہ) -

(صفحہ ۳۹) ''انو کا عشق فاش ہوا تو یو حکایتاں چلیاں آجنوں -''

(صفحہ ۱۳۲) ''یو دونو جنے مل کر منگتے ہیں جو دل کوں دیدار کے شہر کے اودھر لے جاویں -''

(صفحہ ۱۴۴) ''یو بولاں لوگاں رکھے ہیں چن چن -''

(صفحہ ۹۲) ''حسن یو سواد بھریاں باتاں سن ، یو کھریاں باتاں سن کچھ فکر دل پر لیائی -''

اس آخری 'یو' کو اگرچہ اس میں کوئی علامت جمع موجود نہیں ، میں نے جمع مان لیا ہے ، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری زبان ایک بڑی حد تک جس میں صرفی امور بھی شامل ہیں ، قدرتاً فارسی کا اتباع کر رہی ہے اور فارسی میں قاعدہ ہے کہ جس طرح واحد کے ساتھ اسی طرح 'ایں' یا 'آں' جمع کے ساتھ بھی لایا جاتا ہے مثلاً 'ایں مرد' و 'این مرداں' نہ 'این مرد' و 'ایناں مرداں' - اردو جو فارسی کے آغوش میں پرورش یافتہ ہے ، اپنی دکنی شاخ میں جو قدیم ہے اس قاعدے کی پابند ہے ؛ اسی لیے پچھلی مثالوں میں 'یو' اسم اشارہ خلاف قیاس - بولاں حکایتاں وغیرہ مشارالیہ جمع کے ساتھ آ رہا ہے - حالاں کہ اردو میں اسم اشارہ جمع میں بھی موجود ہے، یعنی ان اور آن وغیرہ - میں اپنے اس عقیدے کی تائید میں مثال ذیل عرض کرتا ہوں :

(صفحہ ۵۶) ''معدن اس داروان کا دلربا شہر دیدار ہے -''

اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ داروان جمع کے ساتھ 'اس' واحد لایا گیا ہے ، حالاں کہ مصنف اس کی بجائے اگر 'ان' کہہ دیتا تو زیادہ صحیح ہوتا - مگر چوں کہ دکنی فارسی کی مقلد ہے اور فارسی میں ایسی صورت میں 'معدن ایں داروھا' لایا جاتا ہے اس لیے وجہی مجبور تھا کہ محاورے کے مطابق 'اس' لائے - جدید اردو میں اس میں شک نہیں اشارہ اور مشارالیہ دونوں جمع آتے ہیں یعنی 'ان داروں کا معدن' - ان مثالوں پر بھی نظر ڈال لی جائے ؛

(صفحہ ۱۱) ''آج لگن کوئی اس جہان میں ، اس ہندوستان میں ، ہندی زبان سوں ، اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کر یوں نیں بولیا ۔''

اس مثال میں 'چھنداں' جمع کے ساتھ 'اس' واحد آیا ہے ۔

(صفحہ ۲۱) ''کیا تھا ، کیا ہے ، کیا ہوے گا ، اس باتوں سوں ہمنا کیا کام ، ہمنا خدا کوں ایک جاننا ہور اس کا محب ہے فرض ، خدا کے کاماں سوں ہمنا کیا عرض ۔''

یہاں 'اس باتوں' اردو محاورے کے خلاف ہے ۔

(صفحہ ۵۲) ''جس انکھیاں کو دیدار کی لگی حیرانی ، اس انکھیاں کا کیوں نہووے ایسا پانی ۔''

اس مثال میں بروئے قاعدہ 'جن انکھیاں' اور 'ان انکھیاں' چاہیے مگر مصنف فارسی کی تقلید کر رہا ہے ۔

(صفحہ ۱۱۴) ''ایک جھاڑ اسے کتیاں ڈالیاں سن ، ہر ایک ڈالی میں جنس جنس کے گن ، اس ڈالیاں میں بھی رنگ رنگ کے پھلے ہیں پھول ، پھول کنا میں ڈالی تے آیا، ڈالی کتی میں جھاڑ میں نے آئی ، سب جھاڑ ہے نکو بھول ۔''

اس میں 'ڈالیاں' فارسی محاورے کے مطابق ہے ۔

(صفحہ ۱۵۸) ''وہم کی باتاں کا اس پر اثر چڑیا ، جو کچھ وہم کیا تھا سو اس کاماں کے خیال میں پڑیا ۔''

یہاں یہ بھی اضافہ کیا جاتا ہے کہ ہمارےہاں ضمیر اور اسم اشارہ میں بھی التباس ہو جایا کرتا ہے ۔ 'وہ' 'اس' 'ان' وغیرہ میں جو اسم اشارہ بھی ہیں اور ضمیر بھی ، تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے ۔ یہ بے ضابطگی خود ہماری پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اسے فارسی سے میراث میں ملی ہے ۔ فارسی میں بھی 'او' ضمیر اور 'آن' اشارہ میں مغالطہ ہو جایا کرتا ہے ۔ چناں چہ قواعد نگار اس گنجلک کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

'آن' اگرچہ بہ ظاہر مشترک ہے مگر در حقیقت اشارہ و ضمیر میں فرق ہے - چناں چہ کہہ سکتے ہیں : آنکس ، آں مرد ، اور نہیں کہہ سکتے اوکس ، او مرد -'' (جامع القواعد)

میں نے امثال بالا میں 'ضمیر' اور 'اشارہ' کی شناخت کے واسطے فارسی قواعد سے کام لیا ہے جو دکنی پر ہو بالکل درست بیٹھتے ہیں -

جمع

الف نون کے الحاق سے عام طور پر جمع بنتی ہے ؛ البتہ اگر آخر میں الف ہو تو یہ 'الف' 'ی' کے ساتھ بدل دیا جاتا ہے - امثال :

(الف) دانش مندان ، جابران ، صورتاں ، موریاں ، بھلاں ، پھولاں ، جھاڑاں ، زوراں ، مہمداراں ، گن کاراں ، آفتاباں ، حوراں ، پیغمبراں ، ہاراں ، گلاں ، حویساں ، خدمت گاراں ، دولت خواھاں ، امدواراں ، صاحب تمراں ، سرکش نداں ، گھراں ، پنکاں ، بولاں ، جاھلاں ، سردرداں ، جانوراں ، کوڑاں ، صاحب حاصلاں ، حکایتاں ، خرافاتاں ، دردمنداں ، نیاں ، سیاں ، داروان ، جان ، جالساں ، آنکھاں ، بنگڑیاں ، رنگیلیاں ، حھبیلیاں ، بابیاں ، سگھڑ سہیلیاں ، چاند جیسیاں -

(ب) عمزیاں ، غریاں ، عسویاں ، پیاریاں ، دیدیاں ، دیوانیاں ، سجیاں ، مسخریاں ، دسریاں ، کنگوریاں ، ناریاں ، ىلویاں ، مال ملانیاں ، دھیاریاں ، بھابیاں ، ریجھابیاں -

غمزہ ، عسوہ ، دیدہ وغیرہ اگرچہ 'ہ' پر ختم ہوے ہیں لیکن دکنی میں یہ 'ہ' تحریر و تقریر میں الف سے بدل گئی ہے -

تصریف کے قاعدے میں اردو سے مختلف ہے - اردو میں 'پادشاھاں' فاعلی مفعولی وغیرہ حالتوں میں پادشاھوں بن جاتا ہے مگر دکنی میں بہ دستور پادشاھاں رھتا ہے - چناں چہ:

فاعلی = (صفحہ ۴۸) ''بڑے لوکاں شہر میں کونچے کونچے بھرے ہیں -''

ایضاً = (صفحہ ۲۱) ''خدا کے دوستاں نے بولے ہیں -''

مفعولی = (صفحہ ۵۱) ''وھاں کے لوکاں کوں پوچھیا ۔''

اضافی = (صفحہ ۱۵) ''معشوقاں کے نازاں کیا سمجھتے ، عاشقاں کے چھنداں کوں کیا جانتے۔''

مجروری = (صفحہ ۵۲) ''کس کس لذت بھرے درداں سوں انکھیاں میں تے پڑنا ھے بند ایک ایک ۔''

'نے' کا استعمال

'نے' اردو میں محض فاعلیت کے لیے آتا ھے اور عام قاعدہ یہ ھے کہ فعل بہ حالت جمع و وحدت و تذکیر و تانیث اپنے فاعل کا تابع رھتا ھے ، لیکن جب 'نے' کسی جملے میں آتا ھے تو فعل بجائے فاعل کا تابع ھونے کے مفعول کا تابع بن جاتا ھے ۔

دکنی 'نے' کے استعمال میں بالکل بے قاعدہ ھے ۔ اس زبان میں وہ فاعل اور مفعول دونوں کے لیے آتا ھے جیسا کہ ھریانی کا دستور ھے ۔ لیکن فاعلی علامت ھونے کی حالت میں اردو کے برخلاف فعل اپنے فاعل کا تابع رھتا ھے ۔

(۱) فاعلی :

(صفحہ ۲۸) ''پادشاھاں نے دنیا کا حظ چھوڑے خلق کا دل توڑے''

(صفحہ ۹۰) ''غمزے نے نظر کوں اپنے گھر لے کر گیا ۔''

(صفحہ ۵۶) ''اس خاطر زلیخا نے کیا کری ۔''

(صفحہ ۲۵۸) ''جن عورت نے اتنی جھل کھائی ، ان نے آخر مرد کوں گنوائی ۔''

(صفحہ ۷۱) ''رقیب نے روسیاہ نے بے نصیب نے بولیا۔''

(صفحہ ۹۱) ''یو بات ھوے پچھیں غمزے نے نظر کوں دوسرے دیس حسن کے حضور لیایا ۔''

(۲) اردو میں مصدر بولنے اور لانے کے ساتھ نہیں آتا ، دکنی میں آتا ھے :

(صفحہ ۲۱۶) ''وفا با صفا نے بولی ۔''

(صفحہ ۱۹۶) ''حسن دھن مں موھن جگ جیون نے بولی ۔''

(صفحہ ۲۲۱) ''دل کوں نو حدا نے باع میں لیایا ۔''

(صفحہ ۹۱) ''خدا نے اسے یاں لیایا ۔''

(۳) مفعولی :

(صفحہ ۲۸) ''نے نمک کھانے نے آدمی نے کیا سواد پانا ۔''

(صفحہ ۱۱۵) ''آدمی نے خدا کا مال سمج کر چپ رھنا ، کسے کچھ نا کہنا ۔''

(صفحہ ۳۱) ''آدمی برا اچھے نو شراب نے کیا کرنا ۔''

صفحہ ۱۵) ''انساں نے اپنا نو حاصل کرنا ھے کہ بارے نماز کسے لگن اسے حدا بن کچھ یاد نہ آوے ۔''

'یہ' نے بالکل اسی طرح ھے جیسے پنجاب میں بولا جاتا ھے ۔''

'کر' فعل

دو فعلوں میں عطف کے لیے آتا ھے جس سے واضح ھوتا ھے کہ فاعل نے پہلا فعل ختم کرکے دوسرے فعل پر عمل کیا ۔ 'سب رس' سے معلوم ھوتا ھے کہ اس فعل کا دائرہ عمل بہت وسیع تھا ۔ ان ایام میں نہ صرف وہ ایک فعل پر دوسرے فعل کی تقدیم ظاھر کرتا ھے بلکہ اس کے علاوہ اور مقاصد کے لیے بھی آتا ھے :

(۱) علت کے لیے آتا ھے ۔ مثلاً :

(صفحہ ۳۱) ''خدا نے بخشیا کیا کر ، خدا کے فرمودے میں بی اپتے مکر ۔''

'(کیا کر' یعنی کس طرح اور کس لیے ۔ پنجابی میں اس کا مرادف 'کی کر' آج بھی استعمال ھوتا ھے)

(صفحہ ۱۸۶) ''اپنا کام فتح ھوا کر بہوت خوش حالی پائے ۔''

(یعنے کام فتح ھوا ، اس سے خوش حال ھوئے ۔ فتح ھونے سے)

(صفحہ ۲۹۲) ''خدا جو پادشاہاں کو پادشاہی دیتا ہے خلق کوں کموں پالتے کر خبر نیں لیتا ہے؟ ''

(یہ استفہامیہ ہے ، یعنے خلق کو کموں کر پالتے ہیں ۔ 'کموں کر' آج بھی اردو میں آ رہا ہے) ۔

(صفحہ ۵۰) ''نشان اس آب حیات کا کیں نیں پایا کر بہوت تلملایا۔''
(یعنے اس بنا پر تلملایا) ۔

(۲) طرح ، مانند ، سا ، یوں وغیرہ کا بھی مفہوم ادا کرتا ہے ۔

(صفحہ ۲۷۰) 'جتنے خدا کے دوست خدا کوں پہچانتے ہیں سب بی بی رابعہ کوں بڑے ہیں کرمانتے ہیں ۔''
(یعنے بڑے کی طرح مانتے ہیں ۔ بڑا کر کے مانتے ہیں ۔ پنجابی میں آج بھی اسی طرح بولتے ہیں : ''میں نے تینوں وڈا کر کے سمجھیا سی'' میں تو تجھے بڑا کر کے سمجھا تھا یعنے بڑے کی طرح) ۔

(صفحہ ۱۹) ''اگر یہہ (یہی) وجہ مطلق کچھ نادستا تو ہرگز 'خدا ہے'' کرنا کہتے۔''

(یعنے ہے خدا کر کے نہ بولتے ، خدا موجود ہے یوں نہ کہتے) ۔

(صفحہ ۱۵) ''اجالے کے رہن ہاریاں سوں لڑتا جھگڑتا ۔ اندھارے کوں اجالا کر سمجتا ، لال کوں کالا کر سمجتا ۔''
(یعنے اندھیرے کو اجالے کی طرح اور لال کو کالے کی طرح سمجھنا) ۔

(صفحہ ۲۶۳) ''عشق میں محکم ہے کر جانتی تھی ، عاشق ثابت قدم ہے کر جانتی تھی ۔'' (یعنے عشق میں محکم ہے ، یوں جانتی تھی) ۔

(صفحہ ۲۰۹) ''عقل یوں نہاٹی ہور دل یوں سنپڑیا کر کھیا ، نصیباں میں جو کچھ لکھا تھا سوانپڑیا کر کھیا ۔''
(یعنے یوں کہا) ۔

(صفحہ ۲۳۱) ''ھد میں ھد ھوں کر کہے۔'' (ھوں ھد کر کے بولے یا 'ھد ھوں' یوں بولے ۔)

(صفحہ ۲۶۹) ''گھر میں تے بھار نکو نکلنے دیو کر فرمایا ۔'' (یعنے گھر سے باھر نہ نکلنے دینا یوں فرمایا) ۔

(صفحہ ۲۲) ''موسی نے خدا کوں دیکھنے کا سوال کیا ، نیں دستا سو دستا کر خیال کیا ۔'' (گویا نادیدنی کو دیدنی کی طرح مانا) ۔

(۳) برائے تاکید جیسے 'خاص کر' وغیرہ :

(صفحہ ۸۲) ''بہت کر اسبحہ تے حسن کوں چھپاتے ھیں ۔'' (یعنے اکثر و بیشتر یا اکثر کر کے)۔

(۴) بہ معنی مصدر بطور فعل مرکب جیسے کر گزرنا ، کر چھوڑنا ، کر بیٹھنا وغیرہ ۔ ان میں مفعول مقدر ہے ۔

(صفحہ ۲۹۱) ''پادشاھی آپی ولے پادشاھی کر جاننا بہوت مشکل ہے ۔'' (یعنے بادشاھی کرنا یا بادشاھی کا فن یا عمل جاننا) ۔

(صفحہ ۱۳۷) ''صاحب وھیچہ جسے صاحبی کرنی آئی ، نفر وھیچہ جو کر جانتا ہے نفرائی ۔'' (نفرائی کرنا ۔ چاکری کرنا) ۔

(صفحہ ۱۱۳) ''عارف کوں ضرور ہے یو تحقیق کر جانے ۔'' (یعنے تحقیق کرنا)۔

(۵) فعل سابق سے مقدم بھی آتا ہے :

(صفحہ ۱۵۶) ''فرصت کا وقت غنیمت کر جان تدبیر ہر منزل دھرے ۔'' (یعنے غنیمت جان کر) ۔

(٦) بطور علامت مقولہ :

(صفحہ ۲۵۱) دل دستا نہیں کدھر گیا ہے ، کر دھنڈنے لا گیا -"
(یعنے 'دل دکھتا نہیں کدھر گیا ہے' کہہ کر ڈھونڈھنے لگا) -

(صفحہ ۱۳۸) "العصہ عشق پادشاہ سوں صلح صلاح کیے ہیں ، کر بے غم نا اچھنا ، ہر چند "بھاگ بھروسا کیے ہیں" کر بے غم نا اچھنا "-

'سی' مستقبل

'سب رس' میں 'سی' مستقبل کا استعمال اس قلت کے ساتھ ہوا ہے کہ باوجود تلاش مجھے صرف چار صیغے مل سکے :

(۱) واحد غائب :

(صفحہ ۱۰) "کیا عورت کیا مرد ، جس میں عشق کا کچھ درد ، اس کتاب کو سینے پر سے ہلا سی نا ، اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلا سی نا-"

(صفحہ ۱۹) بعض کہتے ہیں کہ خدا کوں اس نظر سوں دیکھیا نا جاسی ، نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر نا آسی -" (اس مثال میں پہلا فعل مجہول ہے) -

(صفحہ ۲۷) پادشاہ کوں عدل انصاف بغیر ہور کچھ پوچھ بچار نا ہو سی ، پادشاہ شراب پیا تو گنہگار نا ہوسی -"

(صفحہ ۳۱) "دوسرے کی تقصیر کا حجت اپس پر نا آسی ، کسی کے گنہ خاطر کسی کوں دوزخ میں نا بھاسی -"

(صفحہ ۵۴) "همت کی صفت جوں ہے تیوں کوئی کرسی نا ، همت کی صفت جیتا کہے بی سر سی نا -"

(صفحہ ۲۱۷) "مجھے یو کام بغیر آرام نا ہو سی تا یو کام نا ہوسی -"

مثال مونث :

(صفحہ ۱۲۰) "جو بات نا آسی میانے میاں -"

(۲) جمع غائب :

(صفحہ ۱۰۵) ''جو کوئی صاحب دل ھیں ، انو کے دل اس گل مں نا بھاسیں ، انو کے دلاں پر ایسے خطرے ہرگز نا آسں ۔''

(صفحہ ۱۸۳) ''بوھرن مں هرن ، کوں سکے ابو کوں رام کرن ، پھاندے مں ناڑس گے ولے یھاندے مں پڑسں نا ، دسریاں کوں سنتڑاوس گے ولے اے سنپڑسیں نا ۔''

(صفحہ ۲۰۷) ''ابوی کحھ دیکھے ھں ، بہوت کام کیے ھں ، دنیا کا بھلا برا سب فام کیے ھں ، نھنے کاماں میں ہرگز نا جاسں ، کوئی دعا دیے آیا تو دغا نا کھاسں ۔''

(صفحہ ۲۰۸) هر ایک کام لیے تو تڑیاں کوں حبر کرنا ، آخر حوب احھیگا تو کرو کئں گے و اگر برا اچھیگا تو حواب نا دیسیں ۔ حپ رھں گے ۔''

(۳) واحد حاضر :

''جو لگن تو سب نے بے طمع نا ھوسی ، عسں مں آئے بعبر خاطر جمع نا ھوسی ۔''

(صفحہ ۲۲) موسیٰ کوں حواب آیا کہ لن ترانی یعنے نادیکھ سی تو یو انوار سبحانی ۔''

(۴) واحد متکلم :

(صفحہ ۲۱۵) میں ایسی نہیں ھوں ، نو بولے پچھیں ندبیر نا کرسوں، جیو سوں راضی ھوں ، فرما ، تقصیر نا کر سوں ۔''

باقی صیغے یعنی جمع حاضر اور جمع متکلم اس کتاب میں نہیں آتے ۔
یہ مستقبل امر اور مضارع کے آمیز سے بنتا ہے جس میں امر اپنی اصلی حالت پر رھتا ہے اور مضارع میں تصریف ھوتی ہے ۔ اس تذکیر و تانیث

میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ 'سب رس' میں اس ندرت کے ساتھ اس کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ اس عہد میں وہ متروک ہو رہا ہے ۔

ظرفیہ

(صفحہ ۲) "ٹھاویں ٹھاوں ۔"
(صفحہ ۳) "ٹھاریں ٹھار ۔"
(صفحہ ۲۳) "میانے میان ۔"
(صفحہ ۲۷) "بازار سے بازار . . . . کو نچے کو نچے ۔"
(صفحہ ۵۳) "جنگلے جنگل چلیا ۔"
(صفحہ ۵٦) "رگے رگ میں لہو کوں آتا جوس ۔"
(صفحہ ٦۳) "بازار میں بازار پھرتے ۔"
(صفحہ ٦٦) "گھریں گھر ٹھاریں ٹھار ۔"
(صفحہ ٦۷) "چمنے چمن ۔"
(صفحہ ۷۵) "راسک راس ۔"
(صفحہ ۸۴) "پایں پات جیو بہلتا ۔"
(صفحہ ۲۷٦) "راسی راس ۔"
(صفحہ ۲٦۷) "بالیں بال ۔"

اسم فاعل

فارسی کے مقابلے میں ہندی اسم فاعل کم ملتے ہیں ۔ عام طور پر یہ اسم فاعل مصدر پر 'ہار'، 'ہارا' اور جمع میں 'ہارے' کے اضافے سے بنتا ہے، جیسے :

(صفحہ ۱۴۰) "بولنہارا ۔"
(صفحہ ۷) "چلنہارے ۔"

بعض یائے فاعلی کے اضافے سے جیسے
(صفحہ ۳۳) "سنگاتی"

ایک اور اسم فاعل ہے جو 'تا' کے اضافے سے بنتا ہے جیسے :
'جانتا' (دانا) اور 'انجانتا' (نادان) صفحہ ۱۷ ۔

ایک اور شکل یہ نتبع سنسکرت ہے جس میں مصدر سے قبل اسم آتا ہے جیسے : (صفحہ ۱۹۳) 'من موھن' ''حگ حیون'' وغیرہ ۔ فارسی الفاظ کی ترکیب سے بھی بنائے جاتے ھیں جیسے : (صفحہ ۲۰) 'پیدا کرن ھار' جوصاف پیدا کنندہ کا ترجمہ معلوم ھوتا ہے ۔ یہی حالت 'محبت کرنہار' کی ہے ۔ 'خبر انپڑان ھارا' ان سب میں عجیب ہے جو خبر رسان کا ترجمہ ہے ۔ 'بخشنہارا' بھی اسی ذخیرے سے تعلق رکھتا ہے جو بخشایندہ کے لیے بنا ہے ۔

اس قسم کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ حسب ضرورت الفاظ وضع کیے جاتے ھیں اور ان کے ذریعے سے زبان کے ذخیرے کو وسعت دی جاتی ہے ۔

لیکن سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اردو اور پنجابی اسم فاعل کی نہایت عام علامت 'والا' قطعاً نظر نہیں آتی یعنی بولنے والا ، چلنے والا قسم کے اسم فاعل نہیں ملتے ۔ اس سے ظاھر کہ 'والا' قدیم نہیں ہے ۔ سرسری نظر میں جو الفاظ ملے یہاں درج ھیں :

(صفحہ ۱) سرجن ھار
(صفحہ ۵) کھیلن ھار
(صفحہ ۱۱) سمجان ھارا ۔ جوسار
(صفحہ ۱۵) چلن ھار ۔ رھن ھار
(صفحہ ۲۵) جان ھار
(صفحہ ۱۱۱) کرنہارا
(صفحہ ۲۸۶) لڑن ھارا ۔ پڑھارا
(صفحہ ۸۰) دھتیارا
(صفحہ ۳۷) دین ھارا ۔ لین ھارا
(صفحہ ۲۰۴) جیون ھارا
(صفحہ ۲۸۰) گھر کی رھن ھاری (مونث)
(صفحہ ۲۵۷) سمجن ھارے ۔ جھگڑا لان ھاری ۔ دند کاری (مونث)
(صفحہ ۲۵۸) آپ بھاونا (خود پسند کا ترجمہ ہے) آپستا ۔

(صفحہ ۴۵)　منگنہارا[1] (خواھندہ کا ترجمہ ھے یعنی سوالی اورگدا) ۔
(صفحہ ۷۱)　چور ، پالی ۔
(صفحہ ۴۵)　قسمت کرن ھار ۔
(صفحہ ۱۱۳)　دیکھن ھارا ، دھونڈن ھارا ۔
(صفحہ ۱۲۳)　نشان دینہارا ۔
(صفحہ ۱۴۶)　سنبھالن ھارا ۔
(صفحہ ۱۵۰)　منا[2] کرنے (کدا) ھارا ۔ بڑے کوں نھنا کرن ھارا ۔
(صفحہ ۱۵۱)　کام آن ھارا ۔
(صفحہ ۱۵۲)　جھڑان ھارا ۔
(صفحہ ۳)　کرتار ۔
(صفحہ ۲۶۲)　لکھن ونی ،گن بھری ، بلہار ۔
(صفحہ ۱۸۲)　مس ھرن
(صفحہ ۲۸۶)　لڑن ھارا ، دڑن ھارا ۔
(صفحہ ۱۲۸)　کھان ھارے ۔

تذکیر و تانیث

ھمارے زمانے میں دھلی اور لکھنؤ کا اختلاف مسلم ھے ، اگرچہ جروی معاملات میں ھے ۔ معلوم ھوتا ھے کہ دکنی میں بھی اس کے متعلق کوئی ضابطہ نہیں تھا ۔ کئی الفاظ ایسے ھیں جن کو وجہی دونوں طرح سے لاتا ھے ۔ مثلاً 'مقصود' (صفحہ ۹۳) مذکر ھے ، مگر صفحہ ۲۸۸ پر موںث ھے ۔ ناںواں (صفحہ ۱) مونث ھے ، اور صفحہ ۵۴ پر مذکر ھے ۔ اور بھی ایسے الفاظ ھیں ۔ ذیل کے الفاظ مذکر ھیں :

(صفحہ ۱۳)　مجال　　(صفحہ ۲۱)　ذات
(صفحہ ۲۴)　شرط　　(صفحہ ۲۹)　مشقت
(صفحہ ۴۵)　نانوں　　(صفحہ ۴۷)　عزت ، خاطر

---

۱ ۔ سندھی میں اب بھی 'منگنہار' یا 'منگنہارو' کی صورت میں موجود ھے ۔ (مرتب)

۲ ۔ 'منع کرنے والا' مراد ھے ۔ مرتب

(صفحہ ۸۴) طرب ، بشارت (صفحہ ۲۷) شراب
(صفحہ ۲۸) حلق (صفحہ ۳۶) جان ، آگ
(صفحہ ۳۸) بانہر ، لذت (صفحہ ۴۵) بات
(صفحہ ۵۰) امید واری (صفحہ ۶۰) حاشنی
(صفحہ ۷۴) حاطر (صفحہ ۹۹) روح
(صفحہ ۱۰۶) مطلب (صفحہ ۱۱۱) کشاف
(صفحہ ۱۱۳) صحب (صفحہ ۱۵۵) حطا
(صفحہ ۶۴) حرص (صفحہ ۱۷۰) موت
(صفحہ ۱۷۶) نوبہ (صفحہ ۲۱۸) مسکل
(صفحہ ۲۶۷) حطا ، معصر (صفحہ ۲۷۶) ملاقات
(صفحہ ۲۸۰) حبر (صفحہ ۲۸۹) سکت
(صفحہ ۲۹۱) ذکار (صفحہ ۳۰۰) فکر
(صفحہ ۱۳۹) مد (نوبد)

یہ الفاظ مونث لائے گئے ہیں :

(صفحہ ۱) مانوں (صفحہ ۲۸۵) ادب
(صفحہ ۲۸۸) مقصود (صفحہ ۲۹۱) ھانک
(صفحہ ۲۹۶) مشتری (ستارہ) (صفحہ ۲۹۷) حما
(صفحہ ۳۰۰) د لر (صفحہ ۱۶) مانوں ۔

میں نے اس نظر سے ساری کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ، مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اختلافی عنصر کا یہ حصہ غالب ہے جو اوپر دکھایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی بڑی مقدار نہیں ہے ۔ باقیوں میں اردو کے مطابق ہے ۔

مصدر کا استعمال

(صفحہ ۱۳) ''دھنڈے دھنڈتے دل کے نلویاں میں چھلے آتا ہے تو یو بات پاتا ہے'' (بہ معنی حال) ۔

(صفحہ ۲۸) ''تا دور قیامت اپنے دور کی بات ہونا ۔''

''انگے کے لوگاں جکوئی سنے نو شہماب ہونا ۔''
(بہ معنی مستقبل)

(صفحہ ۱۴۱) ''زور آور کوں زور سوں ناھنکارنا ، زور آور کوں ہنر سوں مارنا'' (بہ معنی امر) ۔

(صفحہ ۱۴۴) ''بڑے آدمی کوں بڑا کام فرمانا ، نھنے آدمی کا کام گور میں آنا جانا ، بھرے لانا لے جانا ۔'' (چاھیے محذوف ہے)

(صفحہ ۲۹) ''جسوں جدا دیا بیوں لنے ی جانا ہے ، کسے کچھ دیسے ی جانتا ہے ۔'' (نے بجائے نا)

(صفحہ ٦٧) ''ملایک آررو دھرے ھیں اس باغ مں آنے ۔''(بحذف جارہ 'کی')

(صفحہ ۱۴۱) ''وو ابد الاباد کی ٹھار ہے ، یہاں ہے وھاں جانے کیا بار ہے ۔'' (ظرفیہ 'میں' محذوف ہے)

(صفحہ ۸۳) ''جکوئی خوب ہے اسے اپنی جوبی چھپانے ییں بھانا ۔ جوبی چھپانے خوباں کوں نہں آنا ۔'' (نے بجائے نا)

(صفحہ ٦۴) ''بڑے ھونا کیا بات مں پڑیا ہے ۔'' (یعنے بڑا ھونا)

(صفحہ ۱۳۵) ''ایسی مستی سوں ضرور ڈرنا لگتا ہے ، بہوت حذر کرنا لگتا ہے ۔''

دکنی صرف کا یہ کوئی پورا خاکہ نہیں ہے اور نہ اس کی تمام خصوصیات سے بحث کرنا ھمارے موجودہ مقصد کے مناسب ہے ۔ ہم نے بعض ایسے خصائص کو لے لیا ہے جو سطح پر نمودار ھیں مگر ایسے جو گہرے مطالعے کے مقتضی ھیں ان کو ترک کر دیا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ 'سب رس' کا تفصیلی مطالعہ اردو صرف کے بعض پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی میں امید سے زیادہ ھماری امداد کرے گا ۔

فارسی اثر

'سب رس' پر فارسی اثر خواہ اصل فارسی اشعار و اقوال کی بنا پر جو کہ عرب کے ساتھ اس میں مستعمل ہیں یا ان کے تراجم نیز ایسے محاورات و امثال کی بنا پر جو فی الحقیقت فارسی اصل پر مبنی ہیں ، نہایت گہرا ہے ۔ فارسی اساتذہ و اہل قلم مولانا روم ، سعدی ، خسرو ، حافظ ، عرفی ، گیسو دراز وغیرہم ، نیز ان کے شہار امثال و اشعار سے قطع نظر جن کے مالکوں کے نام مذکور نہیں ہوئے ، ہم ایسے اسالیب کا ذکر کریں گے جو بادی النظر میں فارسی پرتو یا ترجمے کے ذیل میں داخل ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکنی اس خصوص میں نہ صرف فارسی اسالیب و روز مرہ سے سیراب ہو رہی ہے بلکہ مصادر ، حاصل مصادر ، صفات و اسما حتی کہ بعض صرفی خصوصیات نثر انداز بیان میں اس کی مت کس ہے ۔ یہ اثر اس قدر جگری ہے کہ بعض موقعوں پر جب تک ہم فارسی محاورے سے واقف نہ ہوں ، اصل دکنی مفہوم کا پتا چلانا دشوار ہو جاتا ہے ۔

ضرب الامثال

(صفحہ ۳۸) ''یو بات کھیل نہیں ۔'' (ایں سخن بازیچہ نیست)

(صفحہ ۴) ''آپے کیا اسے علاج کیا ۔'' (خود کردہ را درمان چیست)

(صفحہ ۱۷) ''مردی و نامردی یک قدم ہے ۔'' ع
نا مردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

(صفحہ ۱۷) ''اپنا کیا اپے پاوے ۔'' (کردنی خویش آمدنی پیش)

(صفحہ ۷۵) ''اگر ماٹی لیکا تو بی بڑی ڈھیگ (ڈھیر) پر ہات سٹ ۔'' (خاک از تودۂ کلاں بردار)

(صفحہ ۲۴۳) ''کہیچ ہیں کہ اپنا گھر خوشی بھاتے سو کر ۔'' ('خانہ خانۂ تست' کا پرتو ہے)

(صفحہ ۴۵) ''اس بات پر یو بات آتی کہ علت جاتی ولے عادت نہیں جاتی ۔'' (علت می رود ولی عادت نمی رود)

(صفحہ ۱۳۱) ''ایسا اندیشا اندیشا ، اپی ماریا اپنے پانوں پر تشا ۔'' ('تیشا برپای خود زدن' کا ترجمہ ھے)

(صفحہ ۱۲۲) ''ما باپ مجازی خدا ۔''

(صفحہ ۱۵۴) ''جن نے لہوا ھات پکڑیا ، اس کی دائم پیش بازی ۔'' (ھر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند)

(صفحہ ۲٦۸) ''بولے ھیں کہ شر شیطان تے مکر زنان تے خدا اپنی پناہ میں رکھے ۔''

(صفحہ ۲۵۲) ''مثلہ معلوم ھوا آج ، خالی گھرمیں کتیاں کا راج ۔''

ھم نے ایک قلمی نسخے میں یہ مثل یوں پڑھی ھے ۔ 'خالی گھر بھوتاں کا راج'۔ بہرحال 'خانہ خالی را دیو می گیرد' سے ماخوذ ھے ۔

(صفحہ ۲۵۷) ''برے سوں بھلائی کرنا دشمن سوں سگائی کرنا نادانگی سراسر ھے ۔''

(صفحہ ۵٦) سنے کے پانی سوں لکھ رکھنا یو تیری بات ۔''

(صفحہ ۲۷۴) حیرت تے دانتاں تلے انگلی رکھی ۔'' (انگشت بدندان گرفتن)

(صفحہ ۳۴) ''بر درھور در برہاں زمین آسمان کا انتر ۔'' سعدی کے اس شعر سے ماخوذ ھے ۔ ع :

فرق است میان آنکہ یارش در بر
با آنکہ دو چشم انتظارش بر در

(صفحہ ۱۴۵) ''ہاچ ھور کاچ دونوں ھرے ھیں ولے دانش منداں یہاں فرق کرے ھیں ۔ کاچ میں کیا ہاچ کا جھلک جھلکے گا ۔''

اوپر کی مثالوں میں سب سے زیادہ سعدی کے خرمن سے خوشہ چینی

کی گئی ھے ۔ لیکن مثال ذیل سرقہ میں شامل ہونے کے قابل ھے ۔ اگر ترجمہ داخل سرقہ ھے ۔

(صفحہ ۱۳۸) ''جیسے دنیا میں آئے انو میں دو جنیاں نے جیقی کھائے ۔
جس نے جان کر غفلت میں پڑیا کچھ نیں کیا ،
جس نے اچھہ کر بیں کھانا کسے کچھ نیں دیا ۔''

گلستان کے باب ھشتم میں ھمیں یہ عبارت ملتی ھے :
''دو کس مردند و حسرت بردند ، یکے آنکہ داشت و نخورد ، دیگر آنکہ دانست و نکرد ۔''

مصادر

اردو میں فارسی ذرائع سے کئی مصادر مثلاً فرمانا ، گزرنا ، رنگنا ، بخشنا ، آزمانا ، خریدنا ، نوازنا وغیرہ عام طور پر رائج ھیں ۔ دکنی اس فہرست میں اور مصادر کا اضافہ کرتی ھے ۔ مثلاً تلاش سے تلاشنا ، فہمیدن سے فامنا ۔ آخری فعل نہایت کثرت سے ملتا ھے :

(صفحہ ۱۵۰) ''یو بات دانش کا معما ، اس بات کوں فامتا کوں ۔''
نگاریدن سے نگارنا اور اندیشیدن سے اندیشنا بھی قابل ذکر ھیں :

(صفحہ ۲۹۶) ''یو کام اندیشے ھیں سو کرنا . . . . گھر سوارے جاگا جاگا نقش نگارے ۔''

مرغولنا ایک اور جدید مصدر ھے جس کے معنے فاضل مرتب نے پرندوں کے چہچہانے کے دیے ھیں :

(صفحہ ۲۲۲) ''جناوراں ڈالیاں پر مست مرغولنے ھیں ۔''

مرغولہ تحریر نغمہ یا گٹکری کے معنوں میں بھی آتا ھے ۔ اس بنیاد پر شاید یہ معنے مستخرج ھوئے ۔ اسی طرح راندن سے رانا نکلا :

(صفحہ ۱۲) ''یو کوڑ پائی خدا کے را نے یو جہنمی کج فامی کی ۔''

فارسی مرکب مصادر کا ترجمہ یا نصف ترجمہ بہ کثرت ملتا ھے ۔ ان میں اکثر مصدر داشتن ، کردن ، گرفتن ، خوردن وغیرہ کی ترکیب

سے بنتے ھیں - میں صرف چند مثالوں پر قناعت کرتا ھوں :

دھرنا فارسی نہادن اور داشتن کا قائم مقام ھے - چناں چہ :

قانون دھرنا = قانون نہادن

(صفحہ ۲۷) ''نوے نوے قانون دھرنے لگیا -''

کام دھرنا = کار داشتن

(صفحہ ٦۲) ''ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سوں کچھ کام دھرتا ھے -''

آرزو دھرنا = آرزو داشتن

(صفحہ ٦۷) ''ملایک آرزو دھرتے ھیں -''

محبت دھرنا = محبت داشتن

(صفحہ ۷۰) ''محبت دھر گیا -''

نام دھرنا = نام داشتن

(صفحہ ۹۰) ''کیا نام دھرتا ھے ، کیا کام کرتا ھے-'' (اردو محاورہ نام دھرنا اس سے بالکل مختلف ھے)

خبر دھرنا = خبر داشتن

(صفحہ ٦۱) ''یو غافل بچارہ خبر نہیں دھرتا -''

غلام دھرنا = غلام داشتن

(صفحہ ۱۲۴) ''حسن دھن من موھن جگ جیون ایک غلام دھرتی تھی -''

فرصت دھرنا = فرصت داشتن

(صفحہ ۱۵۷) ''فرصت دھرتا ھے''

شوق دھرنا = شوق داشتن

(صفحہ ۲۳۰) ''شوق دھریں گے -''

رخ دھرنا = رخ نہادن

(صفحہ ۱٦۹) ''رخ دھرے'' یعنے رخ نہادند یا رو نہادند -

ظہور پکڑنا = ظہور گرفتن

(صفحہ ۹۴) ''عشق تے معشوق نے پکڑی ظہور ۔''
دنبال پکڑنا = دنبال گرفتن ''

(صفحہ ۱۱۵) ''دسریا کا دنبال نکو (مت) پکڑ'' یعنی دنبال دیگراں مگیر ۔

(صفحہ ۹۳) ''پانو سوں پڑنے کا آیا وقت ۔''

اردو میں بے معنی ہے ۔ دراصل فارسی 'از پا افتادن' یا 'از پا درآمدن' کا ترجمہ ہے ۔

(صفحہ ۱۱۷) ''یو حال ہر کسے نہیں دیتا دست ۔'' '(دست دادن' کا ترجمہ ہے)

(صفحہ ۲۱۰) ''رستاں اس کے انگے کمر کا لہوا کھول کر سیر سٹتے[1] ہیں ۔'' (سپر انداختن کا ترجمہ ہے)

(صفحہ ۲۴۱) ''خوشبوی خوس کرنا ۔'' [حوس کردن بہ معنی پسندیدن ہے]

(صفحہ ۲۷۶) ''اپنا ھات اپے لڑیا ۔'' (ترجمہ ہے دست گزیدن کا)

(صفحہ ۱۳۲) ''فتنہ اچایا '' یعنی فتنہ انگیخت ۔

(صفحہ ۱۴۱) ''باٹ ماریا ہے '' یعنے راہ زدہ است ۔

(صفحہ ۱۵۴) ''اپنے نانو کا علم اچانا '' یعنی علم برکشدن ۔

(صفحہ ۱۶۱) ''سیفی کھانے لگا'' ترجمہ ہے حیف خوردن کا ۔

(صفحہ ۱۹۴) ''اس سوں مشورت لائی '' یعنی باوے مشورت آورد ۔

(صفحہ ۸۷) ''سر کوں قدم کیا '' = سر را قدم ساخت ۔

(صفحہ ۸۱) ''دل کا مدعا کھولیا '' یعنی مدعاے دل بکشود ۔

(صفحہ ۹۴) ''جیو کے دریا میں پیار کا طوفان ماریا '' یعنے طوفان زد ۔

---

۱ ۔ مصدر 'سٹنا' = ڈالنا ہے ، یہ مصدر پنجابی میں عام مستعمل ہے ۔ (مرتب)

(صفحہ ۸۱) ''بصحت و سلامت خدا تجھے تیری مراد کوں انپڑاوے۔''

(صفحہ ۵۴) ''پکڑی بلندی۔'' (بلندی گرفتن کا ترجمہ ہے)

اسی سلسلے میں بعض اور مصادر ذکر کیے جاتے ہیں اور یاد رہے کہ ایسے مصادر بے شمار ہیں :

(صفحہ ۱) قدرت دھرنا = قدرت داشتن

(صفحہ ۲) دم مارنے = دم زدن

پیدا کیا = پیدا کرد

(صفحہ ۶) تقسیم آنا (صفحہ ۸) عیاں کردن ، تسلیم کرنا ۔

تمیز کرنا (صفحہ ۹) لذت پانا ۔

(صفحہ ۱۰) کیف کھانا (کیف خوردن) فاتحہ پڑھنا ۔

(صفحہ ۱۲) مانا کھولنا (معنے کشودن) ۔ گرہ دینا (گرہ زدن) ، باٹ دیکھلانا (راہ نمودن) ۔

(صفحہ ۱۴) گھایل ہونا (فگار شدن) ۔ بنباد اچانا (اٹھانا) ۔ پرھیز کرنا ، انصاف چھپانا ۔

(صفحہ ۱۵) درد مند اچنا (درد مند بودن) ، حق تے گزرنا (از حق گزشتن) ، گنج کاڑنا (گنج کشیدن) ۔

(صفحہ ۱۶) عمارت راس کرنا (عمارت راست کردن) ، قدر جاننا ، عزت پانا ، قبول پڑنا (قبول افتادن) ۔ آفت دیکھنا ، برا بولنا (بد گفتن) ۔ اپس کوں پچھاننا (خود را شناختن) ۔

(صفحہ ۱۷) نقصان ہونا ، تازہ رکھنا (تازہ داشتن) ۔

(صفحہ ۱۸) مول پانا (قیمت یافتن) ۔

(صفحہ ۱۹) روشن ہونا ، شک لیانا (شک آوردن) ، صورت پکڑنا (صورت گرفتن) ۔ جیو دینا (جان دادن) ۔ حیران ہونا (حیران شدن) ۔

(صفحہ ۲۰) فرصت پانا (فرصت یافتن) ۔

(صفحہ ۲۱) گردانا (گردانیدن) ، فنا کرنا ، دور کرنا ، آرام پانا ۔

(صفحہ ۲۳) دیدار دیکھلانا (دیدار نمودن) ، عشق بڑھانا (عشق افزودن) ۔

(صفحہ ۲۴) بے منت دینا (بے منت دادن) ، قبول کرنا ، اظہار کرنا ۔

(صفحہ ۲۵) فرق پڑنا (فرق افتادن) ۔

(صفحہ ۲۶) دونوں جہان تے گزرنا (از هر دو جہان گذشتن) ۔ لازم آنا ، نطر کرنا ۔

(صفحہ ۲۶) مسانے مسان لانا (درمیان آوردن) ، ناؤں دینا (نام دادن) ، دحل دادن ، فرق پکڑنا (مرق گرفس) ۔

(صفحہ ۲۷) بادشاهی دینا ، سرفراز کرنا ، ممتاز کرنا ۔

(صفحہ ۲۸) دل توڑنا ، آزردہ هونا ، پرمردہ هونا ، افسردہ هونا ، دعا دینا ، خوش حال اچھنا (خوش حال بودن) فدا هونا ، دل شاد کرنا ، یاد کرنا ، تعریف کرنا ، شہماب هونا ۔

(صفحہ ۲۹) منا کرنا (منع کردن) ، نرم اچنا (نرم بودن) ۔

(صفحہ ۲۹) صفا پکڑنا (صفا گرفتن) ۔

(صفحہ ۳۰) گھوڑا بہانا (اسپ افگندن) ، خط پانا (خط یافتن) ۔

(صفحہ ۳۲) مائل هونا ، کامل هونا ، پاک کرنا ، الایش پانا (آلودگی یافتن) ۔

(صفحہ ۳۳) بخشنا (بخشودن) ، اختیار کرنا ، هضم کرنا ، بزم کرن ۔

(صفحہ ۳۴) بد مست هو پڑنا (بد مست شدہ افتادن) ۔ کھوانا

(کھلانا) ۔ خالی کرنا ، راز بہار بھانا (راز بیرون افکندن) ۔ پنہانی بولنا (پنہانی گفتن) ۔

(صفحہ ۳۷) قصہ پڑنا (قصہ خواندن) ۔
(صفحہ ۳۷) دل کھولنا (دل کشودن) ، طالب ہونا ، غالب ہونا ۔
(صفحہ ۳۸) رنگنا ، لطافت دھرنا (لطافت داشتن) ، سواد ٹٹنا (ذوق شکستن) ، آرمانا ، دغا کھانا (دغا خوردن) ، بلا آنا (بلا آمدن) ، درھم ہونا (درھم بودن) ۔
(صفحہ ۳۹) ماس ہونا (فاس شدن) ، گھر باندھنا (خانہ بستن) ۔
(صفحہ ۴۱) دنبال پڑنا (بدنبال افتادن) ۔
(صفحہ ۴۷) در گزرنا ۔
(صفحہ ۷۸) گزراننا (گزراندن) ۔
(صفحہ ۲۵۲) آہ مارنا (آہ زدن) ۔
(صفحہ ۲۵۴) خلل پاڑنا (خلل افکندن) صحبت دھرنا(صحبت داشتن)۔
(صفحہ ۲۵۹) کپٹ پکڑنا (کینہ گرفتن) وغیرہ ۔

یہ محض چند مثالیں ھیں اور ھمیں سمجھ لینا چاھیے کہ تقریباً مرکب مصادر کے سارے ذخیرے پر قبضہ کر لیا گیا ھے ۔ ان میں بعض ایسے بھی ھیں کہ جب تک اصل فارسی محاورے کی طرف رجوع نہ کیا جائے ان کا صحیح مفہوم دریافت نہیں ھوتا ؛ مثلاً دریغ دھرنا ، غلام دھرنا ، راز بھاربھانا ، رخ دھرنا ، حیفی کھانا ، خوش کرنا ، سواد ٹٹنا ، کپٹ پکڑنا ۔

بعض فارسی روزمرے ، حروف عاطفہ و استدراک لانے کا بھی دستور ھے :

(صفحہ ۷) ''آخر بعد از حضرت کے بیٹھے حضرت کی ٹھار ۔''
(صفحہ ۲۹۱) ''ایک بات ھے فام ، اول خوشی بعد از ھر ایک کام ۔''
(صفحہ ۳۵) ''ولاینت بغیر از شاہ ولایت کسے نیں آتی ۔''

(صفحہ ۲٦) ''یمعنی فنا هوتا هے نه به صورت ۔''

اما :

(صفحہ ۲۰) ''اما خدا کسے حاصل هے ۔''

(صفحہ ۲۴) ''اما دنیا ایسے کھیے هیں که ے عزی هور خواری سوں حاصل هوئے ۔''

(صفحہ ۳۴۳) ''اما عشق سلامی کیے سو اپنا گھر ۔''

(صفحہ ۱۲۰) ''اما خدا کی شاں هور شوکت عدل هور انصاف کی جاگه سو آساں ۔''

(صفحہ ۱۰۹) ''اما جوں ابتدا تے رسول خدا تے ذکر اشغال کا قاعده آیا هے ۔''

(صفحہ ۱٦۹) ''اما روایت یوں آئی هے که نظر جس وقت عقل کے بند میں ے بهار آیا تھا ۔''

هم :

(صفحہ ۱۱) هم هندو تجتے باٹ پانچے مانینگے ، هم مسلمان تجے بڑا کر جا ننگے ۔''

(صفحہ ۲۳۳) میں جانی هوں کس پانی سے خمیر هوئی عاشق کی خاک که هم فراق میں هم وصال میں دونوں جاگے هے هلاک ۔''

(صفحہ ۱۰۸) اناالله کے معام پر هم عشق میں هم عرفان میں جکوئی کامل هے ، وه همیشه کھڑا هے ۔''

'کو' (اضافی)

فارسی صرف کی رو سے حرف 'را' مفعول کی علامت هونے کے علاوہ اضافی بھی آیا کرتا هے ۔ مثلاً ، آنرا که حساب پاک است از محاسبه چه باک ، اردو میں اس 'را' کا ترجمه 'کا' 'کے' 'کی' کے ذریعے سے

کیا جاتا ہے ۔ لیکن دکنی میں بہ تقلید فارسی ایسے موقع پر 'کو' اضافی لاتے ہیں ۔

مثالیں :

(صفحہ ۱۷) ''گھر دھنی ووچہ جس کوں گھر ہے خوب ، ووچہ صاحب جسے نفر ہے خوب ۔''

یہاں 'جس کوں' اور 'جسے' فارسی محاورے کے مطابق آیا ہے ۔ اردو محاورے کے مطابق دونوں جگہ 'جس کا' آئے گا ۔

(صفحہ ۱۱٦) ''اندلیاں ہور احمقاں کی باتاں کوں کیا اعتبار ۔''
یہ 'کوں' بھی اضافی ہے ۔

(صفحہ ۱۹۴) ''تجھے کوہ قاف کی پریاں میں ایک ہمزاد ہے ۔''

اس جملے میں اردو محاورے کے مطابق 'تجھے' کی جگہ 'تیرا' چاہیے لیکن مصنف نے فارسی 'ترا' کی تقلید کی ہے ۔

(صفحہ ۲۸۸) ''تو ہمیں بھائی ہے ۔''

یہ بھی فارسی محاورے کا ترجمہ ہے یعنے 'تو مارا برادری' ۔

(صفحہ ۸۰) ''قامت کوں یک غلام تھا ، سیم ساق اس کا نام تھا ۔''
'کوں' یہاں پھر اضافی ہے ۔

بائے مفعولی

فارسی کی ایک 'ب' ہے جس کو مفعولی کہا جا سکتا ہے ۔ اہل اردو اس کے ترجمے میں 'کو' لایا کرتے ہیں مثلاً 'بفریاد من برس' ۔ میری فریاد کو پہنچ ۔ 'بہ شکار رفتہ بودیم' ۔ ہم شکار کو گئے تھے ۔ او بمدرسہ خواہد رفت ۔ وہ مدرسے کو جائے گا ۔ وغیرہ ۔ وجہی حسب محاورہ اس 'ب' کا مفہوم 'کوں' کے ذریعے سے ادا کرتا ہے :

(صفحہ ۱۳۷) ''صاحب کا فتح ہوے تو مراد کوں انپڑے نفر ۔''
(بہ مراد خود برسد) ۔

(صفحہ ۲۱) ''جو عشق نمرا نہایت کوں انپڑیگا اس دھات۔'' (یعنے به نہایت خواهد رسد)۔

(صفحہ ۲۹۱) ''خلق کوں مراد کوں انپڑاتا ھے۔'' (یعنے خلق را بمراد می رساند)۔

(صفحہ ۲۱۴) ''چوری شکار کھیلنے کیوں جیو بھگے ، جوں رات کوں نسی کوں مچھلی لگے۔'' (ماھی۔ در شب سست افتد)۔

(صفحہ ۱۲۷) ''میرے کام کوں ھور دسریاں کے کام کوں زمین آسماں کا فرق۔''

(صفحہ ۱۵۴) ''مرتضیٰ کو ذوالفقار آیا ، تو مرتضیٰ اس جاگا کوں اپڑے۔'' (یعنے چوں ذوالفقار به مرتضیٰ رسید مرتضیٰ بدیں جایگاہ رسید)۔

یائے زائدہ

بعض اوقات فارسی والے ایک یائے زائدہ کلمے کے آخر میں لایا کرتے ھیں جس سے معنوں میں کوئی تبدیلی نہیں ھوتی۔ مثلاً ھور و حوری ، زیان و زیانی ، پنہان و پنہانی ، قربان و قربانی ، سلامت و سلامتی ، زیادت و زیادتی ، حضور و حضوری وغیرہ۔ اس کی تقلید ھندوستانی زبانوں میں بھی ھوئی ھے جن میں پنجابی اور دکنی قابل ذکر ھیں۔

سعادتی :

(صفحہ ۱۰) ''اگر تمام ھے تو ادھر کی سعادتی کا گر حیات ھے تو ادھر کی سلامتی کا۔'' (یعنے سعادت)۔

خماری :

(صفحہ ۱۳۵) ''شراب کے اثر کا نتیجہ آخر خماری ھے ، ھلاکی حور حواری ھے . . . . . پچھیں خماری کے کھینچا کھینچی سے جیو جاتا۔'' (یعنے خمار)۔

حیفی :

(صفحہ ۱۶۱) ''بھوت پچھتا کر حیفی کھانے لگیا۔'' (یعنے حیف)

خاطر داشتی :
(صفحہ ۱۲۶) ''بہوت خاطر داشتی کیا ، بہوت سمجایا ، تقوی دیا ۔''
(یعنے خاطر داشت) ۔

شرم حضوری :
(صفحہ ۶۴) ''صاحب کے کام پر نظر نیں ، ہر کس کی شرم حضوری کرتے ۔'' (حضور) ۔

بحسب ظاہری :
(صفحہ ۱۳۳) ''اگرچہ بحسب ظاہری میں شراب پینا گناہ ہے ۔''
(بہ حسب ظاہر) ۔

اعتباری :

یائے فاعلی

یائے معانی بعض اوقات فاعلیت کے لیے بھی لاتے ہیں ، جیسے گشت و گشتی ، خون و خونی ، محنت و محنتی وغیرہ ۔ اس کے اتباع میں الفاظ ھذا ملتے ہیں :

غدری (غدار) :
(صفحہ ۲۱۸) ''کتیک مرداں غدری اچھتے ہیں ، نا قدری اچھتے ہیں ۔'' (یعنے غدار اور ناقدر) ۔

ستمی (ستمگار) :
(صفحہ ۲۴۴) ''نہیں کرنا ، سو ایسے ستمی فعل بد پر لیائے ۔''

مکری (مکار) :
(صفحہ ۱۳۲) ''یو مکری دغا بازاں کام کہا آتے ۔''

'ئی' مصدری

ایسے کلمے جو الف یا 'ے' پر ختم ہوتے ہیں ان پر 'ئی' لاحقہ لانے سے اسم حاصل مصدر بن جاتا ہے ، جیسے پارسا و پارسائی ، گدا و گدائی ، زیبا و زیبائی ، حنا و حنائی وغیرہ ۔ اس قاعدے کی بنا پر بعض الفاظ میں بے موقع تصرف کیا گیا ہے :

استغنائی :

(صفحہ ۹۵) ''عاجری ہور اسغنائی ، یو ایک صفت ہے عشق کی جو دو صفت ہو آئی ۔'' (یہاں اسغنا چاہیے) ۔

نفرائی :

(صفحہ ۱۳۷) ''جو نفر نفرائی نہیں سمجھیا ، اس نفرتے کیا ہوے کام ، صاحب کوں صاحبی سہانا بہوت مشکل ہے ، نفر کوں نفرائی انا بہوت مشکل ہے ۔''

قبول صورتائی :

(صفحہ ۲۶۰) ''جن عورت نے یو جھند نہیں پائی ، کیا کام آتی رو کھی قبول صورتائی ۔'' (قبول صورتی) ۔

خوبائی :

(صفحہ ۲۶۷) ''برائی بغل میں خوبائی ہات میں ۔'' (خوبی) ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ ہماری زبان کی تعمیر کرنے والوں کے پیش نظر تھا ۔ جہاں جہ ہندی الفاظ پر بھی اسی کا عمل کیا گیا ۔

کڑوائی اور مٹھائی :

(صفحہ ۵۲) ''اس غم میں کیوں خوشی آئی ، اس کڑوائی میں کون رکھے مٹھائی ۔'' (یعنی کڑواہٹ اور مٹھاس) ۔

بڑائی :

(صفحہ ۷۳) ''تھنا کام کیا قبول ، بڑائی کاں تے آئیگی دھول ۔''

چاترائی :

(صفحہ ۸۴) ''اپنی چاترائی کچھ قام نیں کی ، ناکامی کچھ کام نیں کی ۔''

'گی' لاحقہ

فارسی میں 'گی' لاحقے سے اسم مصدری بنتا ہے - مثلاً بندہ اور بندگی ، فرخندہ اور فرخندگی ، افسردہ اور افسردگی ، بیچارہ اور بیچارگی ۔ اس قاعدے کی تقلید میں دکنی نے یہ بے محاورہ بدعت شروع کی :

(صفحہ ۸۷) ''اس کی پریشانی پر ، اس کی حیرانگی پر ، اس کی سرگردانگی پر مہر آئی ۔'' یہاں پریشانی ، حیرانی اور سرگردانی چاہیے ۔

(صفحہ ۱۰۶) ''انے فرمایا سواس کی فرمودگی بجا لیانا ہوں ۔'' (یعنی فرمان ۔ حسن دہلوی نے بھی فرمودگی باندھا ہے)

(صفحہ ۲۹۵) ''دوسری بار ایسی شیطانگی نکرے ۔'' (یعنی شیطنت)

(صفحہ ۱۶۴) ''انسو کی عقل جاتی بد مستی چڑتی ، بے خبراگی آتی ۔'' (یعنی بے خبری)

ان چند امور پر فارسی اثر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ گہرا ہے اور اس قدر رچا ہوا ہے کہ صرف غور و خوض کرنے اور کریدنے سے اس کا پتا چلتا ہے ۔ جذبات و خیالات سے قطع نظر دکنی جملوں کی ساخت بھی فارسی انداز کی نظر آتی ہے ۔ مثلاً :

(صفحہ ۸۰) ''نظر اپنا قصہ قامت کوں بولیا ، ہمنے مکتوب لکھیا تھا سو قامت کے انگھے کھو لیا ۔ قامت اس مکتوب کا مضمون خاطر لیایا ، بہت محظوظ ہوا ۔''

یہ سارا جملہ فارسی انداز میں ہے اور اردو کے انداز سے بہت دور ہے ۔ اردو میں اس کا ابتدائی حصہ یوں آئے گا :

''نظر نے قامت سے اپنا قصہ کہا ۔''

علی ہذا فارسی کا ایک فقرہ ہے 'گفت شنیدہ ام' ۔ یہاں ضمیر منفصل مذکور نہیں ہے ۔ دکنی اس موقع پر فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم دیتی ہے ۔ مثلاً (صفحہ ۹) 'کہی میں سنی ہوں' ۔ آج کے محاورے کے مطابق یہ فقرہ یوں بولا جائے گا : ''اس 'عورت' نے کہا میں نے سنا ہے ۔'' اردو میں ایسی صورتوں میں 'نے' علامت فاعل کا آنا لازمی ہے ۔ اہل دکن اس علامت سے واقف بھی ہیں اور استعمال بھی کرتے ہیں مگر فقرات بالا میں 'نے' کا عدم استعمال دکنیوں کی نا واقفیت اور سہل انگاری پر محمول نہیں ہونا چاہیے بلکہ فارسی کی تقلید کے جذبے کی بنا پر وہ آج بھی

بولتے ہیں 'رسول اللہ فرمائے ہیں' اور ہم اس کو بے محاورہ سمجھتے ہیں ۔ لیکن در حقیقت فارسی روزمرہ 'رسول اللہ فرمودہ اند' کا تحتی الفظی ترجمہ ہے ؛ اور کیا اس فارسی جملے کا اس سے بہتر کوئی اور ترجمہ بھی ہو سکتا ہے ؟

فعل فارسی میں فاعل کا تابع ہوتا ہے ۔ اردو میں 'نے' کے ایراد سے بالعموم مفعول کا تابع بن جاتا ہے ۔ مثلاً میں نے روٹی کھائی ، میں نے کھانا کھایا وغیرہ ۔ دکنی اس بارے میں فارسی کی تابع ہے ۔ عام اس سے کہ 'نے' موجود ہے یا نہیں ، مثلاً فارسی کا فقرہ ''کافران زبون شدند خراج دادند و دین قبول کردند'' دکنی میں یوں لکھیں گے :

(صفحہ ۱۵۵) ''کافراں زبوں ہوے ، خراج دے ، دیں قبول کیے ۔''

اس فقرے میں 'کافراں' فاعل بہ حالت جمع ہے ، اس لیے تینوں فعل جمع میں لائے گئے اور مفعول کی مطلق پروا نہیں کی گئی ۔

(صفحہ ۱۵۱) ''بھوڑیاں نے بہوتاں کو مارے ہیں ۔''

یہاں 'نے' موجود ہے لیکن فعل فاعل کی حالت کے مطابق ہے ۔ یہی حالت ذیل کے فقروں کی ہے :

(صفحہ ۱۲۷) ''دل پادشاہ عالم پناہ صاحب سماہ نے بولیا ۔''

(صفحہ ۹۰) ''القصہ حسن نار نے گل عذار نے انکھیاں کے سنگار نے دل کے ادھار نے سنی ۔'' (یہاں فاعل مؤنث ہے لہذا فعل مونث آیا)

(صفحہ ۸۴) ''جنے (عورت فاعل ہے) نخریاں میں انکڑی ، مرد کا دل ہات نیں پکڑی ۔''

(صفحہ ۹۱) ''یو بات ہوے مجھیں غمزے تے نظر کوں دسرے دیس حسن کے حضور لایا''۔

اس قاعدے میں ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی بالکل فارسی کے نقش قدم پر چل رہی ہے ۔ دکنی کے اسی جذبے کی مثال میں یہ فقرہ بھی ملاحظہ ہو :

(صفحہ ۳۶) ''اس ٹھار عاشق کوں شک لیانا کافری ہے۔''

جس کا فارسی میں ترجمہ یوں ہو گا 'اینجا عاشق را شک آوردن کافری است'۔ اس جملے میں 'را' دراصل حارہ ہے اور 'برائے' کے معنوں میں آیا ہے ، جیسے ع :

''خدا را بکن یک نظر سوی ما''

اردو میں اس کا ترجمہ 'واسطے' 'لیے' وغیرہ ہو سکتا ہے مگر فارسی کے تتبع کے ذوق میں دکنی نے 'را' کا ترجمہ 'کوں' مان کر اس میں وہی خاص معنی جو فارسی میں آ رہے ہیں ، تسلیم کر لیے ۔ ذیل کے شعر میں پہلا 'کوں' اضافی ہے ، دوسرا بہ معنی 'برائے' آیا ہے ۔ (صفحہ ۵۵) :

غرض دھرنا ہے نیں تو کیا غرض ہے یاں لگ آے کوں
جکوئی سیوا کرے کس کی تو کچھ مقصود پانے کوں
(یعنے برائے مقصود یافتن)

کاف فارسی میں متعدد معنوں میں آتا ہے ۔ ازاں جملہ وہ علت کے معنی بھی دیتا ۔ چناں چہ :

ز لشکر بود زور شاهنشہاں کہ یک تن بہ تنہا نگیرد جہاں

یہ کاف علت کہلاتا ہے اور بہ معنی 'چراکہ' لایا گیا ہے ۔ اب اردو نیز اور ایسی زبانوں میں جو مسلمانی اثرات میں آئی ہیں 'جو' کاف بیانیہ کا قائم مقام مانا گیا ہے مگر دکنی ایک قدم اور آگے بڑھی ہے ۔ اس نے اس لفظ میں بیانیہ کے علاوہ فارسی اصل کی مطابقت میں علت کے معنے بھی داخل کر لیے ۔ چناں چہ 'جو' علت کے لیے بھی استعمال ہونے لگا :

(صفحہ ۱۵۵) ''یو فتح تو ہونی نہی جو مال پر نظر نہ تھی ۔'' یہاں 'جو' کیوں کہ کا مفہوم ادا کر رہا ہے ۔

فارسی میں حکایتوں اور کہاوتوں کے شروع میں 'آوردہ اند' 'گفتہ اند' وغیرہ قسم کے جملوں کے لانے کا دستور ہے جن میں فاعل

دانایاں یا بزرگاں وغیرہ محذوف اور مقدر ہوتا ہے ۔ دکنی فارسی کی اس خصوصیت کو بھی نہیں بھولی ، چناں چہ :

(صفحہ ۱۶۳) "بولتچہ ھیں کہ بھوک ہور پیاس نبیاں اور ولیاں کی میراث ۔"

(صفحہ ۳۳) "بولیچہ ھیں کہ بندہ گنہگار خدا بخشنہار ۔"

(صفحہ ۲۹۱) "کہیچہ ھیں کہ خدا با حلق ، خلق با خدا ۔"

ان جملوں میں 'بولیچہ ھیں' اور 'کہیچہ ھیں' در حقیقت گفتہ اند کا ترجمہ ہے ۔ ایسے موقعے بھی موجود ھیں کہ جب تک دکنی کے مفہوم کو فارسی میں منتقل نہ کیا جائے جملے کا اصل مطلب معلوم نہیں ہوتا :

(صفحہ ۱۵۰) "فرصت ہے لگن کچھ کر لے ۔"

اردو میں اس کا ترجمہ "فرصت ہے تلک کچھ کر لے" بالکل نا تمام ہے اور مطلب ادا نہیں کرتا لیکن اس کا فارسی ترجمہ 'تا فرصت است چیزے بکن' اصل مطلب کو پورا پورا واضح کر دیتا ہے ۔ اسی طرح یہ جملہ ہے :

(صفحہ ۱۰۵) "جیوتا ہے لگن مرے کا کام کر ۔" (یعنی تا زندہٗ) ۔

علی ہذا یہ جملہ :

(صفحہ ۱۵۱) "پادشاہاں کوں تدبیر کرنا واجب ہے ، ولایت ہات میں ہے لگ ۔"

اس کا فارسی ترجمہ یہ ہوگا "پادشاہاں را تدبیر کردن واجب است تا ولایت در دست است ۔"

یہ جملہ بھی قابل غور ہے :

(صفحہ ۲۱) "اگر مرد ہے تو عشق اپنا کمال کوں انپڑا ، فراق میں کی ہلاک ہوتا ، اپس کوں وصال کوں انپڑا ۔"

اس جملہ میں جو گنجلک ہے وہ فارسی میں ترجمہ کرنے سے رفع ہو جاتی ہے یعنی

''اگر مرد هسی عشق خود به کمال برسان ؛ در فراق چه هلاک شوی خود را به وصال برسان''

ایک اور جملہ ہے :

(صفحہ ۱۱۲) ''ولے یو بھید کوں سمجھنا بہوت مشکل ہے۔''

اردو میں بھی مطلب یوں ادا ہوگا :

'یہ بھید سمجھنا بہت مسکل ہے ، یا اس بھید کا سمجھنا بہت مشکل ہے ۔'

مگر وجہی ان دونوں کے برعکس فارسی محاورے ''ولے این راز را فہمیدن خیلے مسکل است'' کا پابند ہے ۔

فارسی حروف 'از' 'بہ' اور 'با' کا ترجمہ اردو میں 'سے' مانا گیا ہے ۔ مثلاً 'ازو گرفتم' میں نے اس سے لیا اور 'باو گفتم' میں نے اس سے کہا ۔ دکنی اس موقع پر 'از' اور 'بہ' کا فرق قائم رکھتی ہے ۔ دکنی زبان میں 'از' کا ترجمہ 'تے' اور 'بہ' کا ترجمہ 'سوں' کیا جاتا ہے اور اردو کی طرح ان کے استعمال میں کبھی کوئی خبط نہیں ہوتا ۔ چناں چہ :

(صفحہ ۱۵۹) ''اپنی عقل سوں اگر دسرے کی عقل ملے تو واہ واہ اس تے بی کیا خوب ۔''

اس جملے میں سوں 'با' کے واسطے اور تے 'از' کے لیے آیا ہے ۔

یہی نہیں بلکہ فارسی اثر ادنیٰ ادنیٰ الفاظ پرآمر ہے ۔ دانا کا ترجمہ 'جانتا' اور نادان کا 'انجانتا' ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں ، 'گھر گھالو' (صفحہ ۳۲) 'خانہ خراب' کا قائم مقام ہے ۔ 'ھر یکے' کا ترجمہ 'ھر یک کوئی' وضع ھوا ۔

(صفحہ ۴۳) ''ھر یک کوئی اپنے مرانب کوں خوبیچہ کر جاننا ۔''

اسی طرح چرا کا ترجمہ 'کیا واسطہ' اور درمیان کا 'میانے میان' ٹھہرا ۔

(صفحہ ۲۲) ''موسیٰ دیکھنے کا باب ہرگز میانے میان نالیاتا ، کیا واسطہ کہ وو پیغمبر تھا۔''

بالیں بال 'مو بہ مو' کا ترجمہ قرار پایا ۔ مصرع :

مو بہ مو حال پریشانی من میگوید

(صفحہ ۸۶) ''جیب لگا کر نالیں بال ، بولیا اس کنے سب احوال ۔''

(صفحہ ۱۶۷) ''آدمی کوں پریشانگی ہے بالیں بال ، خداچہ ہے جو وو رہتا ہے یک حال ۔''

ایک اور پہلو ہے جس پر اگرچہ میں نے کافی غور نہیں کیا مگر تحقیق و تلاش سے ممکن ہے کہ جدید امور روشنی میں آئیں ۔ میں یہاں صرف ایک دو مثالوں پر قناعت کرتا ہوں ۔

'دزدیدن' مصدر سے حاصل مصدر 'دزدی' امر 'دزد' اور اسم فاعل 'دزد' ہے ؛ اردو میں اس کا ہم معنی 'چورنا' ہے جو چرانے کی قدیم شکل ہے - چورنے سے حاصل مصدر 'چوری' امر 'چور' اور اسم فاعل 'چور' آتا ہے ۔ ان مصادر میں یہ مشابہت اتفاق ہے یا ارادی ؟ اگرچہ ایک آدھ مثال پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا مگر ہمیں یہ معلوم ہے کہ اردو کا اٹھان فارسی کے آغوش میں ہوا ہے ۔

ایک اور مثال مصدر 'خواستن' کی دی جاتی ہے ۔ یہ مصدر کئی معنوں میں آتا ہے ۔ مثلاً :

(۱) چاہنا ، خواہش کرنا ، آرزو کرنا
(۲) سوال کرنا ، گدائی کرنا اور پوچھنا
(۳) دوست رکھنا اور محبت کرنا

دکنی میں منگنا 'خواستن' کا مرادف ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ 'خواستن' کے معنوں کی تمام مختلف جہات پر حاوی ہے ، چناں چہ منگنا بہ معنی اول :

(صفحہ ۲۸) ''دنیا کوں لوگ منگتے ہیں سو دنیا کا ذوق کرنے خاطر ۔''

(صفحہ ۱۰) ''اگر دین ہور دنیا کا امید پانے منگتا ہے تو ہو
کتاب دیکھ ۔''

معنی دوم :

(صفحہ ۴۵) ''جسے دیکھے دنیا دار منگنے کھڑے رہے ہات پسار۔''

(صفحہ ۴۵) ''لاج سٹ کر منگتا منگن هارا .... شرم کا
کوئی منگے تو وهاں کہے هیں دهرم ، بے شرم
گھڑی گھڑی منگتا ، اسے منگنے کی کیا شرم ، اسے
خوش لگا ہے منگ لینا۔''

اس جملے میں 'منگنهارا' 'خواهنده' کا ترجمه به معنی سوالی و گداگر آیا ہے ۔

معنی سوم :

''اگر تو منگتا ہے که خلق ہمے منگے ، تو تو پیکاں کوں نکو منگ ،
جو تو پیکاں کوں منگتا تو بج میں هرگز نا رهسی رنگ ۔''

(صفحہ ۲۱۸) ''بعضے مرداں جو کوئی عورت منگتی اسے خوار کرتے ،
جو کوئی نیں منگتی اسے پیار کرتے ، جو کوئی
منگتی اس سوں نخرے ناز ۔'' الخ

یه ناممکن ہے که ان مصادر کے واضعین نے یه متفاوت پہلو دار معنی شروع هي سے ان کے لیے مخصوص کر دیے هوں ۔ هارے نزدیک یه هم رنگی اتفاقی نہیں بلکه ارادی ہے جو ترجمے کی غرض سے پیدا کی گئی ہے ۔ یه قاعده دکنی کے لیے جدید نہیں ہے بلکه دیگر مسلمان زبانوں میں بھی ملتا ہے ۔ مثلاً عربی 'انسان عین' اور فارسي 'مردم چشم' عربی 'قطع الطریق' ، فارسی 'راه زدن' اور اردو 'باٹ مارنا' ؛ نیز ان کے اسم فاعل 'قاطع الطریق' ، 'راه زن' اور 'بٹ مار' اتفاقیه پیدا نہیں هوئے ، بلکه ان میں ایک دوسرے کا پرتو ہے جو به غرض ترجمه وضع هوا ہے ۔ اور کیا یه امر اختلاف السنه کے باوجود مسلمان اقوام کے جذبات و خیالات کی هم آهنگی اور هم رنگی کا ثبوت هارے سامنے پیش نہیں کرتا ؟

اس معاملے سے یہ امر ہمارے ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ اردو پر فارسی اثر ، جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر خیال کیاجاتا ہے ، بارھویں صدی سے شروع نہیں ہوتا ، بلکہ اس سے بہت زیادہ قدیم ہے اور یہ لحاظ وسعت بے پایاں ہے جس کا اندازہ کرنے سے ہم ابھی قاصر ہیں ۔ اس مسئلے پر صرف دکنی روشنی ڈال سکتی ہے جس کے لٹریچر کی قدامت اردو کے مقابلے میں مسلمہ ہے ۔

عربی اور فارسی الفاظ میں تصرفات

اردو کی نشو و نما ابتداً غیر تعلیم یافتہ طبقوں میں ہوئی ہے ؛ تعلیم یافتہ جماعت بہت دیر بعد اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے ، اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ سیکڑوں عربی و فارسی الفاظ رواج عام میں آج بھی غلط بولے جاتے ہیں ۔ تحریری اردو میں ایسے الفاظ کا داخلہ بند ہے لیکن یہ اصلاحی تحریک ہمارے ہاں میر و سودا کے عہد سے جاری ہے ۔ اس عہد سے پیشتر بالخصوص دکن میں جہاں اردو کی ادبی تشکیل شمالی ہند سے بہت پہلے شروع ہو گئی ہے ، دکنی اہل قلم اپنے آپ کو عام بول چال کا پابند بنا دیتے ہیں اور عوام الناس کا تلفظ اختیار کر لیتے ہیں ۔ چناں چہ دکنی میں بے شمار ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کو عوام کے تصرف نے کچھ کا کچھ بنا دیا ۔ اعراب کی خفیف تبدیلی سے لے کر لفظ کی شکل بلکہ معنی تک میں ہر قسم کی ترمیم و تنسیخ روا رکھی گئی ۔ مثلاً حروف حلقی جن کا عربی سے تعلق ہے ، بالکل اُڑا دیے گئے ؛ قریب المخرج حروف کا فرق مٹا دیا گیا ؛ بعض الفاظ پر غلط لا حقے لگا دیے گئے اور لفظ کے آخر کی 'ہ' کو 'الف' سے بدل دیا گیا ۔

(۱) 'ہ' اور 'ع' کا 'الف' کے ساتھ تبادلہ :

(صفحہ ۱۴) معنا (معنٰی) (صفحہ ۱۵۵) مانا (معنٰی)
(صفحہ ۱۱٦) خاصا (خاصہ) (صفحہ ۱۱۷) منا (منع)
(صفحہ ۱۱۹) وضا (وضع) (صفحہ ۱۲۰) بچارا (بیچارہ)
(صفحہ ۱۲۲) نفا (نفع) (صفحہ ۱۲۵) قصا (قصہ)
(صفحہ ۱۳۱) اندیشا (اندیشہ) ، تیشا (تیشہ)

(صفحہ ۱۵۵) صبا (صبح) (صفحہ ۵۹) آلا (اعلیٰ)
(صفحہ ۱٦۲) واقا (واقعہ) (صفحہ ۱٦۳) طما (طمع) ، جما (جمع)
(صفحہ ۲۱۱) حیلا (حیلہ) ، وسیلا (وسیلہ)
(صفحہ ۲۳۸) خطرا (خطرہ) (صفحہ ۲٦٦) ماملا (معاملہ)
(صفحہ ۱۹٦) غمزا (غمزہ) ، عشوا (عشوہ)

(۲) معنی کے لحاظ سے تصرف :

نقویٰ : اصل معنی ترس و پرهیز هیں ، مگر دکنی میں جیسا کہ فاضل مرتب نے لکھا ہے اطمینان اور ڈھارس کے معنی دیتا ہے ۔

(صفحہ ۸۷) ''خدا کوں نکو بسر ، نقوی کم نکو کر ۔''

رقوم : بہ معنی شہرت و نام ۔ فاضل مرتب نے یہی معنی دیے هیں ۔

(صفحہ ۲۸۰) ''عورت خوب عورتاں میں جس کی رقوم ، وو تو النادر کالمعدوم ۔''

فتوا : یعنی فتنہ ۔

(صفحہ ۱۸۵) ''کیا جانے کیا فتوا اچاتا ہے ۔''

نقشاں چننا : نکتہ چینی کرنا ۔

(صفحہ ۲۳۵) ''لوکاں پر نقشاں چنے بغبر رهتے هیں ۔''

اختیار : شاید بہ معنی مختار آنا ہے ۔

(صفحہ ۱٦۰) ''دل کے ادهار کوں شہر دیدار کوں جانے اختیار هوا پانوں سار هوا ۔''

(صفحہ ۱۵۷) ''جو کوئی صاحب سوں یو اختیار اچھے ، اس کا دل صاحب خاطر کیوں نہ پکڑے اچاٹ ۔''

(۳) الفاظ میں تصرف :

(صفحہ ۹۱) رویش (روش) (صفحہ ۱۱) کلیمہ (کلمہ)
(صفحہ ۱٦۴) پس غیبت (غیبت ، پس پشت)
(صفحہ ۲۰۰) ورزور (زور آور) (صفحہ ۱۵۰) جناور (جانور)

(صفحہ ۱۲۳) فام (فہم) (صفحہ ۱۲۸) زیاست (زیادت ، زیادہ)
(صفحہ ۱۲۹) معادے (معاضے) (صفحہ ۱۳۱) نزیک (نزدیک)
(صفحہ ۱۶۰) منا خوری (منہا خوری)
(صفحہ ۱۹۴) اندیشوان (اندیسناک)
(صفحہ ۲۳۱) گمٹ (گنبد) (صفحہ ۲۳۱) منا منی (منی و مائی)
(صفحہ ۴۴) مہروان (مہربان) (صفحہ ۲۴۶) فصیتے (فضیحت)
(صفحہ ۲۵۳) زہار (زہر) (صفحہ ۲۹۹) مستید (مستعد)
(صفحہ ۳۰۰) ناباب (بیاب) (صفحہ ۱۴۹) نیزی (نازی اسپ)
(صفحہ ۱۰۱) شناس (شناخت) (صفحہ ۱۸۲) نفاس (تفحص)
(صفحہ ۰۰۰) غلغال (غلغلہ) (صفحہ ۱۰۷) صبور (صبر)

اردو اسالیب

جو چیز 'سب رس' کو ہماری نگاہ میں سب سے زیادہ قیمتی بناتی ہے وہ اس کے اسالیب ہیں ۔ ان اسالیب میں ہم محاوروں ، ضرب المثلوں نیز ہر قسم کے دیگر مخصوص روزمروں کو جو خواہ ایک ہی لفظ کے دہرائے جانے سے یا قریب المعنی الفاظ و افعال کے آمیز سے بنتے ہیں ، داخل سمجھتے ہیں ۔ ان سے ہم کو زبان کی وہ حالت معلوم ہوتی ہے جو اب سے تین سو سال قبل رائج تھی اور پتا چلتا ہے کہ زبان انتشاری کیفیت کو خیر باد کہہ کر ایک مرتب اور منظم شکل اختیار کر چکی ہے ۔ جب ہم ان اسالیب کا موجودہ زبان کے اسالیب سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں بہت خفیف فرق معلوم ہوتا ہے ۔ نمونے کے واسطے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۔

روزمرے اور محاورات

صفحہ نمبر	قدیم	جدید
۲۹۵	'شکر کی چھری ہے'	'میٹھی چھری'[1] (ا)
۲۲	'کیا خالہ کا گھر ہے؟'	'خالہ جی کا گھر یا خالہ کا گھر' (ا)

۱ ۔ علامت (ا) سے مراد فرہنگ آصفیہ ، (ج) سے مراد نجم الامثال اور (ز) سے مراد خزینۃ الامثال ہے ۔

ضیاء برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے : ''چناں کہ خوردگان بہ خانۂ خالگان می روند ۔'' (صفحہ ۳۱۴ ، طبع کلکتہ)

صفحہ	قدیم	جدید
۴۳	'بڑائی کہاں ہے آئگی ڈھول'	(یعنی کیا خاک آئے گی)
۲۵۷	'قیا قیا کرنا'	'قیمہ قیمہ کرنا' (ا)
۱۵	'لڑنا جھگڑنا'	(آج بھی رائج ہے)
۷۰	'مائی جائی'	'ما جایا'
۲۴۴	'چھپے چوری سوں'	'چوری چھپے' (ا)
۲۳۵	'اپنا گڑ چھپا کھانا'	'راز چھپانا'
۹۶	'بھانڈا پھوڑنا'	'بھانڈا پھوڑنا' (ا)
۸۶	'شرم حضور'	'شرم حضوری' (ا)
۱۳۲	'گھر گھالو'	'خانہ خراب ، خانہ برباد'
۲۵۹	'بھلا برا'	'برا بھلا'
۳۱	'جدھر تدھر'	'جدھر تدھر'
۸۷	'جیوں تیوں'	'جوں توں'
۳۷	'کھینچا کھینچی'	'کھینچا کھینچ' (ا)
۱۷۰	'نھاٹا نھاٹ'	'بھاگا بھاگ' (ا)
۱۹۱	'لال گلال'	'لال گلال'
۲۰۷	'مارا مار'[۱]	'مارو مارو' (برن بکش)
۶	'پیٹ پکڑ پکڑ کر ھسنا'	یعنی 'پیٹ بھر کر ھنسنا'
۷۰	'کوڑ کپٹ'	'کینہ نفاق ، دغا فریب'
۲۳۰	'فراق کے جلے بلے'	'جلے بلے' (ا)
۶۱	'پیشانی کوں بدنامی کا ٹیکا لاوو'	'بٹہ لگانا ، داغ لگانا'

۱ ۔ 'مارا مار' کو اردو کی تاریخ میں بڑا پرانا لفظ ہے ۔ غزنوی دور کے لاھوری شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان متوفی ۵۱۵ھ اسی مفہوم میں اس کا استعمال کرتے ھیں ۔ ع :

و رعد ز ابر بغرید کوس محمودی بر آمد از پس دیوار حصن مارا مار

صفحہ	قدیم	جدید
۱۳	'یو ہی کیا نھنواواں کا کھیل ہے ؟'	'بچوں کا کھیل' (ا)
۷۷	'سجے پربولاں دھرے'	یعنی 'باپ لاتے' (ا) فارسی 'سخن داشتن' کا ترجمہ ہے
۲۴۵	'کسو نچے کسو نے د ھڈورا پھراتے'	'ڈھنڈورا پھیرنا' (ا)
۳	'شاں نہ گماں ، جان نہ پچھان'	آج بھی یوں ھی بولتے ھیں
۸۲	'حوبا خون'	'حون حرابہ ، کشت و خون'
۷۵	'ماٹی میں جاؤ ننگ و نام'	یعنی 'خاک میں ملے ، برباد ھو بلا سے'
۲۴۴	'کدھیں مدھیں'	'کبھی کبھار ، کدھی کدھار' (ا)
۲۶۸	'بلوے مس عقل'	یعنی 'ناقص العقل یا گدی مس عقل'
۲۶۱	'گھرداری دھندا'	یعنی 'حانہ داری کا دھندا'
۱۰۴	'دیتا دلاتا ہے'	'دیتا لیتا ہے' (ا)
۹۸	'ڈاواں ڈول'	'ڈانواں ڈول'
۱۵۹	'گانٹ باندھا'	'گانٹھ رکھنا ، کپٹ رکھنا'
۲۸۷	'ادھر اودھر'	'ادھر آدھر'
۱۴۶	'باٹ کے روڑے'	'باٹ کا روڑا' سنگ راہ کا ترجمہ ہے
۱۶۱	'پکڑیا جکڑیا'	'پکڑنا دھکڑنا'
۱۷۸	'داد نہ فریاد'	'داد نہ فریاد' (ا)
۲۰۲	'لوگ ھنسائی'	'لوگ ھنسائی ، جگ ھنسائی' (ا)
۱۶۰	'ھنستا کھیلما'	'ھنستا کھیلتا'
۲۴۹	'سچیں مچیں'	'سچ مچ'
۲۸۰	'بھولے چوکے'	'بھولے چوکے'
۷۷	'سجے کوں اڑاے'	یعنی 'ھنسی میں اڑاتے'
۱۱۸	'جھک مارنا'	'جھک مارنا'
۱۳۱	'خلل بھانا'	'حلل ڈالنا'
۱۳۷	'انومیں کیا ماٹی اچھیگی عقل'	'کیا خاک عقل ھو گی'

صفحہ	قدیم	جدید
۱۵۹	'اپنی عقل ہوئی ہوائی'	'عقل چرخ ہو گئی'
۲۱۹	'اپنے گریبان میں کچھ نہیں بجارتے'	'اپنے گریبان میں منہ نہیں ڈالتے'
۱۶۳	'اس برائی پر بی اینٹ اینٹ مرتے'	'اینٹھ اینٹھ مرنا'
۲۱۰	'عقل پر باب آنا ہے'	'باب آنا ، حرف آنا' (؟)
۲۶۷	'ماں کے پیٹ میں تے نکلتا'	یعنی پاک و معصوم
۳۵	'یو بزرگی باٹ میں نیں پڑی'	یعنی مفت نہیں ملا کرتی
۱۳۷	'ایسے نفر کوں چولھے میں بھاؤ'	یعنی چولھے میں جھونکو ۔
۱۵۲	'کام سب ہو گیا بھنگ'	'بھنگ ہو گیا ، خراب ہو گیا'
۱۵	'اس کا موں کالا'	یعنی کالا منہ ہو
. . .	'دودھ میں کانجی'	ع : 'ارے یہ دودھ کانجی کن رلائی' (محمد اکرم رھتکی در تیرہ ماسہ)
۱۷۶	'بارہ باٹ'	'بارہ باٹ' ، 'تتر بتر'
۲۲۲	'الابلالی'	'الائے بلائے لینا ، صدقے قربان جانا'
۲۹۵	'جان جائے گی واں بلا بسائے گی'	'فتنہ برپا کرنا ، آفت لانا'
۱۳۳	'باقی سب ٹکرے کے کتے'	'پیٹ کے کتے' (؟)

اردو روز مرہ میں حسن کلام کی غرض سے بعض افعال و الفاظ کی تکرار کی جاتی ہے ، دکنی میں یہ طریقہ بھی رائج ہے :

(صفحہ ۱۸۶) ''یونچہ چٹک لاتے لاتے ، پھاندے میں پھاتے پھاتے ، پھسلاتے پھسلاتے دیدار کے شہر لگن آئے ۔''

(صفحہ ۲۱۲) ''دیکھتے دیکھتے ، سنتے سنتے ، خاطر لیاتے لیاتے ، فکر کرتے کرتے ، رھتے رھتے معلوم ہوتی ہے کام کی دھاب ۔''

(صفحہ ۵۰) ''جاتے جاتے ، تلملاتے تلملاتے ، حیفے کھاتے کھاتے باٹ میں دیکھا ۔''

ضرب الامثال

صفحہ	قدیم	جدید
٢٨٠	'چور پر مور پڑیا'	'چور پر مور یا چور کے گھر مور' (ا) ، (ج)
١٢	'نهما فهم بڑی باب'	'چھوٹا منه بڑی باب (ج)
٢٣	'اس باب کا کون پایا کھوج ، کہاں گنگا بیلی کہاں راجه بھوج''	'کہاں راجا بھوج کہاں گنگا بیلی' (ح) ، (ر)
٣٣	'دولیچه هیں که بنده گنهگار خدا بخشن هار'	....
٣٦	'بقول اهل هند چکنے گھڑے پر پانی ڈھلتا'	'چکنے گھڑے پر بوند پڑی اور پھسل گئی'
٦١	'رام جو جان کر راون پر آئے ، گھر کے بھیدی نے لنکا جائے'	'گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے' (ا) ، (ح) ، (ر)
٣٤	'به قول اهل هند پیاسا کیا منگیا پانی'	'پیاسا کیا مانگے پانی'
١٣٨	'جاں پانی نا ملے واں گردن مار'	'اس کی گردن وهاں مارے جہاں پانی نه ملے' (ز)
١٤٢	'اصل سے کچھ خطا نہیں کم ذات نے وفا نہیں'	'اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں' (ا)
١٤٤	'گھرگھٹ کی دوڑ باڑی لگن'	'گرگٹ کی دوڑ بھٹی تلک' (ز) 'گر گٹ کی دوڑ بٹورے تک' (ح)
١٤٧	'مشهور هے که جدهر هنڈی ڈوئی اودهر سب کوئی'	'جس کے هاتھ ڈوئی اوس کا سب کوئی' (ز) ، (ح)
١٤٧	'اول خویش بعد از درویش'	'اول خویس بعده درویش'
١٢	'باپ یوں ہی آئی که جانتے کا گر انجانتے کا بھائی'	....

صفحہ	قدیم	جدید
۱۴۷	'گھر کوں دیوا تو مسجد کوں دیوا'	'پہلے گھر میں تو پیچھے مسجد میں' (ر) ، (ج)
۱۴۷	'یو وو مصہ کہ' ع :	'باھر کے کھا جائیں گھر کے گیت گائیں' (ز) 'باھر کے کھاویں گھر کے گاوں' (ح)
	چار بلائے چودہ آئے سنبو گھر کی ریت	'.ں بلائے سرہ آئے دیکھو یاں کی ریت'
	بھار کے آ کر کھا گئے گھر کے گائیں گیت	باھر والے کھا گئے اور گھر کے گاویں گنب' (ح)
. . .	'اوھیچہ قصہ کہ ھتی کوں کلچڑی ضہان'	....
۱٦۳	'بولیچہ ھیں کہ بھوک ھور نبیاں ھور ولیاں کی پیاس میراث'	....
۱٦۲	'چڑنا سو پڑتا ھے'	'جو حڑھے گا سو گرے گا' (ح)
٦۵	'دنیا دوپہر کی چھانوں'	....
۱۸۰	'دونوں ھات ملنے بجتی ھے تالی'	'دونوں ھاتھوں تالی باجتی ھے' (ز) 'دونوں ھاتھ تالی بجنا' (ا)
۱۸۸	'دغے سوں چمٹی ھتی کوں مارے'	....
۱۸۹	'ھمیاں انباڑیاں سوں ڈبتے بکری کتی مجھے کیتا پانی'	'اونٹ ڈوبیں بھیڑیں تھاہ مانگیں' (ز) ، (ج)
۱۹٦	'ادھر بائیں اودھر کوا ھے'	'ادھر کنواں آدھر کھائی' (جامع اللغات)
۱۹۷	'درد خراسان میں دارو ھندوستان میں'	....

صفحہ	قدیم	جدید
٢١٩	'یو باٹ چلبچہ ہے سب کئیں کہ بھلے کی دنیا نئیں'	'بھلے کا زمانہ نہیں' (ا)
٢٣٣	'کینچ ہیں کہ اپنا گھر خوشی بھاے سو کر'	....
٢٥٧	'کتے کوں کھیر جروتی ہے؟'	'کبے کو گھی نہیں پچتا'. (ا)
٢٦٦	'جس نے نیں سنیا بڑیاں کی باٹ اس کوں کوں ہونا نحاب'	'جس نے نہیں سنی بڑوں کی سیکھ وہ لے ٹھکرا مانگے بھیکھ'
٢٧٢	'دس گناہ حدا ی بخشتا ہے'	'دس گناہ خدا بھی بخشتا ہے (ز)
٢٧٦	'دود کا جلا حھاحھ پھونک پیتا'	'دودھ کا جلا حھاحھ پھونک پھونک پیے (ز) 'دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک پتا ہے (ج) 'دودھ کا جلا حھاحھ پھونک پھونک کر پتا ہے' (ا)

دکنی ضرب الامثال

(صفحہ ٤٧) 'یو سمجے نیں دراصلا' دکھن کا ہے یو مثلا " جو کوئی آوارا وہ بھائی ہمارا ۔"

(صفحہ ٤٨) 'جوں دکھنی مثل ہے "مرنا مرنا حو کے نا' ایسا مرنا حو کوئی بھوکے نا ۔"

(صفحہ ١٣٦) 'جوں دکھن میں چلیا ہے کہ "میاں متے دنیا میں رھتے' ھاں کوں ھاں کی نیں کتے" (؟)

(صفحہ ١٥٦) 'مثلا ہے دکھن میں اگر کوئی سمجھے من میں "لوٹ کا لوٹ کا کلوٹ ، (حرص) لت میں لت غفلت ۔"

(صفحہ ٢٢٦) "دکھنی دھرا :

تیرے کرب کرنے تے میں چپ ھوئی بدنام
میں میانے تے اٹھ گئی نو جانے تیرا کام

(صفحہ ۱۴۹) ''دکھنی میں بھی بولے ھیں کہ ٹٹو کوں ٹومنی (ایڑ - ٹھوکر) تیزی کوں اشارت -''

لیکن یہ کہاوت اردو میں موجود ھے ، چناں چہ :

''ٹٹو کو کوڑا اور تازی کو اشارہ'' (جامع اللغات) اور کسی قدر اختلاف کے ساتھ یوں بھی آئی ھے :

''بھلے گھوڑے کو ایک چابک بھلے آدمی کو ایک بات -'' (ز) ، (ج)

اس کے علاوہ خود مصنف کے دانشمندانہ مقولے نہ صرف خیالات کی پاکیزگی اور بیان کی چستی کی بنا پر بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ تجربے اور حقیقت پر مبنی ھیں اور اعلیٰ اخلاق معیار کے حامل ھیں ، اس قابل ھیں کہ کہاوت اور ضرب‌المثل کے طور پر نقل ھوں - میں نمونے کے طور پر صرف چند یہاں نقل کرتا ھوں :

(صفحہ ۱٦) '' نہ آپ دیکھے نہ زازلا ، آپے بھلے تو عالم بھلا -''

(صفحہ ۳۴) '' سمجیا سو پایا ہیں سمجھا سو گنوایا -''

(صفحہ ۳۹) ''آفتاب کوں کوئی بغل میں مارپا ھے -'' (؟)

(صفحہ ۴۲) ''آرسی ھات میں ھور موں دیکھنے نیں آتا -''

(صفحہ ۵۴) ''ھمت ہے نیست ھوتا ھست د نیا میں ھمت بڑی بست -''

(صفحہ ٦۴) ''بڑے ھونا کیا بات میں پڑیا ھے -''

(صفحہ ۵۵) ''کیا کام آوے رس نیں سو گانڈا ، جس میں ھمت نیں سو خالی بھانڈا -''

(صفحہ ٦۳) ''دل کا یار سو پاک پروردگار -''

(صفحہ ۱۳۴) ''نامراد کیا منگتا ھے مراد -''

(صفحہ ۱۳۵) ''مست ھتی ، پادشاہ ھور باگ ، یو تینو ایک جنس کی آگ -''

(صفحہ ۱۳۷) ''رام جیسا صاحب آئے تو ھنونت جیسا نفر پیدا ھوئے -''

(صفحہ ۱۳۸) ''ھونا ہے تقدیر کا کرنا ، ولے مرد تدبیر نا بسرنا۔''

(صفحہ ۱۴۱) ''سنے میں شیطان کیوں یاد آوے رحمان۔''

(صفحہ ۱۴۲) ''برا وقت کیا پوچھ کر آتا''

(صفحہ ۱۴۴) ''جیتا تیز ھوئی سوئی نوکتا شمشیر کے برابر ھوئی۔''

(صفحہ ۱۶۲) ''اگر دام اچھے یک وصا تو عیب ہے تو قدر قضا۔''

(صفحہ ۱۴۷) ''نوے سو نوے قدیم سو قدیم۔''

(صفحہ ۱۴۷) ''اپنے سو اپنے پرائے سو پرائے ، پرایاں کوں اپنیاں میں کیوں کر لیایا جائے۔''

(صفحہ ۱۶۲) ''لہوار کا کھیل جو آگ سوں ہے تو پکاوے وقت جلتا ہی ہے۔''

(صفحہ ۱۶۴) ''جسے نٹ نہیں اسے بھیٹ نہیں۔''

(صفحہ ۱۶۴) ''جو پارا آگ پر رھیا وو قائم النار۔''

(صفحہ ۱۶۴) ''حباب ناؤ کہ ھلنا چلنا ، اس حباب پر اپنا کیا اچھلنا''

(صفحہ ۱۸۴) ''مہر سو ما باپ کی باقی مہرس پاپ کی۔''

(صفحہ ۱۹۰) ''جتنا قاعدہ اتنا فایدہ۔''

(صفحہ ۲۲۷) ''کھارا ہے تو میٹھے کا پایا جاتا سواد۔''

(صفحہ ۲۴۱) ''خدا کے عالم میں سب کچھ بھریا ہے ، سو کا ہے ھریا ہے ، جدھر دیکھیں اودھر دریا ہے۔''

(صفحہ ۲۹۳) ''یو عبادت چار سجدے کرنا خلق کوں دکھلانا ہے ، خدا ھور رسول کوں پھسلانا ہے۔''

(صفحہ ۱۳۹) ''دنیا دو دیس کی کچھ دینا لینا ح کام آویگا''

(صفحہ ۱۴۴) دولت کوئی ماں کے پیٹ میں تے نیں لیاتا۔''

(صفحہ ۱۴۸) خوب عورت خوب کھانا خوب لہوا خوب گھوڑا ، پر سب کسے میسر ہے تھوڑا تھوڑا۔''

(صفحہ ۶۴) ''کہانی کہی ساری رات آخر و ھیچہ بات ۔''

(صفحہ ۱۳۰) ''رھیا سوانگن ، (مستقبل) ھوا کا ڈیرا ، جو کچھ
دون لیا سو تیرا ۔''

(صفحہ ۱۴۵) ''دسرا اگر دشمن ھوا تو سہل ہے ولے اپنا دشمن
اپی ھونا بہوت جہل ہے ۔''

(صفحہ ۱۴۱) ''یو بات ہے ، جیون لوکاں آتے ھیں تیون چل جاتے
ھیں ، جیسا یہاں کرتے ھیں ویسا وھاں پاتے ھیں ۔''

(صفحہ ۱۲۹) ''کوبیاں کو سلک دے (منہ لگایا) تو موں
چاٹنے آتے ۔''

(صفحہ ۱۲۹) ''ایسے ہی میٹھے نا ھونا جو مکھیاں نوڑ نوڑ کھاوین ۔''

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب مقولے مصنف ھی کے ھیں ؛ ممکن ہے کہ بعض ان میں دوسروں کے ھوں اور مصنف کا حصہ ان میں محض مترجم یا ناول کا ھو، مثلاً ''یو بات ہے ، جیون لوکاں آتے ھیں تیون چل جاتے ھیں'' الخ زیادہ تر ھمیں عربی ضرب الامثال کی یاد دلاتا ہے؛ تاھم ان میں اکثر ایسے ھیں جن کی کسی معلوم ماخذ تک سراغ رسانی نہیں کی جا سکی اور معمولی طور پر مصنف ھی کی طرف منسوب ھونے چاھئیں ۔ بہر حال کتاب ایسے اقوال و امثال سے بھری پڑی ہے ۔

ذیل میں بعض فقرے اصل کتاب سے نقل کیے جاتے ھیں جن سے ناظرین ھمارے مصنف کے شگفتہ انداز بیان اور سنجیدہ خیال آرائی کا کسی قدر اندازہ لگا سکتے ھیں :

اپنے اور پرائے

''جسے توں کچھ محبت سوں دیا ، اسے توں اپنا کیا ۔ مشہور ہے کہ جدھر ھنڈی ڈوئی اودھر سب کوئی ؛ جسے توں اپنا کیا ووچہ تیرا ۔ ھر کسی کوں نکو جان کہ یو وقت پر ہے میرا ۔ عاقل آنگیتچ جانتا ،

نادان پچھیں تے پچھانتا ۔ اپنیاں کوں اپنے کرنا ، اپنیاں تے مال دریغ نا دھرنا ۔ اپنے سو اپنے پرائے سو پرائے ؛ پرایاں کوں اپنیاں میں کیوں لیایا جائے ۔ اپنیاں میں بہوت تواضع بہوت تعظیم ۔ نوے سو نوے قدیم سو قدیم ، کہیچ ہیں کہ اول خویش بعد از درویش ۔ اتال سب خوب دستے ولے سن رے جیوا ، گھر کوں دیوا تو مسجد کوں دیوا ۔ یو وو قصہ کہ :

چـار بـلائے چـودہ آئے سـنـیـو گـھر کی ریـت
بـھار کے آکـر کـھـا گـئے گـھر کے گائیں گیـت

آشنا کوں جانا ، بیگانے کوں پچھانا ۔ دنیا میں اپنایت خوب ہے ، اپنایت غایت خوب ہے ۔'' (صفحہ ۱۴۷)

ترکش بندی

''پادشاہاں تیر ترکس کماں لھوا سر اپنے سنگات لے کر مستعد ہو کر ، سب کوں دلاسا دے کر ، مہابت سوں ، صلابت سوں جیوں ترکش بندی کا قاعدہ ہے ، جس باب میں ترکش بنداں کوں فایدہ ہے ، خوب نمائش سوں ، خوب آرائش سوں بہار آنا ، بہار آئے تو غافل نا ہونا ہشیار آنا ۔ اپنی مردی کا سنگار اپے دیکھنا ، اپنے لشکر کوں دکھلانا ، دسریاں کو دیکھ امس (حوصلہ) آوے ، ترکش بندی کا ہوش آوے ، ترکس بند ترکس بندی کرے ، ترجوت اچھے وہ بھی حوت دھرے ، ترکس بندی کا عالم تولیچہ ہیں کہ الناس علی دین ملوکہم پادشاہاں ، بڑے ترکس بنداں ۔ ترکس بنداں کوں اینو باٹ دکھلانا ، اینو ترکش بندی پر لیانا ، اینو دینا پنداں تو ترکس بند کا دل قوت پکڑتا ہے تو ترکس بند لڑتا ہے ، ہمت یاری دیتی ہے آگ میں پڑتا ہے ۔ جسو پادشا ہانچ یو روس چھوڑے ، تو کدھر تے ترکس بندی کریں گے نکوڑے ۔'' (صفحہ ۱۴۹)

سو تیاڈاہ

''سوکن نا سووے نا سوے دنوے ، سوکن جیو پراٹھے سوکن جیو لیوے ، سوکن ے محبت میں فتوا اٹھے ، سوکن تے جڑیا دل تٹے ،

سوکن آئی دو کھ سے سینہ پھٹیا ، سوکن آئی محبت کا سواد اٹھیا ، دایم جھگڑنیاں ، جوں بلبلاں لڑنیاں ، ادھر تے سالے اودھر تے سالیاں ، چاروں طرف تے برسیاں گالیاں ، کوئی کوا گرتی کوئی بائیں ، گھر میں کھیلتیاں چائیں مائیں ، یو گھر میں سکھ سوں نہیں سوتا ، میاے میاں لوگاں کا ھنسا ھونا جو دیکھے نو کل کل ، عورت تے زیاست ساس کی جھل ۔ سالا دشمن سالی دشمن ، بجر کا اس بچارے کا من ، کسے کسے سمجاوے ، کس کس کے نغادیاں تے بھار آوے ، بیٹا بیٹی اپنیاں ماواں خاطر جدا لڑتے ، یو جدا بلملیے ، یو جدا چر پھڑے ، بزار ھوتے باپ کے اسم سوں ۔ یو بی دشمن ھو بیٹھتے ایک قسم سوں ، دل سب ھوبا بھنگ ، سعدی کتا ھے کہ:

بلائے سفر بہ کہ در خانہ جنگ
تہی پائے رفتن بہ از کفش تنگ

(صفحہ ۲۵۳)

ہزیمت خوردہ پادشاہ اور اس کی بربادی

''ھر کوئی نہاٹ[1] کر پادشاھاں پاس آتا ، پادشاہ نہاس کر کدر جاتا ، یک وقت ٹوٹیا نو جوڑتا کون ، پادشاہ نہاٹیا تو چھوڑتا کون ، غنیم لگن کیا کام جاتے ، اپنیچ لوگاں نو دشمن ھو آتے ، لوٹتے ننگاتے ، ھزاراں ھزار بلایاں لاتے ، اول اپنے لوگانچ تے ڈرنا ، پچھیں دشمن کی فکر کرنا ، کون پادشاہ مال دھن سوں نہاٹ کر سلامت گیا ، جیوں نکلیا تھا تیوں امانت گیا ، البتہ ننگاے ھیں ، یا مفلس ھوکر گیا یا پکڑ لیائے ھیں ۔ پادشاھاں کوں جتی خوشی اتناچ دکھ بھی ھے ، جتا نیک اتناچ بد بھی ھے ۔ پادشاہ تو لگیچ جو لشکر گھوڑے ھتی ھے ، سب نہاٹے پچھیں کیا پادشاھاں کی عزت رھتی ھے ، مالی جیتا جپتا ھے ، ولے جھاڑ پیڑ تے اکھڑے پچھیں کیا پنپتا ھے ، شیشہ پھوٹے پچھیں جڑتا نہیں ،

[1] ۔ 'نھٹنا' یا 'نسنا' بہ معنی بھاگنا پنجابی میں عام ھے ۔ یہاں دونوں صورتوں میں ثانی حرف علت کے ساتھ (''اردو'' کے عام قاعدے کے مطابق) موجود ھے (مرتب)

پر کٹ ہوئے پچھیں جناور اڑتا نہیں ۔ یو بات دانش کا معما اس بات کوں فامتا کون ، آسمان ٹٹ پڑیا بجھیں تھاما کون ۔ حوض کی پال ٹوٹے تو یکایک باندھی جاتی ہے ، ولایت گئے پچھیں بھی ہات آتی ہے ؟ جیوں کمان کا تیر جوں بولے سو بات ، یو دونو گئے تو مشکل ہے پھر آنا ہات ۔“
(صفحہ ۱۵۰)

ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق

”جن نے جو کچھ پایا سو ہمت ہور تدبیر سوں پایا ، دولت کوئی ماں کے پیٹ میں تے نہیں لیایا ، بڑا ہوئے منگتا ہے تو بڑے لوگاں کوں پیدا کر ، بڑے لوگاں تے کیا ہویگا کھرے لوگاں کوں پیدا کر ، بڑے لوگاں کی بڑی فکر بڑی دھاتوں ، بڑے لوگاں کی عمل اس حد لگن دوڑتی جاں لگ خدا کا ناتوں ۔ نھنے لوگاں کے ہات تے کیوں ہووے گا بڑا کام ، یوں عمل پادشاہ یو کھرے ہنر ہے فام ، سب روشن ہے تمام ، یو بولاں لوگاں رکھے ہیں چن حن ، سکلائی ہد دھلیز تلک گھرگھٹ کی دوڑ باڑی لگن ، بگولا ہرار پر دھرے گا ، تو کیا بہری کا کام کریگا ۔ جیتا تیز ہوئی سوئی تو کیا شمشیر کے برابر ہوئی ۔ بلی کوں باگ کا کس نے گا ، لانڈگا چیتے کے جھانب بھاے گا ۔ کھلگا ہتی کے کام ساریگا ، سیاہ گوس شرزے کے اپھالے مارے گا ؟ بڑے آدمی کوں بڑا کام فرمانا ، نھنے آدمی کا کام گھر میں آنا جانا ، بھرے لانا لیجانا ۔“ (صفحہ ۱۴۴)

’سب رس‘ اگرچہ اردو نثر کی پہلی کتاب ہے مگر وجہی کے دست و قلم نے اس میں وہ جوہر پیدا کر دیے ہیں کہ یہ خورد سال دوسری زبانوں کی کہنہ سال معیاری کتابوں سے برابری کا دعویٰ کرتی ہے ۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس تالیف کو اردو زبان کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ’مقامات بدیعی‘ کو عربی کے ساتھ اور ’مقامات حمیدی‘ کو فارسی کے ساتھ ہے ۔ اور ہمیں حیرت اس امر پر ہوتی ہے کہ جس شہرت کا یہ ادبی شاہکار مستحق تھا وہ اب تک اس کو نصیب نہیں ہوئی ۔ حقیقت ہمیں اس کے محترم اڈیٹر مولانا عبدالحق کا ممنون احسان

ہونا چاہیے کہ انھوں نے مسیحائی کر کے اس کارنامے کو از سر نو زندہ کر دیا ۔

اورنگ آباد کو اردو کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے ؛ شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا پہلا ورق ولی اورنگ آبادی کی تحریک سے کھلتا ہے ۔ محمد شاہ کے عہد سے لے کر اب تک اس کا نام ہماری ادبی روایات میں گونج رہا ہے ۔ ادھر اردو زبان کی قدیم تاریخ و ادبیات پر تحقیقات کی تحریک بھی اورنگ آباد ہی سے شروع ہوتی ہے ۔ اس تحریک کے موجد و محرک مولانا عبدالحق ہیں ۔ اس تحریک کو شروع ہوئے اگرچہ دس سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا مگر اس نے اردو زبان کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ چناں چہ سب رس بھی اسی سلسلۂ انقلاب کی ایک کڑی ہے ۔

مثنوی یوسف زلیخا از شیخ محمد امین

زیر نظر سطور دراصل ایک گزشتہ مضمون ''گوجری یا۔
گجراتی اردو دسویں صدی ھجری میں'' کا حصہ تھیں ۔
لیکن اس عنوان کے تحت ان کا موجود رھنا کھٹکتا تھا ،
کیوں کہ امین کی 'یوسف زلیخا' دسویں کجا
گیارھویں چھوڑ بارھویں صدی ھجری کی ابتدا میں
لکھی جاتی ھے ۔ اسی سبب سے میں نے اسے علیحدہ
عنوان دے دیا ھے ۔ (مرتب)

. . . .

خوب محمد چشتی کے بعد تقریباً ایک صدی تک گجرات میں کوئی شاعر نظر نہیں آتا جو نہایت حیرت خیز ھے ۔ یہ امر ناقابل یقین ھے کہ گجراتی شعرا کا یہ دبستان جس کو سولھویں صدی عیسوی میں ھم رونق پر دیکھتے ھیں ، آنے والی صدی میں یک لخت ناپید ھو جائے ۔ گجرات پر ان ایام میں جو انقلاب آتا ھے وہ جلال الدین اکبر کی فتح گجرات کا واقعہ ھے جو ۹۸۰ھ میں پیش آتا ھے ۔ اکبر بعض امرائے گجرات کی طلب پر گجرات آتا ھے اور اھل گجرات بغیر کسی قابل ذکر مقابلے کے اطاعت کر لیتے ھیں اور صوبے کا الحاق مغلیہ سلطنت کے ساتھ ھو جاتا ھے ۔ جدید نظم و نسق کے اثر سے اس میں شک نہیں کہ عام رجحان فارسی زبان کی طرف پھیر دیا ھوگا ، لیکن یہ خیال کرنا قریب قریب ناممکن ھے کہ اس سیاسی تبدیلی نے گوجری ادب و تالیف کے سلسلے کو یک قلم ختم کر دیا ۔ ایسی مقبول تحریکات یکا یک مفقود نہیں ھو جایا کرتیں ۔ اس لیے ھم کہیں گے کہ اگر چہ اس

صدی کے مصنفین اور ان کی تالیفات ابھی تک معرض گمنامی میں ھیں ، تا ہم ہمارا خیال ھے کہ یہ ادبی سرگرمیاں برابر جاری رھی ھیں ۔

یہاں ہم اس قیاس کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ھیں کہ اس صدی میں دکنی مصنفین کا دبستان بہت کچھ ترقی حاصل کر چکا ھے اور یہ بہت ممکن ھے کہ گوجری دبستان دکنی دبستان کے ذیل میں شمار ہونے لگا ھے ۔ دکن کی سلطنتیں بالخصوص عادل شاھی اور قطب شاھی خاندان اردو نوازی کے لیے مشہور ھیں اور یہ امر گجراتی اھل قلم کے لیے نقل مکان کر کے دکن میں جانے کے لیے محرک ھو سکتا ھے[1] ۔ اب گوجری اور دکنی زبانیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ھیں کہ بسا اوقات ان میں امتیاز کرنا مشکل ھو جاتا ھے ۔ نیز گوجری نے بہ حیثیت زبان کے دکنی پر بہت اثر ڈالا ھے ۔ اکثر محاورے ، الفاظ اور ترکیبیں جو اصلاً گجراتی تھیں ، دکنی میں عام رواج پا گئیں ۔ ان صورت حالات میں کوئی تعجب نہیں اگر گوجری زبان کو دکنی مان لیا گیا ھو اور گجراتی مصنف دکنی شمار کر لیے گئے ھوں ۔ کم از کم یہ التباس ہمارے عہد میں تو ضرور موجود ھے ۔ تمثیلاً میں مذکورالصدر خوب محمد چشتی کا نام پیش کرتا ھوں ؛ اب یہ بزرگ گجرات کے باشندے ھیں اور تمام عمر احمد آباد میں رھے ۔ باوجودیکہ وہ اپنی زبان کو 'بولی گجرات' کہتے ھیں با ایں ھمہ انھیں دکنی مصنف کہا گیا ھے ۔ مثلاً پروفیسر بلومہارٹ انڈیا آفس کی 'فہرست ھندوستانی مخطوطات' (طبع ۱۹۲۶ء) میں ان کی تصنیف 'خوب ترنگ' کو جو 'امواج خوبی' کے ساتھ ھے ، 'فقہ اسلامیہ پر صوفیانہ کتاب بہ زبان اردوی دکنی'[2] بیان کرتے ھیں ۔ یہی بیان پروفیسر موصوف نے صفحہ نمبر ۲ پر بہ ذیل نمبر ۲ دھرایا ھے ۔

اسی سلسلے میں شیخ محمد امین کا نام بھی لیا جا سکتا ھے جس کو تمام مصنفین دکنی تسلیم کرتے ھیں ۔ اسپرنگر صفحہ ۶۰۱ فہرست کتب خانۂ اودھ میں محمد امین کی مثنوی یوسف زلیخا کو 'دکنی نظم' میں بیان

۱ ۔ دیکھئے مضمون ''گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ھجری میں'' (مرتب)

۲ ۔ فہرست ھندوستانی مخطوطات صفحہ ۱ ، نمبر ۱ ۔

کرتے ھیں - علیٰ ھذا حکیم شمس اللہ صاحب قادری 'اردوے قدیم'[1] میں اور نصیرالدین صاحب ہاشمی 'دکن میں اردو'[2] میں اسے 'دکنی منظوم' مانتے ھیں -

دکنی ادبیات و زبان نے ہمارے تخیل پر اس قدر زبردست غلبہ پا لیا ھے کہ غیر دکنی مصنفین کو بھی دکنی تسلیم کر لیا گیا ھے اور ھمیں مجبوراً کہنا پڑتا ھے کہ دکن کی شہرت نے گجرات کے کئی کارناموں کو اس سے چھین لیا ھے اور ایک گجراتی یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ھے ع :

طالع شہرت رسوائی مجنوں بیش است
ورنہ طشت من و او ھر دو ز یک بام افتاد

امین کو گجراتی ماننے کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ھے کہ مصنف خود اپنی زبان کو گوجری بیان کرتا ھے - چنانچہ ابیات ذیل ملاحظہ ھوں جو 'یوسف زلیخا' کی سبب تالیف کے سلسلے میں شاعر نے لکھے ھیں :

سنو مطلب اھے اب یو امین کا
لکھی گجری میے یوسف زلیخا

ھریک جاگے ھے قصہ فارسی میں
امیں اس کوں اتاری گوجری میں

کہ بوجھے ھر کدام اس کی حقیقہ
بڑی ھے گوجری جگ بیچ نعمہ

اس کے علاوہ کتاب میں ایسے الفاظ موجود ھیں جو خصوصیت کے ساتھ گجرات سے تعلق رکھتے ھیں - مثلاً 'سپنا' بجائے چھپنا ، 'آگل' بجائے آگے، 'کام' بجائے گانو اور 'ٹھام' بجائے ٹھانو گجراتی لہجہ ھے - اسی طرح 'انے' عاطفہ اور 'پوہٹ' بہ معنی طوطی گجراتی الاصل ھے -

۱ - 'اردوے قدیم تاج نمبر' صفحہ ۸۸ -
۲ - 'دکن میں اردو' صفحہ ۵۳ -

محمد امین کے حالات زندگی سے ہم بالکل ناواقف ہیں ، صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ 'یوسف زلیخا' کا مصنف ہے ۔ یہ مثنوی دو شنبے کے دن جمادی الاول کی دوسری تاریخ کو ۱۱۰۹ھ میں بہ عہد اورنگ زیب عالمگیر ختم ہوتی ہے ۔ چنانچہ :

زمانا شاہ اورنگ زیب کے میں
لکھی یوسف زلیخا کو امیں نیں
الٰہی سوں ایسا عادل شہنشاہ
رکھیں قائم رہے جب لک مہر ماہ

اگیارہ سو اوپر جب نو سو گزرے
برس ہجرت محمد مصطفیٰ کے
اہی تاریخ دوجی وے دل افروز
جمادی الاول اسوار کے روز
ضحیٰ کے وقت لکھ رہیا امیں رے
الٰہی نوں محب سب کنیں وے

(از خاتمۂ یوسف و زلیخا)

یہ مثنوی ایک بڑی کتاب ہے جس میں چار ہزار ایک سو چودہ ابیات ہیں :

بتیاں ہیں چار ہزاراں اوپر ایک سو
دے کر چاردہ بیت گھری سنو [کذا]

شاعر نے دیباچے میں حمد و نعت ، خلفائے اربعہ ، حسنین و بانیان مذاہب اربعہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے ذکر کے بعد ایک علاحدہ عنوان کے نیچے معراج کا بیان دیا ہے ۔ اس کے بعد عشق حقیقی پر رائے زنی کی ہے ۔ زاں بعد تعریف سخن پر ایک فصل ہے ۔ اس کے پیچھے اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس کی تمہید میں شاعر کہتا ہے کہ یوسف و زلیخا کا قصہ فارسی زبان میں بہت عام ہے لیکن میں اس کو گوجری زبان میں منتقل کرتا ہوں تا کہ عوام الناس اس قصے سے

واقف ۱ ہو جائیں ۔ شاعر نے مثنوی کے خاتمے پر بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے :

الٰہی توں مجھے توفیق جو دی | تو میں نے فارسی کی گوجری کی
مرا مطلب ہے یوں سب کوئی جانے | حقیقہ اس کی سب کوئی پچھانے
پڑا ہووے جو کوئی فارسی کوں | وہی جانے حقیقہ ای سو دلموں
انے جو نا پڑا ہووے بچارا | سو کیا بوجھے انوں کا عشق سارا
امیں اس واسطے کسی سو گجری | حقیقہ سب عیاں ہووے انوں کی
کہ عشق اول انوں نے کیوں نپایا | اے آخر اسے کیوں کر نبھایا

فارسی زبان میں یوسف و زلیخا کے قصے کو مختلف شعراء نے نظم کیا ہے ۔ ان میں زیادہ مشہور تین مثنویاں ہیں ؛ پہلی وہ جو فردوسی کی طرف منسوب ہے ، دوسری کے مالک مولانا عبدالرحمان جامی ہیں اور تیسری ناظم ہروی کے قلم سے نکلی ہے ۔ امین کی مثنوی بہ لحاظ روایت و ترتیب مولانا جامی کی مثنوی پر مبنی ہے ۔ قصے کے اہم خط و خال وہی ہیں جو جامی کے ہاں مروی ہیں ؛ سرخیاں قریب قریب وہی ہیں ، لیکن جزویات و حشویات میں مختلف ہے ۔ اس مثنوی میں جامی کی رنگینئی ادا اور مکلف طرز بیان کو سلاست اور سادگی میں بدل دیا گیا ہے اور ایسی خصوصیات کو بروئے کار لایا گیا ہے جو ہندوستانی زندگی اور اس عہد کے مسلمانی رسم و رواج پر روشنی ڈالتی ہیں ۔ مثلاً امین نے زلیخا کے لباس اور زیور کے ذکر میں ، جو بالتفصیل دیا گیا ہے ، اس زمانے کے اعلیٰ خاندانوں کی خواتین کی پوشاک اور زیور و دیگر اسباب آرائش کی ایک صحیح تصویر کینھچ دی ہے ۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :

زلیخا کا سنو تم اب سو سنگار | کہتا ہیگا امیں اب ہو کر ہشیار
زلیخا کے دھے ایسے بال سر میں | نہ آوے مشک ان آ گل نظر میں
انوں کے رنگ آ گل مشک ہے کم | نہ عنبر ان اگے مارے کچھو دم

۱ ۔ دیکھو اشعار بالا ۔

جڑاو کار تھا سیس[1] پھول سر پر
جڑے تھے بہوت اسکوں در گوھر
پشانی دیکھ چندن جای بھولا
دھرا اس کے اوپر ٹیکا امولا
ٹیکے کے ننگ روشن بوت جھلکیں
انے موتی عجائب بوت چلکیں
انکھوں آ گل خجل مارے ھرن تھے
کجل سرمہ سوں پر اسکے نین تھے
ناسک کوں دیکھکر ہو بٹ خجل ھیں
سپے ھیں اڑدے مارے جا جنگل میں
عجب پھبتی تھی بیسر ناک بھیتر
جڑے تھے ننگ اسکوں تازہ و تر
تھے گالوں کے اگل گل یاسمین کم
بتیسی کے اگل شرمندہ شبنم
اتھے کن پھول[3] کانوں بچھ عجائب
جو دیکھے سو جگت سوں ھووے تائب

انوں اوپر عجب پھول بالیاں تھیاں
نزاکت کیاں انوں بچھ جالیاں تھیاں
ادھر دو لال تھے جو رنگ مرجاں
تھے ان میں دانت جوں موتی کی لڑیاں

تھا حقہ موتیکا یا مکھ اتھا او
نہ تھا کچھ دکھ سراسر سکھ اتھا او
بتیسی جگ میں اس کی بیمثل تھی
زلیخا کی تھی ٹھوڑی سیب جیسی
لگایا تھا مکھ اوپر رنگ غازہ
بھواں اوپر تھا وسمہ تر و تازہ
کماناں بھوں پلک تیراں چلاتی
لگاتی تیر اسے جسکوں وے چاتی
لٹاں مکھڑے کے اوپر مثل ناگن
جوں گنج اوپر سرپ ہے مانڈتا پھن
موھن مالا انے کنٹھ مالا گل میں
انے چنپے کی کلیاں اس نلے ھیں
سینے اوپر بہوت بھجتا چندن ھار
بھی اس کی دگدگی کی جوت بسیار
لگا تھا زر کمر[4] اوپر کمر کے
جڑے لعل و گہر اس کئی ھنر کے
کمر کوں دیکھ چیتے گئے سوبن میں
کیا افسوس بوت ان اپنے من میں
بھی باز و بند بازو پر براجیں
انوں کے ریشمیں پھندے سوچھا جیں
جڑاؤں کا سو چوڑا ھاتھ میں تھا
جہانگیریاں[5] نے پوچیاں ان سوں زیبا

۱- جھومر۔ ۲- نتھ۔ ۳- کرن پھول۔ ۴- کمر کا زیور۔
۵- ایک قسم کے کڑے۔

انگوٹھیاں آرسیاں تھیاں انگلیوں میں | جڑے تھے ان کے بچھ بہتر نگینیں
جڑاؤ کی گجریاں پاؤں میں تھیاں | بہوت کچھ جوب بھی ان گجریاں ماں

اتھی پازیب گجری تل سہاتی | وو سارے لعل اور مرجان کھاتی
انگھوٹھوں بیچھ انوٹ[1] بے بہا تھے | انے پھر بیچھوے ان سوں صفا تھے
ز مہدی ھاتھ پگ راتے[2] کیے تھے | پرم سوں نین مد ماتے کیے تھے
تھی زر کی اوڑھنی کئی لاکھ کا مول | نہ آوے اوڑنی کے اور کچھ تول

تلک سب زر کے تاروں سے بنی تھی | اسے کئیں کئیں نزاکت سوں چنی تھی

تلک اوپر تھے ٹانکے بند زر کے | نہ زر کے بلک تھے در گھر کے
کناری زر کی در دامن لگائی | مشک عنبر عطر خوشبو بھرائی
پہنی زربفت کی سروال بھاری | اتھی بے مثل جگ بھیتروے ناری
اتھے کسبے سو جوتے پاؤ بھیتر | لٹاں مونیاں کیاں ٹانکیاں انو پر
زرینا اس کے تن پر تھا سو پورا | نہ تھا کس ھی جگے کچھ بھی ادھورا

نہ تھی کچھ کھوٹ واں کسوب میں ذرا | جو کچھ چاتی سو اس کے تھا مہیا

تخت زر کا اسی کارن بچھا تھا | ز لعل و گوھر و در سب جڑا تھا
چھھتر سر کے اوپر زر کا دھرا تھا | ز زر گوھر زمرد پر کیا تھا
ھمیشہ تخت پر آرام کرتی | جڑاؤں کا چتر سر پر سو دھرتی

اسی طرح شادی کے موقع پر شاعر نے دعوت کا ذکر اھتمام کے ساتھ کیا ھے اور کھانوں کی پوری پوری تفصیل دی ھے۔ اس بیان سے معلوم ھوتا ھے کہ کھانے سے پیشتر مہمانوں کو قند اور مصری کا شربت جس میں مشک و عنبر پڑا ھوا تھا ، پلایا جاتا تھا ۔ چناں چہ امین گویا ھے :

۱۔ پاؤں کے انگوٹھے کا گھنگرو دار چھلا ۔
۲۔ راتا = سرخ ۔ پنجابی میں 'رتا' موجود ھے ۔ (مرتب)

سنے روپے کی قابوں بیچھ کھانے کیتے معمور اور مجلس میں آنے
اول شربتہ سو قند مصریوں کے پیالے بھر پلائے زینتوں کے
انوں کے بیچھ مشک عنبر بھرے تھے ولے کئیں نزاکت سوں کرے تھے

اس کے بعد کھانے لائے جاتے ہیں جو ذیل میں مذکور ہیں :

حکم یوسف کے سے دوڑے بورچی کری تدبیر انوں سب نعمتوں کی
جو کچھ یوسف کہا تھا اس سے سو چند کرے طیار انوں نے مصریاں قند
مٹھائی سب جنس کی کیتی موجود جلابی[1] اولڈو [او] پیڑۂ دود
شکر پارے نے موصوف اور بتاسے انے مرکیاں الاچی دانہ خاصے
کپوری ریوڑی اور هشمی تر گھیور کھاجے نے ترسولے معطر
فرش شکر میں اور لوزان[2] بنائے بھی حلوے ترستی قاباں بھرائے
جریس[3] حلوے انے حلوائے مغزی[4] بھی حلوا پشک[5]اور حلوای سونی[6]
طبق صابونیوں[7] سیتی بھرے تھے گندوڑوں سیتی وو بھر کر دھرے تھے
مربے سب جنس کے لیائے بھی واں اچاراں قسم سب منگوائے بھی تاں
سموسے کوفتے کاجے تلے تھے کباب شامی اور سیخاں بنے تھے
پولاؤ مرغ اور پولاؤ ماھی پلاؤ رشتہ[8] لائق پادشاھی
پلاؤ نرگس اور پلاؤ یخنی مطعفر [کذا] خشکہ اور دم پخت فرنی

۱- جلیبی - ۲- لوزینہ - ۳- جریش -
۴- سفید رنگ کا حلوی جس میں بادام اور پستہ بہت ڈالا جاتا ہے اور ٹکیاں بنائی جاتی ہیں - ۵- حلوے کی ایک قسم -
۶- حلوای سوھان یعنی سوھن حلوی -
۷- بادام ، شہد اور روغن کنجد سے تیار کیا جاتا ہے -
۸- کذا ، شلہ جسے نا واقف شولہ بھی کہتے ہیں -

مشمن زیریاں عاشق کھیر ملایاں سیویاں شکرانے شیر
کلیجے اور حلوانوں کے قلیے بھی لاوے مرغیوں اور تیتروں کے
قاچی نان اور نان خطائی بھی باقر خانی اور بے حد مٹھائی
زبان گاؤ پنجہ کش بجے ناں بھی ٹاہو روغنی آبی سوں پر خواں
چپاتی پھیکیاں مانڈے نے جونکی انوں سیتی بہت قاباں بھری تھی
کہاں سب کا بیاں کہنے میں آوے امیں عاجز سوں کچھ کہیا نجاوے

ان کھانوں میں مٹھائیاں ، حلوے ، گوشت اور روٹیاں وغیرہ موجود ھیں ؛ لیکن تعجب یہ ھے کہ دعوت مٹھائی سے شروع ھوتی ھے جو ھمارے عہد کے رواج کے بالکل برعکس ھے ۔

محمد امین کی مثنوی میں ایک اور خصوصیت یہ ھے کہ اس کے تمام عنوان یا داستانوں کی تمہید ساقی نامے کے اشعار سے شروع ھوتی ھے جن میں بعض وقت نصیحت کا رنگ بھی اختیار کر لیا گیا ھے ۔ میں یہاں اس کے ساقی نامے کے ابیات کی ایک دو مثالیں تحریر کرتا ھوں :

ارے ساقی لیادے جام جمشید کہ جس کی جوت اگل شرمای خورشید
ارے ساقی وے شیشا توں لیارے کہ جس آگل خجل ھوویں ستارے
ارے ساقی لیادے نقل کا خوان کہ جس آگل خجل ھووے پونم جان
ارے ساقی پلادے مطربج (؟) ھاں کہ جس آگل چھپے حوران غلماں
خدا کی قدرتوں پر دل لگاؤ اسی کے کھیل سب نظروں میں لیاؤ
دیکھو دنیا کتیں تم بھر کہ[۱] نظراں کیسی باڑی بنائی آپ رحماں
ہزاراں جنس کے جھاڑاں لگائے لکھاں لکھ رنگ کے پھولاں کھلائے
لگائے گل میں پھل ھر بھانت کیرے دیکھو صنعت سو ڈال اور پانت کیرے
ایسی باڑی بنا کر آپ مالی ھوا ھے حق تعالیٰ لا اوبالی
(یوسف زلیخا ورق ب ۵۲)

۱- کذا ، بھر کے ۔

قدح توں لیا اے ساقی زرنگارا
بھر اس میں مے کہ جوں روشن ستارا
اول تیرے لبوں اوپر وے دھر جام
امیں کوں کر پچھوں دے جام انعام
امیں لیوے پیالا سر چڑا کر
کوے تعظیم تیری سر نما کر
پیالا پی کے شادی دل میں لاوے
نکل کر درد غم سب دل سوں جاوے
نہ آوے اور کچھ اللہ بن یاد
رہے در ذکر رب مشغول دلشاد
زمانے کا نہیں یک بھانت پر دور
کدھی کچھ اور ہے کدھوں کچھو اور
کدھیں عاقل کوں کھیلا[۱] کر بٹھاوے
کدھیں کھیلے کوں عاقل کر دکھاوے
کدھیں ھستے کتیں غمگین کرے او
کدھیں غمگین کے دل شادی بھرے او
کدھیں اوجر کرے بستی مندر کوں
کدھیں بستا کرے ویرانہ گھر کوں

شاعری کے نقطۂ نظر سے اگرچہ حشو و زوائد کثرت سے پائے جاتے ہیں اور بھرتی کے اشعار بہت ملتے ہیں ، تاہم محمد امین کے ہاں زبان بہت صاف ہوگئی ہے اور غالباً یہ پہلی مثنوی ہے جو اس قدر سہل اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے - ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے جنھیں موجودہ اردو خواں نہیں سمجھ سکتے اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بارھویں صدی کی ابتدائی مثنویوں میں امین کی 'یوسف زلیخا' ایک نہایت کامیاب اور بارآور کوشش تسلیم کی جا سکتی ہے -

۱ - کھیلا - بیوقوف و پاگل - راجستھانی میں اس کی شکل 'گیہلو' ہے ، سندھی میں یہی لفظ 'گہلو' کی صورت میں ملتا ہے - (مرتب)

رسالہ 'تاج' کا اردوے قدیم نمبر

(از اورینٹل کالج میگزین ، بابت مئی ۱۹۲۸ء)

رسالہ 'تاج' حیدر آباد کا ایک علمی ادبی رسالہ ہے۔ ملک کا ادبی طبقہ عام طور پر اس سے روشناس نہیں لیکن اس نے اپنا اردوے قدیم نمبر شائع کر کے اردو علم و ادب کی دنیا میں اپنے آپ کو نمایاں امتیاز کے ساتھ متعارف کرایا ہے؛ اردو زبان کے بارے میں تاریخی و لسانی تحقیقات و تدقیقات کا مذاق رکھنے والی نگاہوں کے لیے دل چسپی کا غیرمعمولی سامان فراہم کر دیا ہے۔

اس نمبر کا دو مستقل تالیفوں پر اطلاق ہوتا ہے جس میں پہلی تالیف حکیم سید شمس الدین صاحب قادری ماہرعلوم آثار قدیمہ (حیدر آباد) کی کاوش دماغی کی رہین منت ہے۔ اس میں دکنی اردو اور اس کی نظم و نثر کی مفصل تاریخ ، اس کی عہد بہ عہد ترقیوں کا تذکرہ اور ابتدائی زمانے سے لے کر عہد اورنگ زیب کے آخر تک کے شعراء اور مصنفین کے صحیح حالات تحریر ہیں۔

اردو تذکرہ نویسی سے جن اہل ذوق کو ذرا بھی دل چسپی ہے ، وہ اس الم ناک حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہمارے ہاں کے تذکرہ نویسوں نے اس فن لطیف کے ساتھ کس درجہ لاآبالیانہ اور بے پروایانہ سلوک روا رکھا ہے۔ تلاش کے باوجود ہمیں کوئی ایسی مثال نظر نہیں آتی جسے مستثنیات کی فہرست میں باریابی نصیب ہو سکے۔ ہمارے ہاں کے تذکرہ نویس ذاتی تلاش و تفحص ، تحقیق و تدقیق اور استدلال و درایت سے گریز کرنے کے عادی اور اگلے مؤلفوں کی

افسانہ طرازیوں کی نقل کرنے کے مشتاق نظر آتے ھیں ۔ شروع سے لے کر آخر تک مکھی پہ مکھی مارتے چلے جاتے ھیں اور خود اپنی نگاہ تحقیق کو مطلقاً تکلیف نہیں دیتے ۔ سن و تاریخ ، ماہ و سال اور حالات و واقعات کی صحت اور اسباب صحت جو فن تذکرہ نویسی کے امتیازی و اساسی اصول ھیں ، ان کی تحقیقات عالیہ کے دوران میں ایک سرے سے مردود توجہ ٹھہرتے ھیں ۔ ان کے ھاں روایت کا شوق عام اور درایت کی سعی فضول سمجھی گئی ہے ۔ نظر برایں حالات جب ھم اس تالیف کا مطالعہ کرتے ھیں تو ھمیں بے اختیار حکیم صاحب موصوف کی محنت و کاوش کی داد دینی پڑتی ہے ۔

حکیم صاحب کو اس تالیف کی تیاری میں عربی ، فارسی ، انگریزی اردو ، فرنچ اور جرمن کی متعدد کتابوں کی ورق گردانی کرنے اور ان میں سے اپنے مفید مطلب امور کے اخذ و انتخاب اور رد و قبول میں جو دقت پیش آئی ھوگی ، وہ اھل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ یقیناً ان کی محنت و کوشش کا نتیجہ ایک نہایت شان دار اور قابل قدر علمی حیثیت کا حامل اور اردو زبان میں اس موضوع پر اپنی طرز کی مستند و مؤقر مثال ہے ؛ بالخصوص اردو کے قدیم دکنی شعراء کے سلسلے میں (جن میں سے ھم بیسیوں کے نام اور حالات و واقعات سے بے خبر اور سراسر تاریکی میں تھے) حکیم صاحب موصوف کی سعی بلیغ بہ ھر لحاظ لائق تشکر ہے ۔ اور اس اعتبار سے حکیم صاحب نے اردو پر جو احسان عظیم کیا ہے ، اس کے بار سے اردو علم و ادب کبھی سبک دوش نہیں ھوسکتا ۔ اس اھم موضوع پر اس تالیف میں پانچ مستقل ابواب نظر آتے ھیں ، جن میں حکیم صاحب نے مفصلاً داد تحقیق دی ہے ۔ حق یہ ہے کہ اگر اس کتاب میں صرف یہی ابواب ھوتے تو بھی وہ اس قدر ، قدر و منزلت کی مستحق ھوتی ، کیونکہ 'دکھنی اردو' کی نا معلوم حالت پر جو روشنی اس سے پڑتی ہے ، وہ بالکل نئی اور اچھوتی ہے ۔

ھمارا خیال ہے کہ اردوے قدیم کے بارے میں اس قدر جامع و مانع اور مفصل و مبسوط معلومات کسی کتاب اور تذکرے میں ایک جگہ

جمع نہیں ملیں گی ۔ اور حکیم صاحب کی یہ کتاب آنے والے تذکرہ نویسوں کی بہترین کوششوں کا مخزن و ماخذ بن جائے گی اور ایک ایسا کارنامہ قرار دی جائے گی جسے ہر دور اور ہر عہد میں بہ نگاہ استحسان دیکھا جائے گا ۔

حکیم صاحب نے اپنی اس تالیف کا انتساب مولانا مولوی عبد الحق صاحب آنریری سیکریٹری انجمن ترقی اردو کے نام سے کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی عام خدمت کے علاوہ اردوے قدیم کی خدمت کے معاملے میں بھی کوئی شخص مولوی صاحب موصوف سے زیادہ قابل خطاب و مستحق انتساب نہیں ہو سکتا ۔

حکیم صاحب کی اس گراں پایہ تالیف کے بعد دکن کے مشہور و معروف بزرگ حضرت بندگی مخدوم ابو الفتح سید محمد حسینی گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ موسم بہ 'معراج العاشقین' نظر افروز ہوتا ہے ، جو تقریباً نویں صدی ہجری کے آغاز کی دکنی اردو میں تصنیف ہوا ہے ۔ یہ رسالہ جناب مولوی عبد الحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو کی تصحیح و تحشیہ و ترتیب سے شائع کیا گیا ہے ۔ شروع میں مولوی صاحب موصوف نے حضرت گیسو دراز کے اکثر حالات و واقعات بیان کیے ہیں اور زیر نظر تالیف سے متعلق بعض امور پر بحث بھی کی ہے ، نیز آخر میں بعض اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی فرہنگ بھی دے دی ہے ۔ یہ رسالہ 'تاج' کا دوسرا قابل قدر کارنامہ ہے جس سے ہم اس عہد کی دکنی اردو کے باب میں بہت کچھ مفید اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کر سکتے ہیں ۔

آخر میں ہم 'تاج' کے مدیر جناب غلام محمد انصاری وفا کو داد دیتے ہیں جن کی کوششوں نے رسالے کے 'اردوے قدیم نمبر' کو ہماری بہتر سے بہتر توجہات کا مستحق بنا دیا ۔

اردو شہ پارے (جلد اول)

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

(از اورینٹل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۳۰ء)

گزشتہ چند سالوں سے قدیم اردو اور اس کی ادبیات کے متعلق ہندوستان میں تحقیقات کا شوق روز افزوں ترقی کر رہا ہے جس سے ہمارے ذخیرۂ معلومات میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اگر تحقیق و تلاش کی یہی رفتار جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب اردو کی فراموش شدہ تاریخ مجدداً دنیا کے سامنے آ جائے۔ اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہو چکا ہے اس سے ہمارے کئی پرانے نظریے منسوخ ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ نئے نظریے قائم کیے گئے ہیں، جن کے معتبر و مستند ہونے میں کسی احتمال کی گنجائش نہیں۔ اس خصوص میں دکن نے ہندوستان کے کئی دیگر صوبوں کے مقابلے میں بڑا کام کیا ہے اور حقیقت میں قدیم اردو کی تحقیقات کی تمام تر تحریک دکن کے ساتھ وابستہ ہے۔ اردو کے ان پرستاروں میں سب سے پیش پیش مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو ہیں، جو فی الواقع اس جدید تحریک کے پیشوا اور امام ہیں۔ ان کے مفید اور عالمانہ مضامین نے جو وقتاً فوقتاً رسالہ 'اردو' اورنگ آباد میں شائع ہوتے رہے ہیں، اردو کی تاریخ میں انقلابی کام کیا ہے۔ ان کے بعد حکیم شمس اللہ صاحب قادری ہیں جن کی مختصر مگر جامع معلومات تصنیف 'اردوئ قدیم' تاریخ اردو میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ آغا حیدر حسن دہلوی پروفیسر نظام کالج حیدر آباد مصنف 'پس پردہ' کا

مذکور بھی اس خصوص میں ضروری ہے ۔ موصوف نے اپنے متفرق مضامین سے دکنی مصنفین کے حالات و تصنیفات پر جدید روشنی ڈالی ہے ۔ دوسرا بڑا کام مولوی عبدالحق کی طرح آپ نے یہ کیا ہے کہ قدیم دکنی مصنفین کے مخطوطات کا ایک گراں قدر ذخیرہ بڑی سعی و تلاش سے جمع کیا ہے ۔

اس فہرست میں نیا اضافہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل سید محی الدین قادری ایم ۔ اے کے نام سے ہوتا ہے ، جو سال گزشتہ لندن سے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری لے کر واپس ہندوستان آئے ہیں ۔ انھوں نے حال ہی میں قدیم اردو ادبیات سے متعلق متفرق تاریخی و ادبی مواد کو ایک تالیف 'اردو شہ پارے' جلد اول کی شکل میں بہ سلسلۂ مطبوعات مکتبۂ ابراھیمیہ مرتب کیا ہے ۔

'اردو شہ پارے' حیدرآباد کی طباعت کی ایک نفیس مثال ہے ۔ کاغذ و کتابت کی اعلیٰ پائیگی کے علاوہ اہل مطبع نے اس کو دیدہ زیب و دل پسند بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے ۔ ادھر جناب مرتب نے کتاب کی ترتیب میں محنت اور سلیقے سے کام لیا ہے اور کئی امور میں اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے ۔ مثلاً آغاز میں ایک مختصر سی عام فہرست پر قناعت کی گئی ہے ، جو ابواب مندرجۂ کتاب کی حامل ہے ۔ مضامین ابواب کی فہرستیں کتاب کے اندر ہر باب کے شروع میں دی گئی ہیں ۔ کتاب کے آخر میں آٹھ ضمیمے ، فہرست سنین و واقعات ، فرھنگ الفاظ اور اشاریہ درج ہیں ۔ باوجودیکہ فہرستیں اس کتاب کا ایک وقیع جزو ہیں تاہم ناظرین کتاب کے لیے عام مطالب کتاب پر آسانی سے رسائی حاصل کر لینا مشکل ہے ۔ شاعر کا ذکر کہیں ہے ، نمونۂ کلام کہیں ہے ۔ اور اگر اتفاق سے وہ نثر نگار بھی واقع ہوا ہے تو اس کی نثر کسی اور مقام پر ہے ، اور نہ تمام نمونۂ کلام ایک جگہ درج ہے بلکہ مختلف مقامات پر ہے ۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ تفصیلی فہرست کا آغاز کتاب میں درج نہ ہونا ایک افسوس ناک فروگزاشت ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ اردو کے لسانی اور صوتی پہلوؤں پر کام کرنے کے لیے انھیں لندن ، آکسفورڈ ، کیمبرج ، پیرس اور ایڈنبرا کے کتب خانوں کی سیر کرنی پڑی ۔ ان کتب خانوں میں قدیم اردو کی کتابیں بھی نظر سے گزریں ؛ تب انھیں خیال آیا کہ اس تمام ادبی ذخیرے کے بہترین حصوں کا انتخاب جمع کر لیا جائے تا کہ اردو دانوں کی خدمت میں پیش کیا جا سکے (صفحہ ۱) ۔ جب گزشتہ سال تعطیلات میں ہندوستان آئے تو سارے انتخابات ان کے ساتھ تھے ۔ حیدر آباد آنے پر اس میں صرف چند اضافے کیے گئے (صفحہ ۲) ۔ شعراء اور ان کی کتابوں کے متعلق جو کچھ حالات لکھے گئے ہیں ، وہ خود ڈاکٹر صاحب کی ذاتی تحقیق و تفتیش اور اعلیٰ ماخذوں کے مطالعے کا نتیجہ ہیں اور کہا ہے کہ اس بات کی حتّی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ سنی‌سنائی اور غیر مستند تحریروں پر بھروسہ نہ کیا جائے (تمہید) ۔ یہ بیانات اگر صحیح ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر زور نے ایک بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے ۔ اب ہم اصل کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہیں ۔

''اردو ادب شمالی ہند میں'' اس عنوان کے تحت میں ڈاکٹر صاحب نے جو اُمور بیان کیے ہیں ، ہمیں ان سے اختلاف ہے ۔ لکھتے ہیں :

''یہ در حقیقت ایک حوصلہ فرسا بات ہے کہ ان ممالک میں جہاں اردو نے جنم لیا ، اس کو عرصۂ دراز تک معمولی ملکی زبان سے زیادہ درجہ نہیں دیا گیا ؛ بلکہ اس کے برخلاف گیارھویں صدی ھجری کے آخر تک کیا علماء اور کیا امراء دونوں اس سے بیزار رہے اور اس دوران میں یہ کہنا مناسب (کذا) نہ ہوگا کہ وہ کبھی ادبیات میں استعمال نہیں کی گئی ۔'' (صفحہ ۹)

اگر سرود اور شعر ادبیات کے ذیل میں شمار ہو سکتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمالی ہند میں گجرات و دکن سے بہت پیشتر ملکی زبان میں شعر گوئی شروع ہو جاتی ہے ۔ ابھی مسلمانوں کو دھلی میں آباد ہوئے تیس چالیس سال گزرے ہوں گے کہ ان میں

ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو ہندی شاعری ، موسیقی اور نغمات میں دل چسپی لینے لگے ۔ صوفی حلقوں میں عربی قول اور فارسی غزل کے ساتھ ہندی سرود شامل کر لیا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں شیخ احمد نہروانی کا نام قابل ذکر ہے ۔ یہ ذات کے جولاہے اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب شاہ کبیر سے دو صدی پیشتر گزرے ہیں ۔ 'اخبار الاخیار' میں ان کو قاضی حمید الدین ناگوری کا مرید بتایا گیا ہے اور 'مخزن الاصفیا' میں ان کا سال وفات ۶۶۱ھ دیا ہے ۔ لیکن ان کے متعلق صحیح بیانات وہ ہیں جو شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے ملفوظات میں دیے ہیں ؛ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد نہروانی بڑے خوش آواز تھے اور 'ہندوی' کہنے کا ان کو بڑا شوق تھا ۔ ایک روز شیخ مادھو نے جن سے موصوف نے فیض پایا تھا ، شیخ احمد کو ہندوی سرود گاتے سنا ، کہنے لگے ''افسوس ہے کہ ایسی عمدہ آواز کو سرود ہندی میں ضائع کیا جاتا ہے ، کلام مجید کیوں نہیں سیکھتے ؟'' شیخ احمد نے تعمیل کی اور کلام مجید سیکھ لیا ۔ میں یہاں اصل عبارت نقل کر دیتا ہوں :

''چنیں گویند کہ او نعمت از فقیر مادھو یافتہ بود و ایں فقیر مادھو امام مسجد جامع اجمیر بود ۔ روزی شیخ احمد نہروانی ہندوی می گفت ؛ در اوان جوانی آواز خوب داشت ، ہندویہا خوش گفتے ۔ چون فقیر مادھو شنید گفت چنیں آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندی خرج کنی ۔ فقیر مادھو فرمود کہ قران یاد کن ۔ شیخ احمد نہروانی قرآن یاد گرفت ۔''

(صفحہ ۱۸۷ ، فوائد الفواد ، فخر المطابع ۱۲۷۲ھ)

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں ہندی سرود گوئی اس عہد میں رائج تھی ۔ شیخ احمد نہروانی کا مزار بدایوں میں ہے اور وہ اس مجلس سماع میں شریک تھے ، جس میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۶۳۳ھ) انتقال کرتے ہیں ۔

۱؎ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (متوفی ۶۶۴ھ) ہندی میں شعر گوئی کرتے رہے ہیں ۔ ذیل کا دوہا شیخ بہاؤ الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ)

نے اپنی تصنیف میں ان کے نام پر دیا ہے :

سائیں سیوت گل (گہل) گئی ماس نہ رھیا دیہہ
تب لگ سائیں سیوساں جب لگ ھوسوں کہیہ

ادھر شیخ شرف الدین بو علی قلندر کے حالات میں 'مجمع الاولیاء' میں مذکور ہے کہ انھوں نے یہ دوھرہ شیخ نظام الدین اولیاء کے دوھرے کے جواب میں لکھا ہے :

ساھرے نہ مانیوں پیو کے نہیں تھانو
کنہہ نہ بوجھی بات روی دھنی سہاگن نانو

اور مبارز خان کو یہ دوھا لکھا تھا :

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدی نہ ھوے

ان کے معاصر شیخ نظام الدین اولیاء نے خود دوھرے کہے ھیں۔ ھندی موسیقی سے ان کو اُلفت تھی اور پوربی سے تو گویا عشق تھا۔ کتاب چشتیہ (صفحہ ۶۷، ب) میں لکھا ہے : ''سلطان الاولیاء را پردۂ پوربی بغایت خوش آمدے ... می فرمودند کہ ما پیر شدیم و پوربی پیر نشد۔''

ان ایام میں ایک خاص صنف سخن جس کا نام جکری (ذکری) تھا، بہت رائج تھی اور ھمیشہ ھندی میں لکھی جاتی تھی۔ شیخ نظام الدین اولیاء کو ایک مرتبہ جکری پر حال آیا تھا جس کے متعلق صاحب سیرالاولیاء لکھتے ھیں :

''قوال۔ جکری از مولانا وجیہ الدین بصوتے مرق می گفت و غالب ظن من آنست کہ ایں جکری بود (بینا بن بہاجی ایسا سکھ سیں باسوں) حضرت سلطان المشائخ را ایں ھندوی اثر کرد۔'' (صفحہ ۵۱۲)

خواجہ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے متعلق زور صاحب کا خیال ہے کہ ''وہ اس زبان میں شعر نہیں کہتے تھے جس کو عام طور پر ھندو اور مسلمان بولتے تھے'' (صفحہ ۹) اور ھم سوچ رہے ھیں

کہ آخر یہ بزرگ جو زبان بولتے تھے ، اگر اس زبان میں شعر گوئی نہیں کرتے تھے تو پھر کون سی زبان میں کرتے تھے ؟ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک خسرو کے کلام کی زبان مشتبہ ہے ۔ اسی طرح خسرو کے مروجہ اشعار بھی ان کے نزدیک مشتبہ ہیں ؛ بلکہ غیرمعتبر (صفحہ ۱۰) لیکن شکر ہے کہ ڈاکٹر زور اپنی اس رائے میں تنہا ہیں ۔ ابھی تک کسی نے امیر خسرو کے کلام کے متعلق شبہ نہیں کیا تھا ۔ میر تقی میر نے غالباً اسی موقع کے لیے لکھا تھا :

''اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد دریں خود ترددے نیست ۔''
(صفحہ ۲ ، نکات الشعراء)

میر صاحب کو تردد نہیں ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس معاملے میں کیوں تردد ہے ۔ خود امیر خسرو دیباچہ غرۃالکمال میں لکھ رہے ہیں ''جزوے چند ہندوی لیز نثر دوستان کردہ شدہ است'' ہمارے خیال میں امیر کا ایسا کلام جو فارسی اور ہندی مصرعوں پر شامل ہے اور شہر آشوب سے تعلق رکھتا ہے ، ہر قسم کے اشتباہ سے پاک ہے ۔ مثلاً :

زرگر پسرے چو ماہ پارا   کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست   پھر کچھ نہ گھڑا نہ سنوارا

یہی قطعہ 'نکات الشعرا' میں نیز 'مخزن نکات' میں دیا گیا ہے ۔ میر حسن نے امیر کی غزل کا یہ مطلع دیا ہے :

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم ایجاں نلیہو کاہے لگائے چھتیاں
(صفحہ ۹۲ ، تذکرۂ میر حسن)

اسی غزل کے دو شعر شفیق اورنگ آبادی نے اپنے تذکرے میں صفحہ ۵۳۸ پر دیے ہیں ۔ یہ تذکرہ ۱۱۷۳ھ میں لکھا جاتا ہے ۔ اور یہی پوری غزل ایک ایسی بیاض میں موجود ہے جو ۹ سنہ جلوس

عہد شاہی میں لکھی جاتی ہے ۔ بیاض کے مرتب کا نام پرتاب سنگھ[1] ہے جو موضع راھوں ضلع جالندھر پنجاب کا باشندہ ہے ۔ اب جو چیز اب سے دو سو سال پیشتر قریب قریب ایک ہی وقت میں پنجاب ، دھلی اور دکن جیسے مختلف مقامات میں امیر کی طرف منسوب کی جا رہی ہے تو ظاھر ہے کہ یہ انتساب کسی نہ کسی پائدار بنیاد پر قائم ہے[2] ۔

عبدالواسع ھانسوی اپنے دستور العمل میں خسرو کا یہ شعر نقل کرتے ہیں :

از چل چل تو کار من زار شد کچل
من خود نمی چلم تو اگر می چلی بچل

(صفحہ ۱۴ ، رسالہ عبدالواسع مسیح الزمان)

وجہ الدین وجہی خسرو کا ایک دوھرہ اپنی تصنیف 'سب رس' مؤلفہ ۱۰۴۵ھ میں حسب ذیل نقل کرتے ہیں :

پنکھا ھو کر میں ڈولے سانھے تیرے جاؤ
ڈولتے مجکوں جنم گیا تیرے لیکھیں باؤ

امیر خسرو پر کیا منحصر ہے ، شمالی ھند میں اور بزرگ بھی ایسے ہوئے ہیں جو امیر کے نقش قدم پر چلے ہیں ، مثلاً شیخ عبدالحق ردولوی متوفی ۸۳۷ھ اور شیخ پیارا متوفی ۸٦۵ھ جن کے بعض دوھرے شیخ عبدالقدوس گنگوھی کی تصنیفات میں موجود ہیں ۔ یہاں میں شیخ پیارا کے دوھروں پر قناعت کرتا ہوں :

۱۔ ایک اور جگہ بیاض کے مرتب کا نام رام پرتاب دیا گیا ہے ۔ دیکھیے مضمون 'دسویں صدی ھجری کے بعض جدید دریافت شدہ ریختے ۔' (مرتب)

۲۔ مزید تحقیق کے بعد حافظ صاحب کے نزدیک زیر بحث غزل کا امیر خسرو سے انتساب مشکوک ہوگیا تھا اور انھوں نے اس پر عروضی اعتبار سے سیر حاصل بحث کی تھی ۔ ملاحظہ فرمائیے ان کا مضمون 'دسویں صدی ھجری کے بعض جدید دریافت شدہ ریختے' (مرتب)

پہٹ بودے بہ جا توں دھک جیون تیرا
سائیں تہیں توں کی پہرا دیکھہ کتب گھنیرا

ایکو کام نہ آوسی جب پڑسی بیرا
چھوڑ پیارا سائیاں توں جانہن کیرا

(رشد نامہ)

میں بالفعل اسی مختصر پر کفایت کرتا ہوں اور اس قدر اضافہ کرتا ہوں کہ وہ گجراتی ہوں یا دکنی ، ہندی شعر گوئی کا چسکا شمالی ہندوستان ہی سے لے کر جاتے ہیں۔

گجرات کے دبستان اردو کے ذکر میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ''اس وقت گجرات کے اردو کارنامے بہت کم دست یاب ہوتے ہیں اور وہاں اردو کی نشو و نما اور ترقی کی نسبت ہماری معلومات بھی دوسرے مرکزوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے'' ,صفحہ ۱۱) ۔ ان کا یہ بیان بے شک صحیح ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں جو اطلاع ان کو ملی ، ڈاکٹر صاحب نے اس سے بھی اعراض کیا ہے ؛ مثلاً وہ لکھتے ہیں :

''راقم الحروف کو گجرات کی دو قدیم اور معتبر تاریخوں (یعنی مرأت سکندری مؤلفہ سکندر منجھو ۱۶۱۰ء اور مرأت احمدی مؤلفہ علی محمد خاں ۱۷۵۶ء) کے مخطوطوں میں چند ایسے اردو جملے اور فقرے ملے جو ۱۵۲۵ اور ۱۵۳۶ میں استعمال ہوتے تھے ۔ اس کا قوی امکان ہے کہ اگر کوئی زیادہ تفحص سے ان مخطوطوں کا مطالعہ کرے تو ایسے اور زیادہ فقرے دست یاب ہوں گے'' (صفحہ ۱۱)

اور حاشیے لکھا میں ہے ''ملاحظہ ہو مرات سکندری ورق ۱۵۲ الف ، انڈیا آفس فارسی مخطوطات'' اور ''۲۔ ایضاً مرات احمد ورق ۶۶۸ ب ، انڈیا آفس فارسی مخطوطات ۔''

کیا اچھا ہوتا اگر اس اطلاع کی بجائے ڈاکٹر صاحب وہ اردو فقرے نقل کر دیتے ۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے

ناظرین کو اس اطلاع سے کیوں محروم رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو اطلاع ہندوستان میں اس مضمون پر میسر تھی اس کو بھی استعمال نہیں کیا ۔

اردو زبان کے سلسلے میں امیر تیمور کا حملۂ ہند ۸۰۱ھ میں نہایت اھمیت رکھتا ہے ۔ اس سے اول تو گجرات کا صوبے دار دھلی کی اطاعت سے آزاد ھو کر خود مختار حکومت کی بنیاد رکھتا ہے ، دوسرے تیموری فوجوں کے خوف سے دھلی کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد گجرات میں جا کر آباد ھو جاتی ہے ۔ ان پناہ گزینوں میں بعض مشاھیر بھی شامل ھیں ؛ مثلاً شیخ احمد کھٹو ، برھان الدین قطب عالم اور مولانا خواجگی۔ دھلی سے بڑی تعداد میں مہاجرت ایک تاریخی واقعہ ہے ؛ چنانچہ تاریخ گجرات میں مرقوم ہے :

''ھم دریں اثنا خبر رسید کہ حضرت [صاحب] قران امیر تیمور کورگان در نواحی دھلی نزول اجلال فرمودند و فتور عظیم در آں دیار راہ یافت و خلق کثیر ازاں حادثہ گریختہ بہ گجرات آمد ۔ مقارن این حال سلطان ناصر الدین محمود شاہ از دھلی فرار نمودہ بہ گجرات رسید و از آنجا مایوس شدہ بہ مالوہ رفت ۔''
(صفحہ ۴۷ ، مرات احمدی ، جلد اول ، بمبئی)

۸۳۷ھ میں مولانا محمد بن قوام کڑئی نے فرہنگ بحرالفضائل تالیف کی ہے ؛ اس فرھنگ سے معلوم ھوتا ہے کہ گجرات میں ان ایام میں ہندی شاعری کا کافی چرچا تھا ۔ مولانا نے اپنی فرھنگ کے آخری باب میں صرف ایسے الفاظ کا ذکر کیا ہے جو ھندی نظم میں مستعمل تھے ۔ اس باب کا عنوان ہے :

''باب چہارم در بعض الفاظ ھندوی کہ در نظم ھندوی استعمال کنند''
(بحرالفضائل قلمی)

گجرات میں اردو شاعری کو رواج دینے والوں کے ناموں سے ھم ناواقف محض ھیں مگر شیخ بہاؤ الدین باجن کی تصنیف سے اس قدر معلوم ھوتا ہے کہ شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن خلف شیخ نصراللہ علوم موسیقی میں اپنے زمانے میں یگانہ تھے اور ان کے سرود ان

ایام میں بہت مشہور تھے ۔ ان کے زمانے کا اس امر سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ شیخ رکن الدین کان شکر متوفی ۸۴۲ھ کے مرید تھے اور شیخ عزیز اللہ متوکل کے بڑے بھائی کے فرزند ۔ شیخ باجن کہتے ہیں :

''و پسر شیخ نصر اللہ بندگی شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن کہ بندگی ایشان در علوم موسیقی و در جمیع علوم ہا دانش مند بودلد سرود ہاے ایشان در عالم خدا ظہور مشہور و مقبول اند ۔''

رتن ، ہم خیال کرتے ہیں شیخ عطاء اللہ کا تخلص تھا ۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ''گجرات کی اردو کے قدیم مخطوطے ہنوز محفوظ ہیں ؛ اگرچہ بالکل ادبی رنگ کے نہیں مگر ان سے ثابت ہوتا ہے کہ گجرات میں یہ زبان اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ اس کا مقصد استعمال یقیناً ادبی بھی ہوگا ۔'' (صفحہ ۱۲)

اس موقع پر ہم خیال کرتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے گجرات اور اہالی گجرات کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے ۔ گجرات میں دکن سے پہلے شاعری کا ذوق شروع ہوتا ہے ؛ دکنیوں سے پیشتر گجراتیوں میں تصنیفات کا سلسلہ شزوع ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک جنبش قلم سے یہ عزت ان سے یہ کہہ کر چھین لی ہے کہ ان کے کارنامے بالکل ادبی رنگ کے نہیں ہیں ۔ حالانکہ اسی صفحے پر ڈاکٹر کو اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ گجرات کے پناہ گزین ادیبوں نے ''دکن میں اردو ذوق بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے ۔''
(صفحہ ۱۲)

ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ پناہ گزین جب دکن پہنچ کر دکنیوں میں ادبی ذوق کی روح پھونک سکتے ہیں تو کیا اپنے وطن میں بیٹھ کر ایک تصنیف بھی ایسی پیدا نہیں کر سکتے جو ادبی ذوق کے معیار پر پوری اتر سکے ۔

میں ذیل میں بعض اشعار گجرات کے ایک صوفی شاعر شاہ علی محمد جیو گام دھنی متوفی ۹۷۳ھ کی تصنیف جواہر اسرار اللہ سے نقل کرتا ہوں

جس سے ناظرین خود فیصلہ کرلیں گے کہ آیا یہ اشعار ادبی پائے کے ہیں یا نہیں :

جس پھولوں سونگھن جانوں — تس باس تمھارا پانوں
کر ہار نکیوں گل لانوں — یہ کرنیں اور کلالاں
ہور کلیاں جے ات لالاں — سب دیویاں تیریاں بھالاں
یہ جوھی بھی نرمائی — ہور باس تمھارا لیائی
تو ھیڑے میں لے باھی — ان ھار حمیلوں سارے
سب کلیوں پھول پیارے — ھنس کرے سوتوں سھکارے
تجہ مالی جے ھوں پاؤں — لے جیوڑے مانہ چھپاؤں
میں نینوں نانہ دکھاؤں — توں گھر گھر شہ ھو آوے
ھور الیل کلیوں راوے — جگ تیرا سہاگ کھنداوے

ساوہ اٹھے یوں پیارن منجکوں بہیں کریکر آپس راؤں
کہیں سو نوشہ ھوکر آؤں کہیں سو آرس آپ کہاؤں
پگڑی باندہ قبا لٹکاؤں پھروں ھانس زرینہ سارا
سہرا ھار حمیلاں پھروں دل بادل ہوؤں اسورا
دھول دمامیں اونٹوں پر سات سبد سب باجت جاویں
سب جگ کیری خوشبوئی لوک سو بھر بھر لیاویں

چھوڑو لو کاچہ لڑائی کان کرو یہ پرم کہانیں
تمھوں تمھاری شیریں بھاوے منجکوں میری لیلیٰ سہانیں
جے تم لیلیٰ جویا لوڑو منجہ مجنوں کی نینوں دیکھو
تمھوں تمھاری شیریں جوڑو لیلیٰ کوں کیوں پیکھو

اس بستی کا کیا پتیارا — آج تمھوں کل دوجوں مارا
سو کیوں تسکوں دھرے پیارا

یہ جگ باندی اس جگ کیرے — جہاں نہ تمڑے کھیل سویرے
جانوں بات سہی کر میری

مورخ گجرات میرزا محمد حسن شاہ علی جیو کے دیوان کے متعلق یہ رائے دیتے ہیں :

''دیوانے دارد بہ زبان ہندوی در روش و معنی برابر دیوان مغربی است ۔'' (صفحہ ۱۴ ، مرات احمدی)

گجرات کے مصنفین میں زور صاحب نے تین شخصوں کا ذکر کیا ہے :

۱ ۔ بہاءالدین باجن ۲ ۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی

۳ ۔ شیخ خوب محمد چشتی

باجن کے کلام کو ڈاکٹر صاحب اردو تسلیم نہیں کرتے بلکہ 'بھاشا' بتاتے ہیں ، حالانکہ باجن اپنے کلام کو صریحاً کبھی ہندوی (اردو) اور کبھی زبان دھلوی کہہ رہے ہیں ۔ مثلاً کہتے ہیں :

''و ایں مناجات بہ زبان ہندوی گفتہ شدہ است''

ترے پنتھہ کوئی چل نہ سکھے	جو چلے سو چل چل تھکے
پڑہ پنڈت پوتھی دھویاں	سب جانہ سدہ بدہ کھویاں
سبہ جوگیوں جوگ بسارے	سبہ تپسی تپ بکارے
ایک درسنی درسن بھولی	سر نانگے پانوہ کھلی
ایک سیوڑی ھوی سیو کر نہ	ھوی برتیئی کیا دو کہہ دھرنہ
ایک درویش ھوی کر آئے	ھوی قلندر روپ بھرائے
ایک ابدال ھوی اب دھوتی	ایک ھاندہ ھا ھا ھوتی
ایک کہلی ھوئی دوانی	ایک بادل ھند رانی
ایک راتی ماتی ھوی ارراونہ	بھی بے سدہ ھو ھو جاونہ
ایک اپاسی راتنہ جاگن	ھوی بھکاری تجھہ مانگنہ
یوں ٹولی ٹولی ھوی کرے	سبہ رل رل کہل کہل کھوی کرے
دے مکت منے ایوے دیکھے	آرے باجن توں کس لیکھے

دنیا کی مذمت میں باجن نے کچھ ابیات لکھے ہیں ۔ اس موقع پر کہتے ہیں :

''صفت دنیا بزبان دھلوی گفتہ است''

دوھرہ

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے — جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

[پین اول] — اول آن چھل بہت چھلائے

آن چھوھری بہتی کھائے — آن رو کر بہت رولائے

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے — جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

[پین دوم]

آن بہت گھیرے پارے — جیسے اس ہلکے وے انہ چھارے

جے رہے اس تھے تارے — دے نجانے اس تھے ہارے

جے اس کار نہ تپنہ ترسنہ — جے چکہ ملے تو اس سنہ بلسنہ

یہ فتنی انہوں تپاوے — چکہ پاس انہوں نہ آوے

جے اس کدھی نہ لوڑیں — جے چکہ ملے تو بھی چھورنہ

جیے دیکھہ اس تھے بھاگے — یہ نیلج انہ سنہ لاگے

[تخلص]

دیکھہ باجن یہ تو جھوٹی — مکہ میٹھی چت نیٹھی

یہ اہے ایسی ڈیہٹی — یہ کیا کسے یہ ملتی ہے

(الخ)

اسی طرح ایک اور موقع پر باجن فرماتے ہیں :

''مناقب حضرت ایشاں بزبان دھلی نبشتہ است''

ان امور سے صاف ظاہر ہے کہ باجن کے نزدیک ہندوی یعنی اردو اور دھلوی ایک ہی چیز ہے ۔ بہر حال اس زبان کو بھاشا نہیں کہا جا سکتا ، وہ اردو ہے ۔ البتہ اس پر گجراتی زبان کا اثر غالب ہے ۔

شیخ باجن کا ذکر 'پنجاب میں اردو' میں بھی شامل ہے اور مختصر نمونۂ کلام بھی درج ہے ، لیکن ڈاکٹر محی الدین اس کے متعلق لکھتے ہیں : ''پنجاب میں اردو'' میں ان کے کلام کے جو نمونے دیے گئے ہیں وہ نہ تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہیں اور نہ ہی معتبر و موثق۔ باجن ایک زاھد مرتاض شخص تھے اور غالباً انھوں نے کوئی ادبی کارنامہ اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔'' (صفحہ ۱۳ - اردو شہ پارے)

ڈاکٹر صاحب کا یہ انداز تنقید قابل اعتراض ہے ۔ اگر وہ نمونے جو 'پنجاب میں اردو' میں دیے گئے ہیں ، ان کے نزدیک غیر معتبر ہیں تو انھیں چاھیے تھا کہ شیخ باجن کے کلام کے معتبر نمونوں سے اپنے ناظرین کو مستفید کرتے ۔ لطف یہ ہے کہ انھوں نے خود کوئی نمونہ نہیں دیا ہے اور اس نمونۂ کلام کو جو 'پنجاب میں اردو' میں دیا گیا ہے ، رد کر دیا ہے ۔ شیخ باجن قرن نہم ھجری کے دوسرے منتصف سے تعلق رکھتے ہیں اور ۹۱۲ھ میں وفات پاتے ہیں ۔ اب اس عہد کے شخص سے ادبی کارناموں کی توقع کرنا خیال محال ہے ۔ اردو زبان کی اس عہد میں یہ حالت نہیں تھی کہ داغ و امیر کی شیوہ بیانی کی چشم داشت کی جائے ۔ باجن اور اس کے ہم وطن دوسرے بزرگوں کی اھمیت صرف تاریخی دل چسپی کی بنا پر ہے اور اسی ذوق نے دبستان دکن کو ھماری نگاہ میں محبوب کر دیا ہے ورنہ آج کون ہے جو ولی کی غزلوں ، نصرتی کی مثنویوں اور ھاشم علی کے مرثیوں کو پڑھ کر سر دھننے لگے ۔ قصہ مختصر ان بزرگوں میں ھماری دل چسپی تاریخی اور لسانی ہے نہ ذوقی اور وجدانی ، اور ھمیں کہنا پڑتا ہے کہ گجراتیوں کے ساتھ سید صاحب کا سلوک نہایت نا منصفانہ ہے ۔

شاہ علی محمد کام دھنی اور شیخ خوب محمد سے اقدم ایک اور بزرگ قاضی محمود دریائی ہیں جن کی وفات ۹۴۱ھ میں ھوتی ہے ۔ ان کی جکریاں نہایت مشہور ہیں اور اسی سلسلے میں قاضی صاحب کو اس قدر شہرت حاصل ہے کہ گجرات کے علاوہ ھندوستان کے دیگر صوبوں میں بھی مقبول و معروف ہیں ۔ صاحب اخبار الاخیار کہتے ہیں :

''جکری ھائے وے کہ بزبان ھندوی دارد دستور قوالان آں دیار است بغایت مطبوع و موثر و بے تکلف و آثار عشق و وجد از سخنان وے لائح است ۔'' (صفحہ ۱۸۷ ، اخبار الاخیار ، ۱۲۷۰ھ احمدی)

مخدوم بہاء الدین ثانی برناوی اپنی کتاب چشتیہ تالیف ۱۰۶۶ھ میں لکھتے ھیں :

''کلام مقبول او بمثل جکری قاضی محمود ھر کہ می شنود بر ھمت او آفرین می ستود ۔'' (ورق ۹۴۴ ب)

اور صاحب مرات احمدی کا بیان ھے :

''از غلبات عشق پیوستہ بحسب حال عاشقانہ بہندی بطرز دلبندی می بست ۔'' (صفحہ ۸۰ جلد دوم)

خزینۃ الاصفیا میں مرقوم ھے :

''اشعار عاشمانہ بزبان ھندی فرمودے کہ قوالان آں دیار بوقت سماع اشعار آں جناب بہ مجلس اصفیا میخوانند و بغایت موثر میباشند ۔''
(صفحہ ۸۰ ، جلد دوم)

گجراتیوں نے اپنی اردو کا نام ھندی کے علاوہ گوجری یا گجری رکھا ھے ۔ یہ اصطلاح غالباً اس زبان کو گجراتی زبان سے ممیز کرنے کے لیے مصنوع ھوئی ھے ۔ جواھر اسرار اللہ کے دیباچے میں جو ۹۷۳ھ سے قبل کی تحریر ھے ، یہ اصطلاح موجود ھے اور ۱۱۰۹ھ میں بھی جب امین نے اپنی 'یوسف زلیخا' نظم کی ھے ، استعمال ھو رھی ھے ۔ دکنی اپنی زبان کو ابتدا میں ھندی کہتے رھے اور دسویں صدی ھجری کے پہلے منتصف میں ھندوستانی یا زبان ھندوستان کہنے لگے ۔ مثلاً ابوالقاسم فرشتہ :

''و بنوعے فارسی را خوب میگفت کہ تا بہندوستانی متکلم نمی شد ھیچ کس نمیتوانست فہمید کہ غیر از فارسی بزبان دیگر آشنائی دارد ۔''
(تاریخ فرشتہ ، جلد دوم ، صفحہ ۸۰ ، نولکشور)

اور 'سب رس' میں مولانا وجہ‌الدین رقم طراز ہیں :

''آغاز داستان زبان ہندوستان''

لیکن جہانگیر کے بعد شاہجہاں کے عہد میں جب دکنیوں اور ہندوستانیوں میں متواتر جنگیں ہوتی رہیں تو دکنی اور ہندوستانی کی تفریق نے قدرتاً دکنیوں کو اپنی زبان کے لیے ایک نیا لفظ یعنی 'دکھنی' سجھا دیا ۔ چنانچہ شیخ نصرتی اپنی زبان کو 'دکھنی' لکھ رہا ہے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محی‌الدین صاحب نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جس کو میں انہیں کے الفاظ میں لکھتا ہوں :

''اس عہد کی تواریخ دکن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات سے بہت سے ادیب اور عالم بیجاپور آیا کرتے تھے ۔ وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں کو اپنے دربار میں بلا لیا ۔ چنانچہ گجرات کے ان پناہ گزینوں نے دکن میں اردو کا ادبی ذوق بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجاپور کے بعض اردو مصنفین جیسے شاہ برہان ، اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ گجرات کے اثر سے دکن کی ادبی زبان بڑی حد تک بدل گئی ہو اور جو لوگ اس متبدلہ زبان میں لکھ رہے ہوں وہ اپنی زبان کو گجری کہنے لگے اور پرانی زبان دکنی کہلانے لگی ۔'' (صفحہ ۱۲)

دکن پر گجرات کا لسانی اثر ہم تسلیم کرتے ہیں ، لیکن اس خیال کے ساتھ کہ گجرات کے اثر سے جب دکنی زبان میں تغیر رونما ہوا تو اسی تغیر یافتہ زبان کا نام گجری رکھ دیا گیا ، ہم متفق نہیں ۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جو لوگ اپنی زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ یا تو گجراتی ہیں یا گجرات سے آ کر دکن میں آباد ہوگئے ہیں ۔ اگر شاہ برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ اصل میں گجراتی تھے ؛ یہ دوسری بات ہے کہ وہ یا ان کے والد بیجاپور میں آ کر مقیم ہو گئے ہوں ۔

اب ہم ان گجراتی پناہ گزینوں کے قصے کو لیتے ہیں جس کو سید صاحب نے ابراہیم عادل شاہ کے ذکر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

" ان دنوں گجرات ایک ایسا مقام تھا جہاں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے اچھی طرح ملتے جلتے رہتے تھے اور فی الحقیقت یہی وجہ اردو زبان کے ارتقا کا باعث ہوئی ۔ نیز گجرات میں مسلمان بادشاہوں کی طویل اور اطمینان کی حکومت نے مصنفین کو تالیف و تصنیف کا کافی موقع دیا ۔ چنانچہ اس زمانے میں خاصی ادبی پیداوار ہوئی جس کے چند نمونے یورپ کے بعض کتب خانوں میں دست یاب ہوتے ہیں ۔ لیکن اکبر کی فرستادہ مغل فوجوں کے حملوں نے گجرات میں اردو کی اس دن دونی اور رات چوگنی ترقی میں روڑے اٹکائے اور اس پر ہی کیا منحصر ہے ان حملوں نے تو سلطنت ہی کے شیرازے کو درہم برہم کردیا ۔ جب گجرات سے امن و امان رخصت ہوگیا اور شاہی دربار کا بھی خاتمہ ہوگیا تو شاعر اور ادیب بے سر و سامانی کی حالت میں ادھر آدھر مارے مارے پھرنے لگے ۔ ان میں سے جو اپنے وطن میں ٹھہرے ہوئے تھے ان کو مغلوں نے کئی طرح کی تکالیف پہنچائیں اور ان بے چاروں کو 'قہر درویش برجان درویش' کے مصداق طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا ۔ ایسے نازک موقع پر ابراہیم نے نہایت عقل مندی اور فیاضی کا کام کیا ؛ اس نے اپنے آدمیوں کو بیش بہا تحائف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا تاکہ وہاں کے علما اور شعرا کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دیں ۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہم گجرات کی عظمت کے پرچم کو بیجا پور پر لہراتا ہوا دیکھتے ہیں ۔ مشہور و معروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجا پور ہواگ آئے تھے اور ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہوگیا تھا کہ بعض دکھنی مصنف بھی اپنی گجراتی آمیز زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے ۔" (صفحہ ۳۵ ۔ اردو شہ پارے)

اس بیان سے ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھ لیں کہ اکبر کی مہم گجرات در حقیقت اردو کے خلاف جہاد تھا ، جس کی بنا پر اردو

شاعروں اور ادیبوں کو طرح طرح کی تکالیف پہنچائی گئیں اور اس کی فوجیں اردو کی ترقی میں روڑے اٹکاتی رہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس اہم بیان کے لیے کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا ہے؛ بہ حالت موجودہ ہم اس تنہا بیان پر مہر تصدیق لگانے سے انکار کرتے ہیں۔ گجراتی سلاطین کی طویل اور طمانیت کی حکومت کے زمانے میں جو ادبی کارنامے گجرات نے پیدا کیے اور جس کے چند نمونے ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے کتب خانوں میں ملاحظہ کیے ہیں، ہم کو ان کے متعلق کوئی علم نہیں اور نہ ڈاکٹر ہی نے ان کی کوئی تفصیل دی ہے اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن تاریخ گجرات کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین گجرات کے آخری دو جانشینوں کے عہد میں گجرات کی حالت نہایت ابتر رہی ہے۔ یہ زمانہ ۹۶۱ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۹۸۰ پر ختم ہوتا ہے، جب اکبر نے گجرات پر قبضہ کیا ہے۔ یہ دور گجرات کی تاریخ میں دور آشوب کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ بادشاہ طاقت ور امرا کے تسلط میں حوالاتی قیدی کی حیثیت رکھتا تھا اور امرا ایک دوسرے کی طاقت توڑنے اور اپنا اقتدار جمانے میں مصروف تھے۔ قتل و خون ریزی، فساد اور ہنگامے چار سو برپا تھے۔ ۹۸۰ھ میں اکبر وہاں کے امرا کی خواہش پر بغیر کسی جنگ و خون کے گجرات پر قابض ہوتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسی زمانۂ آشوب میں گجرات کے بعض نامی شاعر گزرے ہیں، یعنی شاہ علی جیو گام دھنی اور شیخ خوب محمد۔ موخر الذکر اپنی مثنوی 'خوب ترنگ' ۹۸۶ھ میں یعنی اکبر کے قبضۂ گجرات کے چھ سال بعد لکھتے ہیں۔ ان کی دوسری تصنیف 'چھند چھنداں' جو ہندی اور فارسی عروض اور تال ادھیا پر مشتمل ہے، عن قریب اسی عہد میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن سید صاحب ہم کو گجراتی ادیب و شاعر کی مغلوں کے ہاتھ سے ستم کشی کی بے بنیاد کہانی سنا رہے ہیں۔ یہاں ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر کا قلم تاریخی میدان سے گریز کرکے افسانہ نگاری کی حدود میں داخل ہوگیا ہے۔ وہ ان مظلوم ادیب و شعرا میں سے کسی ایک کا بھی نام نقل نہیں

کرتے ۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ اس نازک موقع پر ابراھیم عادل شاہ نے بڑا کام کیا ۔ وہ بیش بہا تحائف دے کر آدمی گجرات بھیجتا ہے اور وہاں کے ادیبوں کو دکن میں آنے کی دعوت دیتا ہے ؛ یہ دعوت منظور کر لی جاتی ہے اور گجراتی ادیبوں کا قافلہ بیجاپور پہنچ جاتا ہے ۔ چنانچہ بیجاپور کی بلندیوں پر گجرات کی عظمت علمی کا پرچم لہرانے لگتا ہے ۔ ان تارکین وطن میں بعض مشہور و معروف ہستیاں تھیں ۔ کاش ان مشاہیر میں سے ڈاکٹر صاحب بعض کے اسماء تو درج کر دیتے ۔ لیکن ایک امر جو ہم کو اس قصے پر ایمان لانے سے روکتا ہے ، یہ ہے کہ اکبر گجرات پر ۹۸۰ھ میں قابض ہوتا ہے اور ابراھیم عادل شاہ ، اس ادبی دعوت کا محرک ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے ۔ اس وقت اس کی عمر نو سال کی تھی ؛ آئندہ دس سال تک اس کو امور سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ ۹۹۸ھ میں البتہ وہ مطلق العنان ہوتا ہے ۔ اب ابراھیم کی طرف سے ۹۸۰ھ میں گجراتیوں کو دعوت ناممکن ہے ۔

یہاں ایک اور امر کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کی جاتی ہے ؛ سید محی الدین صاحب نے اپنے حوالوں کو جب کہ وہ مغربی مخطوطات سے تعلق رکھتے ہیں ، بیان کر دیا ہے ، لیکن جب انھوں نے اپنے پیش رؤوں کی تصنیفات اور تحقیقات سے استفادہ کیا ہے تو اس کا صراحتاً کہیں تذکرہ نہیں کیا ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ شعرا کے حالات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب ان کی ذاتی تحقیق و تلاش اور اصلی ماخذ کے مطالعے کا نتیجہ ہے ، لیکن اردو شہ پارے میں اس بیان کے خلاف کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے ۔ میں بعض مثالیں درج کرتا ہوں ۔

مولوی عبدالحق نے جولائی ۱۹۲۹ کے رسالۂ اردو میں قطب شاہی دور کے ایک شاعر حسن شوق پر ایک مضمون لکھا ہے جو صفحہ ۵۴۰ تا ۵۵۹ پر شامل ہے ؛ ڈاکٹر صاحب نے اس کا خلاصہ لے کر اپنی تصنیف میں صفحہ ۱۰۲ پر شامل کر لیا اور اصل ماخذ کا کہیں پتا نہیں دیا ۔ البتہ آخر میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے ”اس کے کلام کے مخطوطے انجمن ترقی اردو میں بھی محفوظ ہیں ۔“

ڈاکٹر نے عادل شاهی عہد کے ایک شاعر مومن کے متعلق بیان کیا ہے :

''مومن (۱۰۹۲ھ) سینا پٹن کا باشندہ تھا جو عادل شاهی سلطنت میں چھوٹا سا گاؤں تھا ۔ شاید یہ بیجاپور نہیں آیا ۔ اسلام کے مہدوی فرقے سے اس کا تعلق تھا اور اس نے اس فرقے کے بانی حضرت سید محمد جونپوری کی حیات اور تعلیمات پر ایک نظم لکھی ہے ۔ ۱۶۸۲ء میں ختم هوئی ۔ اس کا نام اسرار عشق رکھا گیا ۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے ۔'' (صفحہ ۷۵)

لیکن ان کے پیش رو حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اردوے قدیم میں تحریر کرتے هیں :

''مومن ۔ ان کا نام عبدالمومن ہے ۔ چینا پٹن کے باشندے تھے ۔ یہ شہر علاقہ میسور میں واقع ہے جو عالم گیر کی فتوحات سے پہلے عادل شاهی عمل داری میں شامل تھا ۔ مومن مہدوی مذهب کے پابند تھے ۔ انہوں نے اسرار عشق کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور اس میں اپنے هادی و پیشوا حضرت سید محمد صاحب جونپوری کے حالات و کرامات تحریر کیے هیں ۔ یہ کتاب نظم میں ہے اور ۱۰۹۳ھ میں تمام هوئی ۔ اس کا نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے ۔'' (صفحہ ۷۹)

ذیل میں ایک اور مثال عرض ہے ۔ قاضی محمود بحری کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری نے اس طرح لکھا ہے :

''بحری دکن کے ایک صوفی منش بزرگ تھے ۔ ان کا نام قاضی محمود ہے ۔ والد کا نام بحر الدین تھا اور وہ 'قاضی دریا' کے لقب سے مشہور تھے ۔ قصبہ گوگی جو نصرت آباد کے مضافات میں واقع ہے ، ان کا وطن تھا ۔ ۱۰۹۵ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے اور وهاں سکندر عادل شاہ ان کا معتقد هوگیا ۔ اس کے دربار میں سال دو سال مقیم رہے اور جب بیجاپور کی سلطنت ۱۰۹۷ھ میں تباہ هوگئی تو وهاں سے حیدرآباد چلے آئے ۔ . . . قاضی صاحب نے

تصوف میں ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام 'من لگن' ہے - یہ مثنوی اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس کی وفات سے سات سال پہلے ۱۱۱۲ھ میں تمام ہوئی - چنانچہ خاتمے میں اس کی تاریخ کا اس طرح ذکر آیا ہے:

ہجری تھے یہی کتک برس تھے بارا اوپر ایک سو سہس تھے

بعض مریدوں کی فرمائش سے قاضی صاحب نے 'من لگن' کے مضامین فارسی میں لکھے اور اس کا نام 'عروس عرفان' رکھا - یہ کتاب ۱۱۱٦ھ میں تمام ہوئی -" (صفحہ ۸٦ ، ۸۷ اردوے قدیم تاج نمبر)
ادھر محی الدین صاحب فرماتے ہیں :

"بحری - اس کا نام ، قاضی محمود تھا - بحرالدین کا بیٹا تھا جو گوگی کے 'قاضی دریا' کے نام سے مشہور تھے - گوگی سلطنت بیجا پور میں نصرت آباد کے قریب ایک گاؤں ہے - یہ وہاں کا قاضی اور ایک بڑے پایے کا صوفی تھا - ۱۰۹۵ھ میں، اپنے وطن کو خیرآباد (کذا) کہہ کر بیجا پور پہنچا ؛ سکندر عادل شاہ اس کا معتقد ہوگیا اور اسے اپنے دربار میں ایک جگہ بھی عطا کی -

۱۰۹۷ھ میں جب سلطنت فتح ہوگئی اور اورنگ زیب نے سکندر کو قید کرلیا تو بحری نے حیدرآباد کا راستہ لیا . . . اور اورنگ زیب کی وفات سے سات سال قبل یعنی ۱۱۱۱ھ میں اس نے ایک صوفیانہ مثنوی بعنوان 'من لگن' پیش کی - اس کے کچھ سال بعد یعنی ۱۱۱۵ھ میں اپنے مریدوں کی خواہش اور اصرار پر اس نے اس نظم کو فارسی زبان میں 'عرس عرفان' کے نام سے منتقل کیا -"

(صفحہ ۱۳۹ - اردو شہ پارے)

میں نے کچھ حصہ بہ خوف طوالت ان بیانات سے حذف کر دیا ہے جو دونوں میں مشترک تھا - ان بیانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اصل ہے اور ایک نقل مگر ظلم یہ ہے کہ ڈاکٹر نے کہیں بھول کر بھی اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا - صاحب اردوے قدیم اپنے حوالے دینے میں نہایت محتاط ہیں ، ڈاکٹر صاحب نقل کرنے

میں نہایت بے پروا واقع ہوئے ہیں ، جس کے آثار اس تالیف میں بہ کثرت ملتے ہیں ۔ مثالاً اسی بحری کے ذکر میں انھوں نے 'من لگن' کی تاریخ تصنیف ۱۱۱۱ھ دی ہے ۔ حکیم صاحب نے اصل شعر بھی نقل کر دیا ہے جس کی رو سے سال تالیف ۱۱۱۲ھ ہے ۔ حکیم صاحب نے بحری کی فارسی تالیف کا نام 'عروس عرفان' اور تاریخ ۱۱۱٦ھ دی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا نام 'عرسی عرفان' ، اور سال تالیف ۱۱۱۵ھ دیا ہے ۔

دوسرے لوگوں کی محنت اور کاوش دماغی سے فایدہ اٹھانا اور شکریہ درکنار استفادے کے اظہار تک، سے گریز کرنا ایک عجیب طریقہ ہے جو نہ مغربی کہا جا سکتا ہے اور نہ مشرقی ۔ شہ پارے ، کا مصنف سب سے زیادہ مولوی عبدالحق کے مضامین سے خوشہ چینی کر رہا ہے اور اس کے بعد 'اردوی قدیم' سے لیکی اس نے اپنی زلہ ربائی کا اقرار قسم کھانے کو بھی نہیں کیا ؛ البتہ اس نے اپنے پیش روؤں کی لغزش اور فروگذاشت کا ذکر ضرور کیا ہے ۔ مثلاً جنیدی کے ذکر میں اس کو شاہ عبداللہ کی سوانح عمری سے معلوم ہوا کہ اس عہد میں ایک شخص علی اکبر جنیدی موجود تھا ؛ ادھر 'اردوی قدیم' میں جنیدی مصنف 'ماہ پیکر' کا نام احمد بتایا گیا تھا ؛ ہمارے ڈاکٹر نے فیصلہ دے دیا کہ شاعر کا نام علی اکبر تھا ۔

اسی طرح حکیم شمس اللہ نے ولی دکنی سید محمد فیاض کی ایک مناجات کے متعلق کہا تھا کہ وہ بھی ولی کی ہے اور 'اردوے قدیم' میں اس کے تین بند بھی نقل کر دیے تھے (صفحہ ۹۱) لیکن ہمارے محتاط ڈاکٹر نے جب دیکھا کہ حکیم صاحب نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے ، اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یہ حکم لگایا :

"اردوے قدیم کے مصنف نے اس کا حوالہ دیا ہے لیکن اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی سند نہیں پیش کی ، اس لیے شبہ ہے کہ آیا وہ ہے بھی یا نہیں ، اور اگر ہے تو ولی کی ہے یا کسی اور شاعر کی ۔"

(صفحہ ۱۳٦)

یہ استدلال بالکل نا واجب ہے ۔ جب حکیم صاحب اس مناجات کے اشعار نقل کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ چیز ان کے پیش نظر ہے ۔ اس صورت میں یہ کہنا کہ اس کے متعلق شبہ ہے کہ آیا وہ مناجات موجود ہے یا نہیں ، یا یہ کہ اگر ہے تو ولی کی ہے یا کسی اور شاعر کی بالکل فضول ہے ۔

شعرا کے کلام کا انتخاب جو دیا گیا ہے ڈاکٹر کی خوش مذاق کا ایک بین ثبوت ہے ۔ بعض نمونے البتہ ایسے ہیں جو طبیعت پر گراں گزرتے ہیں ۔ لیکن اس معاملے میں انتخاب کنندہ ایک بڑی حد تک اپنے محدود ذرائع کی بنا پر مجبور ہے ۔ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' سے جو نمونے دیے ہیں ہمیں بے حد پسند آئے مگر رستمی کے 'خاور نامہ' کے اقتباس زیادہ کام یاب نہیں معلوم ہوتے ، اگرچہ ڈاکٹر اس کی شاعری کے زیادہ مداح ہیں ۔ مشرق نے 'نیہ درپن' میں جو دعوت کا نقشہ کھینچا ہے اردو کے مورخ اور فرہنگ نگار کے لیے بے حد دل چسپی کا سامان رکھتا ہے ۔

اڈنبرا یونیورسٹی کی بیاض مراثی سے جن شعرا کے انتخابات درج ہیں ، سید صاحب نے ان کا زمانہ ۱۱۵۰ھ فرض کر لیا ہے ۔ مگر ایسے حال میں جب کہ بیاض میں تاریخ کتابت درج نہیں ہے ۔ ان تمام شعرا کے متعلق جو ایک درجن سے زیادہ ہیں یہ تسلیم کرلینا کہ سب اسی زمانے میں گزرے ہیں نامناسب معلوم ہوتا ہے ۔ نمونۂ کلام پر نظر ڈالنے سے خیال گزرتا ہے کہ ان میں سے کئی بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور ہم کو کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر کاظم ، امامی ، نظر وغیرہ جیسا کہ ان کی زبان سے ہویدا ہے بارھویں صدی کے اختتام سے علاقہ رکھتے ہوں ۔

"هندوستانی"

هندوستانی اکیڈمی کا سہ ماہی رسالہ

(از اورینٹل کالج میگزین بابت مئی ۱۹۳۱)

مقام مسرت ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اپنا سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" جنوری ۱۹۳۱ء سے جاری کر دیا ہے - ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے جو مضامین ، ٹائپ اور چھپائی و کاغذ کے اعتبار سے نہایت اعلی اور دیدہ زیب ہے - اس کے قابل اڈیٹر شاعر مشہور جناب اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی ہیں جو دو تین سال پیشتر لاہور میں تشریف فرما تھے اور اردو مرکز کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے - ہم یہ معلوم کرکے خوش ہیں کہ اصغر صاحب اکیڈمی کے ہاتھ لگ گئے -

ہندوستانی کے اس نمبر میں اکثر مضمون نگار ایسے ہیں جو خوش قسمتی سے ہمارے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ممتاز عہدے رکھتے ہیں جس سے رسالے کے مضامین کی بلند پائیگی یقینی ہے - پہلا مضمون 'اردو املا' پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور نہایت خوب لکھا گیا ہے - ہم امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس مضمون کو برابر جاری رکھیں گے - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تعلقات پر رقم طراز ہیں - پروفیسر صاحب بڑے زبردست نظریہ باز ہیں اور بعض اوقات تو

اپنے نظریوں کی خاطر صریح واقعات تاریخ سے بھی چشم پوشی کرجاتے ہیں۔
تیسرا مضمون مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب
صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا اردو لغات پر ہے۔ مولوی
سید مقبول احمد صاحب صمدانی نے 'تذکرۂ خسرو' پر ایک ٹکڑا دیا ہے۔
خواجہ غلام‌الثقلین صدر شعبۂ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے
'قومی سیرت کی تشکیل' پر ایک فاضلانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ رسالے
کے تمام مضامین عالمانہ ہیں اور ان سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا
ہے۔ ہم اکیڈمی کے ارباب حل و عقد کو ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے
ہیں کہ ان کی مساعی سے ایک ایسے علمی رسالے کا اجرا ہوا ہے جس
سے اردو زبان و ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافے کی بجا طور پر
امید کی جا سکتی ہے۔

یہاں ہم سید مسعود حسن صاحب کے مضمون 'اردو لغات' پر
کچھ الفاظ کہنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کا ایک مضمون سید صاحب نے
کچھ سال ہوئے رسالۂ 'خیابان' لکھنؤ میں شائع کیا تھا؛ موجودہ
مضمون میں کسی قدر ترمیم اور اضافہ نظر آتا ہے۔

ہمیں 'خالق باری' کے معاملے میں سید صاحب سے بالکل اختلاف ہے۔
موصوف کا خیال ہے کہ خالق باری ہندی زبان سے نا آشنا ایرانیوں اور
تورانیوں کے لیے جو چنگیزیوں سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان میں
پناہ گزین ہو رہے تھے لکھی گئی تھی۔ 'خالق باری' کی یہ وجہ تالیف
ہمارے لیے استعجاب انگیز ضرور ہے، 'جواہر خسروی' میں مولوی محمد امین
صاحب چڑیا کوٹی نے بھی اسی قسم کی رائے‌زنی کی ہے مگر رائے کے معتبر
ہونے میں ہم کو بہت کچھ شبہ ہے، کیونکہ اول تو چنگیزیوں کا
طوفان امیر خسرو کے عہد سے پیشتر ہی برس برسا کر کھل چکا تھا
اور امیر کے زمانے میں مطلع بڑی حد تک صاف ہو چکا تھا۔ دوسرے
خالق باری کی زبان کسی ایسے قیاس کی موید نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ
کتاب ان نوواردوں کے لیے لکھی جاتی تو ضرور تھا کہ اس کی تعلیمی یا
تشریحی زبان التزاماً فارسی ہوتی؛ جس زبان سے یہ لوگ بالعموم واقف

تھے ، مگر دیکھا جاتا ہے کہ خالق باری میں ایسا التزام مفقود ہے ۔ اس میں دونوں زبانیں ملتی ہیں یعنی کہیں ہندی ہے اور کہیں فارسی ہے ۔ مثلاً شعر ذیل کی زبان ہندی ہے :

راہ طریق سبیل پہچان ارتھ تھوکا مارگ جان

اب اگر یہ رسالہ ایرانی پناہ گزینوں کے لیے لکھا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ نووارد 'ارتھ' 'تھوکا' اور 'جان' اور پہچان' کے الفاظ مطلق نہیں سمجھ سکتے تھے ۔ مگر شعر ذیل میں فارسی زبان اختیار کرلی گئی ہے :

بادہ شراب و راوق و صہبا می است و مد
گر جرعہ زاں خوری تو کنی کار نیک و بد

اس شعر کے مخاطب اگر پناہ گزین ہیں جو ہندی سیکھنی چاہتے ہیں تو سوچنے کا مقام ہے کہ تمام شعر سیکھنے کے بعد ایک ہندی لفظ یعنی 'مد' ان کے پلے پڑا ۔

قرین عقل یہ ہے کہ اگر یہ کتاب ایرانی و تورانی نوواردین کے لیے لکھی جاتی تو ہندی اور فارسی زبانوں کی یہ گنگا جمنی اس میں لہریں نہ مارتی بلکہ ہندی الفاظ پر زیادہ توجہ دی جاتی اور ہر ہندی لفظ کا فارسی مرادف دیا جاتا اور عربی الفاظ سے سروکار نہ رکھا جاتا ۔ لیکن خالق باری میں جو انتظام ہے اس سے ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف کی توجہ ہندی کے برعکس فارسی و عربی الفاظ کے سکھانے پر بہت زیادہ مبذول ہے ۔ مثلاً اوپر کے دونوں شعروں کو لیجیے ۔ پہلے شعر میں یہ فارسی و عربی الفاظ ملتے ہیں 'راہ طریق ۔ سبیل' جن کے مقابل فقط ایک ہندی لفظ 'مارگ' لایا گیا ہے ۔ دوسرے شعر میں 'بادہ ، شراب ، راوق ، صہبا ، اور مے' پانچ عربی و فارسی الفاظ ملتے ہیں ، ہندی لفظ صرف ایک ہے ۔ میں ایک اور مثال دیتا ہوں :

لسان و زبان فارسی جیبھ آکھو
درخت و شجر دار را روکھ بھاکھو

بہندی زبان خانہ ہم بیت گھر ہے
چو خوف و خطر بیم ہم ترس ڈر ہے
گرہ عقد باشد بتازی و لیکن
بہندی بود گانٹھ بشنو تو از من
کثیر و فراوان و بسیار و افزوں
بسے بہت کہیے سبھی جانیو توں

ان اشعار میں عربی و فارسی الفاظ ہندی الفاظ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کا مقصد عربی و فارسی الفاظ کی تعلیم ہے ۔ اگر ایرانی اور تورانی مہاجرین کے لیے یہ کتاب لکھی جاتی تو معاملہ بالکل برعکس ہوتا یعنی کتاب کی زبان فارسی ہوتی مگر ہندی لغات و مرادفات زیادہ تعداد میں ملتے ، فارسی عنصر بقدر ضرورت ہوتا اور عربی الفاظ نہ لائے جاتے ، نہ مصنف کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی کہ فلاں لفظ فارسی ہے اور فلاں تازی وغیرہ۔ ان ملاحظات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ خالق باری بیرونیوں کی تعلیم کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ ہندوستانی بچوں کو عربی و فارسی نصاب سکھانے کے لیے ۔

روایتاً خالق باری امیر خسرو کی طرف منسوب ہے مگر یہ روایت ہمیں زیادہ قدیم زمانوں میں نہیں لے جاتی ۔ اس سلسلے میں ایک روایت وہ ہے جو خان آرزو کی مرتبہ غرائب‌اللغات میں درج ہے ۔ میر عبدالواسع ہانسوی نے اپنی تالیف غرائب‌اللغات میں 'چھرے' کے معنی 'کارد بزرگ' لکھے تھے ۔ خان نے ان معنوں پر اعتراض کیا ۔ فرمایا ہے :

''چھرا در رسالہ[1] کارد بزرگ و در رسالۂ منظومۂ امیر خسرو چھرہ بہ معنیٰ استرہ است و مشہور در قصبات ہندوستان نیز ہمین است''

رسالۂ منظومۂ امیر خسرو سے مراد خالق باری ہے اور چھرا بہ معنی استرا شعر ذیل میں لایا گیا ہے :

---

۱ - یعنی غرائب اللغات میں عبدالواسع ۔

جاروب سوھنی و سبد است ٹوکرا
مقراض کترنی کہ بود استرا چھورا

خان آرزو کی روایت ھمیں صرف بارھویں صدی کے مصنف تک پہنچاتی ھے ، البتہ سید صاحب نے اللہ خدائی کے بعض اشعار کی بنا پر جو عہد شاہ جہان کی تصنیف ھے ، یہ قیاس لگایا ھے کہ اس کے مصنف تجلی نے بھی خالق باری کی طرف اشارہ کیا ھے ۔ میں اس موقع پر سید صاحب ھی کے الفاظ نقل کیے دیتا ھوں :

''اتنا ضرور پتا چلتا ھے کہ آج سے کوئی تین سو برس پہلے بھی یہ کتاب خالق باری ھی کے نام سے مشہور تھی ۔ 'اللہ خدائی' جس کا ذکر آئے گا ۱۰۶۰ھ کی تصنیف ھے ۔ اس کے مصنف تجلی نے کتاب کی مختصر منظوم تمہید میں یہ شعر بھی لکھا ھے :

شاید از لطف و رحمت باری روح خسرو نمایدم یاری

اس شعر میں امیر خسرو کی روح سے مدد مانگی ھے اور اس کے پہلے مصرع کے آخری لفظ سے خالق باری کی طرف اشارہ کیا ھے ۔''
(ھندوستانی صفحہ ۴۴)

ھمیں خالق باری کے متعلق اور امور میں بھی سید صاحب سے اختلاف ھے لیکن چونکہ یہ امور بالتفصیل 'پنجاب میں اردو' میں درج ھو چکے ھیں اس لیے ھم اس تالیف کے صفحات ۱۲۸ ، ۱۴۳ کی طرف اپنے ناظرین کی توجہ منعطف کرتے ھیں ۔

اردو لغات میں دوسرا نمبر 'بحرالفضائل' کو دیا گیا ھے ۔ اگرچہ وہ براہ راست اردو لغت نہیں ھے بلکہ فارسی و عربی الفاظ کی فرھنگ ھے جس میں مصنف نے ضرورتاً بعض الفاظ کی تشریح اردو الفاظ جنھیں وہ ھندوی کے نام سے یاد کرتا ھے ، استعمال کیے ھیں ۔ یہ الفاظ متفرق طور پر تمام کتاب میں بکھرے ھوئے ھیں جن کی تعداد تین ساڑھے تین سو الفاظ کے قریب ھوگی ۔ اگر 'بحرالفضائل' کو اس بنا پر اردو لغات کے ذیل میں لایا جا سکتا ھے تو ایسی اور درجن بھر کتابیں ھیں جو سید صاحب کی فہرست میں داخل ھونے کی منتظر ھیں ۔ ان میں بعض تو بحرالفضائل

سے بھی قدیم ھیں ۔ مثلاً فرھنگ نامۂ مولانا فخرالدین مبارک غزنوی قواس جو علاءالدین محمد شاہ (۶۹۵ھ و ۷۱۵ھ) کے عہد کے بزرگ ھیں ۔ ضیاء برنی اور فرشتہ دونوں ان کا ذکر کرتے ھیں ۔ اسی طرح 'دستورالافاضل' ہے جو مولانا رفیع حاجب خیرات نے ۷۴۳ھ میں تالیف کی ہے ۔ فرھنگ 'زفان گویا' از ملا رشید برادر جد جامع شرف نامۂ احمد منیری اور ادات الفضلا ۸۲۲ھ از قاضی بدرالدین محمد دھلوی بھی قدیم کتابیں ھیں ۔ ان کے علاوہ اور متعدد فرھنگیں ھیں جن کے لیے ھم 'پنجاب میں اردو' (صفحہ ۲۰۸) کا حوالہ دینا پسند کرتے ھیں ۔

محمد بن قوام بن رستم کرخی نہیں ھیں بلکہ کڑپی یعنی کڑی (سلاطین گجرات کے عہد میں کڑی قصبہ ھونے کے علاوہ پرگنہ بھی تھا ۔ احمد آباد سے براہ آگرہ چالیس میل پر واقع ہے) علاقۂ گجرات کے باشندے ھیں ۔ بحرالفضائل ۹۷۵ھ میں تالیف نہیں ھوئی بلکہ ۸۳۷ھ میں ۔ ۹۷۵ھ محمد بن قوام کی ایک اور تالیف 'شرح مخزن اسرار' کی تاریخ ہے ۔ ان کی ایک اور تالیف کا نام 'جواھرالمعادن' ہے جو فنون بدیع اور بیان و عروض پر شامل ہے ۔ بحرالفضائل کے لیے ملاحظہ ھو رسالہ مخزن سال گرہ نمبر مارچ ۱۹۲۹ع و اپریل نمبر ۱۹۲۹ ۔

کلیم یوسفی کا قصیدہ در لغت ھندی کوئی طویل چیز نہیں ہے ، س میں صرف چوالیس پینتالیس ابیات ھیں اور خاتمہ یہ ہے :

یوسفی بہرت دریں ابیات کرد است آنچہ ذکر
گر کنی ازبر ترا ھر دم رسد نفعے دگر

از ضرر دارد مدامت در پناہ خویشتن
آنکہ در عالم بتقدیرش بود نفع و ضرر

حکیم یوسفی تقریباً ۹۰۶ھ سے ۹۴۲ھ تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے ھیں اور ایک درجن سے زیادہ رسالے اور کتابیں ان کی یادگار ھیں ۔ طب اور انشا ان کے مقبول مضامین ھیں ۔

'اللہ خدائی ، اس قدر نادر نہیں جتنا سید صاحب خیال کرتے ھیں ۔

وہ مطبع انوار احمدی میں محمد تیغ بہادر کے اہتمام سے ۱۲۹۸ھ میں طبع ہو چکی ہے ۔ مطبوعہ مثنوی کے ۱۶ صفحات ہیں ۔ سبب تالیف میں مجلی کہتا ہے کہ ہندی و فارسی الفاظ کی تعلیم کی غرض سے میں نے یہ کتاب بپاس خاطر کہور (کذا) پسر شیر شاہ قانون گوی لکھی ہے :

گرچہ بود از رہ طبیعت دور ۔۔۔ لیک گفتم بخاطر کہور
کہ در امراست قابل و خوش خوی ۔۔۔ پسر شیر شاہ قانون گوی

مطبوعہ نسخے میں ۱۰۶۶ھ سال تصنیف بتایا گیا ہے اور کتاب کا نام 'اللہ خدائی' دیا ہے :

در ضمیرم چو این ہوس افزود ۔۔۔ شصت و شش با ہزار ہجری بود
چون بفضل خدائی گشت تمام ۔۔۔ کردم 'اللہ خدائی' این را نام
نہ من از بہر این و آن گفتم ۔۔۔ خاص از بہر کودکاں گفتم

غرائب اللغات کے مصنف میر عبدالواسع ہانسوی نے بچوں کے لیے ایک منظوم رسالہ بھی لکھا ہے جو نصاب سہ زبان یا حمد باری کے نام سے مشہور ہے ۔ اس میں التزام یہ ہے کہ ہر مصرع میں ایک ایک لفظ عربی و فارسی و ہندی زبانوں کا بالترتیب دیا ہے ۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

صمد پاک نرنجن جان ۔۔۔ نبی پیمبر بسیٹھ پچھان
ملک فرشتہ دیوتا مان ۔۔۔ صحیفہ نامہ پاتی بکھان

اس کے علاوہ مختلف متناسب الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ، مثلاً لغات اعضای انسان ، اجناس ، غلہ ، گل ہا و میوہا ، ادویات ، لغات قرابت و رشتہ ، صفات ، معدنیات ، پرند ، حیوانات ، غیر پرند ، لغات متفرقہ ، لغات عوارضات ، ذائقہ ، عیوب جسم انسان ، اقسام اغذیہ ، اسمای اہل حرفہ ، ملبوسات و اسلحہ ، لغات متعلقہ باورچی خانہ وغیرہ ۔ آخر میں فارسی کے مصادر مشہورہ و غیر مشہورہ دیے ہیں ۔ اس فصل میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے مصرع میں تین تین مصدر ہیں ، دوسرے مصرع میں بالترتیب ان کا اردو ترجمہ ہے ۔ مثال :

کـــردن گـفتن شنیدن جـــان　　　کــرنا کـہنا سـنـنا مــاں
خوردن خفتن نوشیدن مان　　　کـھانـا سـونـا پینـا بکـھان

اور خاتمے میں یہ شعر آتا ہے :

عـبدالـواسع ہے یـہ کـتاب　　　تین زبـانوں کی ہے نـصاب

صمد باری فارسی دور میں بہت مقبول رہی ہے اور متعدد بار چھپ چکی ہے لیکن مصنف کا نام مذکور نہیں -

انگریزی اردو لغات کے سلسلے میں سید صاحب نے زیادہ تر مولانا عبدالحق صاحب کے مضمون سے کام لیا ہے لیکن اس بارے میں سب سے اہم اور اصلی ماخذ سر جارج گریرسن کی پیمایش لسانی کی جلد نہم ہے جس میں ایک نہایت طویل فہرست مغربی اہل قلم کی تالیفات کی درج ہے - اس فہرست میں اردو لغات کو بھی شان دار جگہ ملی ہے -

خزینۃ الامثال نول کشور مطبوعہ ۱۸۷۲ء ہمارے پاس ہے - اس کے کل ۲۵۶ صفحات ہیں - اصل کتاب صفحہ ۲۲۱ پر ختم ہو جاتی ہے اور مصنف کا خاتمہ بھی اسی صفحے پر درج ہے - بعد میں مختلف ضمیمے ہیں - خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید حسین شاہ حقیقت نے ۱۲۱۵ھ میں اسے تالیف کیا ہے اور شعر ذیل میں تاریخ دی ہے :

کر خزینہ سے خرچ ساٹھ عدد　　　بـولا ہـاتف خـزیـنـۃ الامثال

خزینۃ الامثال = ۱۲۷۵ — ۶۰ = ۱۲۱۵ھ

علی گڑھ جوبلی میں ایک دکنی اردو کا لغت نمائش میں رکھا گیا تھا جس کو نہایت قدیم بتایا گیا تھا -

اگر 'تحفۃ الہند' اردو لغات کی فہرست میں داخل ہو سکتی ہے تو پھر 'آئین اکبری' کسی صورت میں بھی اس فہرست سے خارج نہیں رکھی جا سکتی -

آخر میں ایک قلمی رسالے کا ذکر کیا جاتا ہے جو اردو لغت پر ہے - اس رسالے کا منصوبہ بھی وہی ہے جو غرائب اللغات عبدالواسع

ہانسوی کا ہے - ۳۶ صفحات اور ہر صفحے پر ۱۴ یا ۱۶ سطریں ہیں - ہندی الفاظ کی فارسی زبان میں تشریح کی گئی ہے اور جگہ جگہ اساتذۂ فارس کے اشعار نقل ہوئے ہیں - شروع میں ذیل کا مختصر دیباچہ درج ہے :

''چند لغت از رسالۂ کمال عترت کہ او از کتب لغت عربی و فارسی مثل 'مہذب الاسما' و منتخب رشیدی و صراح و صحاح و مویدالفضلا و فرہنگ جہانگیری و رشیدی و کشف اللغات و تحفۃالسعادت و برہان قاطع و سروری و غرائب اللغۃ و غیر ہا جمع نمودہ است نوشتہ شد''

یہ کمال عترت کون ہیں ہم نہیں جانتے - باب الالف میں ابتدائی دس لغت حسب ذیل ہیں :

اگوا ، اڑواڑ ، اوڑھنی ، انگیا ، آتی ، آنکھ مچولہ ، اندراین کا پھل ، ادرک ، اڈا ، آری -

اشاریہ

مقالات شیرانی (جلد اول)

(مرتبہ گوہر نوشاہی)

مقدمہ

شخصیات

د

ڈ

ر

س

ش

ض

ط

ع

غ

ف

ق

ک

مقامات

ت

ٹ

ج

چ

ح

خ

د

ڈ

ر

اصطلاحات

کتابیات

متن

شخصیات

د

ڈ

ذ

ر

ق

ک

گ

ل

مقامات

اصطلاحات

ب

پ

ت

کتابیات

ا

ب

پ

صحت نامۂ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۲۰	آجان	آن جا
٦	۲۱	دن این	دن رین
۱۱	۱۰	پاپند	پابند
۱۲	۱۱	تم م	ختم
۱۷	۵	دوسرغہ	دوسراغہ
۱۸	۳	سرے بج پر بری	سرے پر برنجی
۲۱	۳	...بادشاہ غازی	بادشاہ غازی ضرب اردوے ظفر قرین
۲۱	۴	ضرب اردوے ظفر قرین	×
۲۲	۲	یمام	تمام
۲۲	۵	صدودواعی	صدد دواعی
۳۲	۷	نہر جا رہی ہے	نہر جاری ہے
۳۲	۸	دو دشتہ	دو دستہ
۴۰	۱	داخل ہوئے ہیں	داخل ہوتے ہیں
۴۰	۲ (حواشی)	۱۱۹۳ع	۱۱۹۳ھ
۴۵	۷	۱۱۹۴ع	۱۱۹٦ھ
٦۹	۸	شراب کچھ خوار	شراب کچھ خوا
۸۹	۷	خضر خانی	خضر خان
۹٦	۳ (حواشی)	نوذائیدہ	نوزائیدہ
۱۰۰	۱۰	میلج	نیلج
۱۱۴	۱۵	جلیہ	حلیہ
۱۳۷	۳	ان کو یہ نعمت	ان کو نعمت
۱۵۱	۲۳	تساڈ (۱)	تساڈ (۱)
۱۵۳	رر	روم	محروم
۱۵۵	۹	مقر	مقرر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶۵	۷	اجن	باجن
۱۷۰	۳	روی توشین	روی نوشین
۱۷۱	۵	زکہوۃ	زکنوۃ
۲۰۹	۲۳	دتیا	دیتا
۲۱۳	۱ (حواشی)	غالب	غالباً
۲۲۱	۲۵	حرف	صرف
۲۲۵	۱۷	دانس	دانش
۲۳۲	۱	ہوں محمد کرکے بولے	محمد ہوں کرکے بولے
۲۳۵	۶	بازار سے بازار	بازارے بازار
۲۵۵	۹	بازار میں بازار	بازاریں بازار
۲۳۶	۱۳	اس سے ظاہر کہ	اس سے ظاہر ہے کہ
۲۳۹	۲۵	کدے گا	کرے گا
۲۴۱	۱۸	ہور در بریاں	ہور در برماں
۲۵۰	۱۴	ہور	حور
۲۵۳	۲	پریشانی	پریشانگی
رر	۱۵	بھی دیتا	بھی دیتا ہے
۲۶۳	۱ (حواشی)	'مارا مار' کو اردو	'مارا مار' اردو
۲۶۷	۱۲	بولیچہ ہیں کہ بھوک ہور نیاں ہور ولیاں کی پیاس میراث۔	بولیچہ ہیں کہ بھوک ہور پیاس نیاں ہور ولیاں کی میراث۔
۲۷۳	۸	نلملتے	تلملتے
۲۷۴	۱۶	بجرے	بخرے
۲۷۶	۱۰	سولھویں صدی عیسوی	دسویں صدی ہجری
۲۷۷	۸-۱۶	ہوسکتا ہے'	خوب محمد چشتی
۲۷۹	۱۹	دیے کر	دیکر